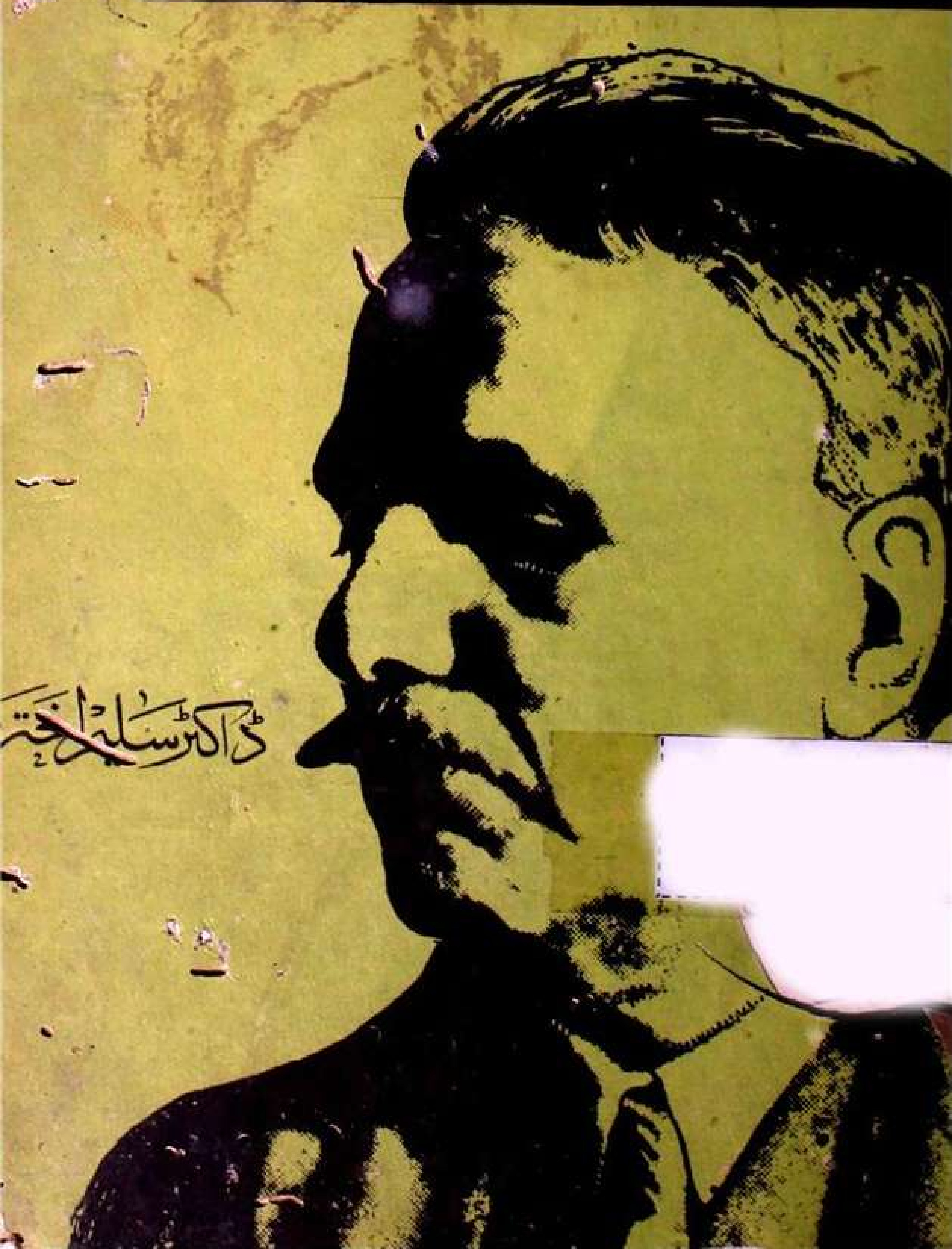
اقبال شعاعِ صد رنگ



ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے تنقیدی شعور، محنت اور وسعت مطالعہ کی مدد سے ہماری ادبیات میں جو رتبۂ اعتبار حاصل کرلیا ہے، وہ اہلِ قلم کیلئے ہر طرح قابلِ رشک ہے۔ میں نے ہمیشہ ان کی تحریروں کو ذوق وشوق سے پڑھا ہے اور خود کو سیراب کیا ہے۔ ادھر اقبال کے مطالعہ پر انہوں نے خاص توجہ دی اور کئی قابلِ ذکر کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔

"فکرِ اقبال کے منور گوشے" اقبال کے مطالعہ کے سلسلے میں گرانقدر اضافہ ہے "اقبال کا ادبی نصب العین" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اقبال کے ذہن وفکر کی ایسی گرہیں کھولتی ہے جن کے بغیر کلام اقبال کے افادی پہلوؤں سے بھرپور واقفیت ممکن ہی نہیں۔ یہ کتاب اقبال کے ادبی نصب العین پر قلم اٹھانے والوں کو گمرہی سے بچاتی ہے اور تفہیم اقبال کے سلسلے میں راست اور روشن راستے کی نشان دہی کرتی ہے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ان گنی چنی کتابوں میں سے ہے جسے اقبال کے سلسلے میں منفرد و منتخب کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ اس میں درون خانہ اقبال کو جس عمیق و انیق زاویۂ نظر سے دیکھنے دکھانے کی کوشش ملتی ہے وہ ہر طرح نیا اور اچھوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب "اقبال شعاعِ صد رنگ" کو اقبال کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے چمنِ عقیدت کا گل سرسبد کہنا چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک ایسی تالیف ہے جو اقبال اور عہدِ اقبال کے جملہ لوازم و خصوصیات پر محیط ہے۔ اسے ایک ایسی جامع کتاب کی حیثیت حاصل ہے جو اقبال کی ذاتی زندگی، معاصرانہ

اقبال شعاعِ صد رنگ

مرتبہ

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگ میل پبلی کیشنز۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

سنہ ۱۹۷۸ء

پبلشرز : نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز: لاہور

مطبع: منظور احمد

منظور پرنٹنگ پریس: لاہور

قیمت : ۳۰/۰ روپے

انتساب

برادرم نسیم درّانی کے نام

"نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو!"

ترتیب

شخصیت کی پہلوداری:

فکر کے زاویے:

شاعرِ بے مثال:

شاعرِ اسلام:

بچوں کا اقبال:

فلسفیانہ مباحث:

دیباچہ

"جہاں تک تعداد کا تعلق ہے تو جتنا زیادہ اقبال پر لکھا گیا اتنا اور کسی بھی مسلمان شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ تاہم ابھی تک ایسا مواد دستیاب نہیں جس میں اس انسان کی پُر پیچ شخصیت اور انسانیت سے انصاف کرتے ہوئے یہ اجاگر کیا گیا ہو کہ اقبال نے کس طرح گہری وابستگی سے اپنے گرد و پیش پھیلی دنیا کے مقابلے میں حیات بخش ردِ عمل کا اظہار کیا۔"

(ڈاکٹر جاوید اقبال)

علامہ اقبال پر مقالات کی کتاب کا ایسی سطور سے آغاز کوئی نیک فال نہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ اقبال پر سب سے زیادہ لکھے جانے کے باوجود موضوعات اور مباحث میں تکرار و توارد کی بنا پر اقبالیات کی ذیل میں آنے والے مقالات کی فکری سطح بالعموم اتنی بلند نہیں ہوتی کہ ان سب کو اقبال شناسی میں نئی جہات قرار دیا جا سکے۔ عقل، عشق، خودی، مردِ مومن، اسلام، مغربی تہذیب، سعی و عمل اور اس انداز کے موضوعات تو سدا بہار ہیں اور بلا مبالغہ صرف ان ہی پر سینکڑوں مقالات لکھے گئے ہوں گے۔

اردو تنقید میں اصولی مباحث، فکری تجزیوں اور شخصی مطالعات کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔ حالی کی مقدمۂ شعر و شاعری کو نقطۂ آغاز بنانے پر موجودہ صدی کے آغاز تک جدید اردو تنقید کی عمر سات برس بنتی ہے اور اقبال ایسے مفکر کے فکر و فن کی پرکھ کے لحاظ سے یہ عمر "پختہ" تو ہرگز نہیں قرار دی جا سکتی۔ موجودہ صدی کی پہلی دو تین دہائیوں تک اردو کے تنقیدی مباحث میں اتنی گہرائی نہ آئی تھی کہ وہ اقبال

ایسے فلسفی کے پیچیدہ نظام فکر کا کامیاب تجزیاتی مطالعہ پر قادر ہو سکتے۔ نتیجہ میں چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر اصحاب کا انداز تنقیدی کم اور تشریحی یا توصیفی زیادہ رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اقبال کی صورت میں اردو تنقید نے اپنے عجز کا اظہار کر دیا ہو۔ اس کی وجہ ریاضی کے مطابق یوں بیان کی جا سکتی ہے۔ اقبال کا فکری ارتقار جیومیٹریکل یعنی ۲ - ۴ - ۸ - ۱۶ کے انداز پہ تھا جبکہ اردو تنقید کا سفر اس کے برعکس ۱ - ۲ - ۳ - ۴ یعنی ریاضیاتی تھا۔ چنانچہ یورپ سے ایسی کے بعد آنے والے دس سالوں میں اقبال کی فکری سطح ۔ جن بلندیوں کو چھو رہی تھی اردو تنقید اس کے مقابلے میں آگے بڑھنے والی حرکت سے عاری ساکت سی معلوم ہوتی ہے۔ علامہ اقبال بنیادی طور پر فلسفی تھے جبکہ اس وقت تک اردو تنقید کا فلسفیانہ شعور برائے نام تھا۔ علامہ اقبال پہ ابتدا میں زبان و بیان کے جو اعتراضات کیے گئے تو ان کی وجہ محض لسانی تعصب نہ تھا بلکہ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ شعر کی کلاسیکی روایات کے پروردہ ذوق نقد کی پرواز روزمرہ محاورہ اور صنائع بدائع سے بلند نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اقبال کے کلام میں سے زبان و بیان کی غلطیاں نکال کر دہ اصحاب اپنی مخصوص تنقیدی حس سے خلوص کا اظہار کر رہے تھے۔

سر عبد القادر نے "بانگ درا" کے دیباچہ میں علامہ اقبال کی شاعری کے جو ادوار مقرر کیے انہیں بالعموم سبھی درست تسلیم کرتے ہیں، لیکن اب تک کسی نے اقبالیات کے ادوار مقرر کرنے کی کوشش نہ کی۔ میری دانست میں اقبالیات کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ ابتدار سے لے کر ۱۹۴۰ء یعنی قرار دادِ پاکستان کی منظوری تک

۲۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء یعنی حصولِ پاکستان کی جد و جہد کا زمانہ اور

۳۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یعنی پاکستان کا دور۔

بادی النظر میں شاید پہلا دور اقبال کے سالِ وفات یعنی ۱۹۳۸ء تک درست محسوس ہو، لیکن میرا استدلال یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں انتقال کے بعد سے علامہ اقبال

کے افکار کی اثر انگیزی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان کی منظوری کی صورت میں ان کا فلسفہ اور سیاسی پیغام اپنی تکمیل کے نقطۂ عروج کو چھو لیتا ہے لہٰذا پہلا دور ۱۹۴۰ء تک ہی مناسب ہے کہ اس سال علامہ کے تصورات عملی روپ اختیار کرتے ہیں۔ دوسرا دور حصولِ پاکستان کی جد و جہد کا پر آشوب زمانہ ہے یہ برصغیر کی سیاست میں تغیرات کی کروٹوں کا عہد ہے۔ اس عہد میں پاکستان کے حوالے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اقبال کے نام اور کام کا بھی ذکر ہوتا رہا۔ تیسرا دور پاکستان کا ہے۔ اقبال کے خواب کی تعبیر دنیا نے دیکھ لی اب وہ قومی شاعر ہیں!

"اقبال۔ شاعرِ صد رنگ" اقبالیات کے دورِ اول میں لکھے گئے بعض مقالات کا انتخاب ہے۔ فہرست مقالات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے موضوعات میں تنوع کا احساس ہو جاتا ہے۔ ان مقالات کے انتخاب کا صرف ایک جواز ہے کہ یہ دورِ اول کے فراموش کردہ مقالات ہیں۔ آج شاید ان کی ادبی اہمیت نہ محسوس ہو، لیکن ان کی تاریخی اہمیت کو جھٹلانا ناممکن ہے اور نہیں تو اس بنا پر ہی کہ ۱۹۳۸ء تک فکرِ اقبال کے کتنے گوشے کھنگالے جا چکے تھے۔ ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر یہ معنی خیز حقیقت بھی اُجاگر ہوتی ہے کہ آج جن موضوعات پر ہمارے ناقدین بطورِ خاص خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر پر ۱۹۳۸ء تک لکھا جا چکا تھا۔ معیار کی بات اس لیے نہیں کرتے کہ تنقید میں حرفِ آخر کسی کا مقدر نہیں۔

علامہ اقبال کی شخصیت، شاعری اور فکر و فن پر ان مقالات کا مطالعہ اقبال کے قارئین اور ناقدین دونوں کے لیے یکساں طور پر سود مند ثابت ہو گا یہ درست ہے کہ ان میں سے بیشتر حضرات نے اقبال پر لکھنے کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور یوں آج وہ گمنام ہیں لیکن نام سے قطع نظر۔ بیشتر مقالات کی فکری سطح آج کی اقبالیات کے معیار پر پوری اترے گی۔ اور نہیں تو اس لحاظ سے ہی یہ مقالات مایوس نہ کریں گے کہ یہ آج سے ۴۰ برس قبل کی اقبال شناسی کے مظہر ہیں۔ اس پر مستزاد اسلوب احمد انصاری، مہاراجہ کشن پرشاد، بشیر احمد، دیا نرائن نگم، پروفیسر عبدالحمید، مخدوم محی الدین کی تحریریں ہیں جو اپنے

مخصوص مزاج کے اعتبار سے آج بھی اہم ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ "علامہ اقبال کا فلسفہ" کے موضوع پر م۔م جوہر میرٹھی اور محمد عبدالقیوم خاں باقی کی بحث پر مبنی مقالات پسند کیے جائیں گے۔ اسی طرح "ترجمانِ حقیقت" پر دو مقالات کی بحث بھی شامل کتاب ہے۔ اس کتاب کے مقالات کے مطالعے سے فکرِ اقبال کا تنوع ہی واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کی اساس بھی اُجاگر ہو جاتی ہے۔

"سال اقبال" کے سلسلہ میں میری یہ ناچیز کاوش میرے محترم دوست نیاز احمد کے توسط سے قارئین تک پہنچ رہی ہے پست مذاقی کے اس دور میں نیاز صاحب نے ادب و نقد کے سنجیدہ موضوعات پر گرانقدر تصانیف کی پیشکش کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اُسے اہل ذوق یقیناً سراہیں گے۔ "اقبال۔ شعاعِ صد رنگ" کی اشاعت کے لیے میں ان کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

لاہور: یکم جنوری ۱۹۷۷ء

سلیم اختر

شخصیت کی پہلوداری

- دیا نرائن نگم — "علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال"
- پروفیسر عبدالحمید — "اقبالؒ کے چند جواہر ریزے جنہیں چننے کا مجھے موقع ملا"
- مہاراجہ کشن پرشاد شاد — "خطبۂ صدارت"
- محمد جلال الدین اشک — "اقبال کی نسبت میرے ذاتی تاثرات"
- محمد عمر نور الٰہی — "حسنِ عقیدت"

دیا نرائن نگمؔ

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

علامہ اقبالؔ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت سپرو خاندان کے رُکن تھے، مگر دو تین سو سال ہوئے وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے ایک شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

آپ کا خاندان خوشحال، فقیر دوست اور تصوف پسند تھا، اور یہ تمام باتیں آپ کو ورثہ میں ملی تھیں۔

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں پہلے مکتب میں بیٹھے پھر مدرسہ میں داخل ہوئے اور پانچویں جماعت کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ اسی طرح مڈل اور انٹرنس کے امتحانات بھی وظیفہ کے ساتھ پاس کر کے، اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو کر ایف اے پاس کیا۔ بعدہٗ گورنمنٹ کالج سے فلسفہ و حکمت، انگریزی و عربی میں امتیاز کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ جس کے صلہ میں دو طلائی تمغے انعام اور وظیفہ بھی ملا۔ عربی و فارسی کی تکمیل آپ نے شمس العلماء مولوی سید میر حسن مرحوم سے کی تھی، اور چونکہ فلسفہ و حکمت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لئے پروفیسر آرنلڈ کے زیر ہدایت اس کی بھی تکمیل کرتے رہے۔ اور ایم اے کی ڈگری بھی امتیاز خاص کے ساتھ لی اور اس کے صلہ میں بھی آپ کو تمغہ ملا۔ جس کے بعد آپ اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ

فلسفہ واقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گورنمنٹ کالج میں فلسفہ وانگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے، اسی زمانہ میں آپ نے ایک کتاب "علم الاقتصاد" کے نام سے اردو میں تصنیف فرمائی۔

یورپ کا سفر

چونکہ تحقیق ومطالعہ کتب کا شوق آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس لیے آپ کی طبیعت ہمیشہ مزید قابلیت حاصل کرنے کے لیے بیقرار رہتی تھی۔ چنانچہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر مزید تکمیل تعلیم کے ارادہ سے آپ ۱۹۰۵ء میں انگلستان تشریف لے گئے، اور تین سال تک کیمبرج یونیورسٹی میں رہ کر فلسفہ واخلاق کا مزید مطالعہ کرکے فضیلت کی ڈگری حاصل کی جس کے بعد آپ جرمنی تشریف لے گئے۔ جہاں "فلسفۂ ایران" پر ایک تحقیقی مضمون لکھ کر میونخ یونیورسٹی سے "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی فرسٹ کلاس ڈگری لی۔ یہ مضمون فصیح وبلیغ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اور لندن میں شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا ہے۔

جرمنی سے لندن واپس آکر وہاں کے اسکول آف پولٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور اسی کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی دوران میں آپ نے لندن میں "مذہب اسلام" پر چھ لکچر دیے جو بہت مقبول ہوئے۔ انھیں دنوں میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ پر آپ چھ ماہ کے لئے لنڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کے قائمقام پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ جس کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں آپ انگلستان سے ہندوستان واپس آئے۔ آپ نے دوران قیام یوروپ میں اسپین وفرانس کی بھی سیر وسیاحت کی، اور واپسی پر لاہور میں باقاعدہ بیرسٹری کرنے لگے۔

آپ کو سیاسی میدان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی بلکہ آپ کا مذاق عالمانہ اور فلسفیانہ واقع ہوا تھا۔ تاہم احباب آپ کو مجبور کرکے ۱۹۲۶ء میں پالٹیکس کے میدان میں کھینچ لائے۔ اور پنجاب کونسل کے انتخابات میں بہ حیثیت امیدوار کھڑا کیا۔ اس میں آپ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ چونکہ آپ کو مزدوروں اور کاشتکاروں سے ہمیشہ سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ اسی لئے آپ کونسل میں ان طبقوں کی ہر دم حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے بانیان مذاہب اور بزرگان دین پر نامناسب حملوں کے خلاف پنجاب میں ریگولیشن نافذ کرایا، جو

اب تک قائم ہے۔ تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ کرانے اور انسدادِ شراب نوشی کے لیے آپ نے کوشش کی اور ایک تقریر میں وصولی مال گذاری کے سلسلہ میں جو زیادتیاں ہوتی ہیں، ان پر روشنی ڈالی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں میسور یونیورسٹی نے آپ کو چند لکچر دینے کے لیے میسور مدعو کیا۔ جہاں آپ کا ہندو مسلم انجمنوں نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ حیدرآباد بھی تشریف لے گئے اور اعلیحضرت حضور نظام سے شرفِ نیاز حاصل کیا۔ ۱۹۲۷ء میں آئین جدید کے ماتحت انتخابات ہوئے تو آپ بھی پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ نے آپ کو "سر" کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست بھوپال نے آپ کے لیے تاحین حیات پانچسو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ جس سے آپ یک گونہ فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے۔ اس اثناء میں آپ نے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس اور بعض دیگر اسلامی جلسوں کی صدارت کی۔

شاعری اقبال کی شاعری کا آغاز طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں جب آپ لاہور آئے تو نقاد سوسائٹی کی بدولت طبع رسا پر مزید صیقل ہوئی۔ اور آپ کی شاعری کا شہرہ طلباء کے حلقہ سے نکل کر عوام تک جا پہنچا۔ گو شاعری میں مشورہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن نکتہ چینیوں کے اعتراضات پر آپ ہمیشہ توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا حسرت کے اردوِ معلیٰ میں جو سلسلہ مضامین آپ کے متعلق شائع ہوا۔ اس سے آپ نے بخوبی فائدہ اٹھایا۔

بہرحال اقبال کی شاعری کو پانچ دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک رہا۔ جب آپ کی اکثر نظمیں شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہیں۔ اس دور کی سب نظمیں حب وطن میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور آپ انھیں انجمن حمایت اسلام لاہور، کے سالانہ جلسوں میں سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلی نظم جو آپ نے ۱۸۹۹ء میں انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھی، "نالہ یتیم" تھی۔ "ہندوستان ہمارا"، "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" نامی نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس دور میں اقبال خالص

ہندوستانی تھے۔ "ہندوستان ہمارا" پر آپ نے اپنی نظم کا صحیح اور مستند ایڈیشن رسالہ زمانہ کو اشاعت کے لیے عنایت فرمایا تھا۔ چنانچہ دفتر زمانہ میں آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ابھی تک محفوظ ہے اور اس پرچہ میں ہدیۂ ناظرین ہے۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۳ء تک رہا۔ جب وہ "قومی" شاعر کے بجائے "اسلامی" شاعر بن گئے۔ "وطنیت" کو "بت" سمجھنے لگے۔ انھیں دنوں کا شعر ہے سه

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

بہر حال اقبال کا نظریہ اب یہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کو وطن سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ سارا جہاں ان کا وطن ہے۔ خضر راہ، شمع و شاعر اور طلوع اسلام وغیرہ اسی دور کی نظمیں ہیں۔ اسرار خودی، رموز بیخودی اور پیام مشرق میں اسی دور کا کلام ہے۔

چوتھا دور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۸ء یعنی تا دم آخر رہا۔ اس دور میں اقبال کی طبیعت پھر اردو نوازی کی طرف مائل ہوئی۔ چنانچہ بال جبریل اور ضرب کلیم نامی مجموعہ کلام اسی زمانے میں شائع ہوئے۔

اقبال کے ابتدائی کلام میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ صحیح معنی میں ایک ہندوستانی شاعر ہیں۔ ہندوستان ان کی نظروں میں جنت نشان ہے۔ انھیں ہندوستان کی ہر چیز پیاری اور دلآویز نظر آتی ہے۔ حب وطن میں سرشار ہو کر وہ کس والہانہ خلوص کے ساتھ کہتے ہیں سه

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

جب ہندوستان کے شمال میں قدرت کی تعمیر کردہ سدِ سکندری یعنی کوہستان ہمالیہ کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ مترنم ہوتے ہیں سه

اے ہمالہ، اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں

چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اقبال کے اکثر کلام میں حکیم قاآنی جیسا وجدآور ترنم اور الفاظ میں آبِ رواں کی سی روانی ہے مثلاً وہ بہار کا خیر مقدم کس رنگین پیرایہ میں کرتے ہیں ؎

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنم ہزار طوطی و دراج و سار۔ برطرفِ جوئبار۔ کشت گل و لالہ زار چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

ستاروں کا جو گیت لکھا ہے، اس کے الفاظ کی روانی میں کس قدر کیف آور ترنم ہے ؎

ہستی ما نظام ما — مستی ما خرام ما
گردش بے مقام ما — زندگی دوام ما
دور فلک بکام ما، می نگریم و می رویم

بیشِ تو نز دماکے — سالِ تو نز دِ ما دمے
اے بکنار تو یمے — ساختۂ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے، می نگریم، می رویم

اللہ اللہ! اوپر کے بند کے اس ٹکڑے میں "اے بکنار تو یمے ساختۂ بہ شبنمے" انسان کو خودشناسی اور جدوجہد کا کس قدر زبردست سبق دیا گیا ہے۔

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اقبال زراعت پیشہ لوگوں اور مزدوروں کے بے حد ہمدرد تھے۔ دراصل وہ موجودہ نظامِ اقتصادیات میں ایک انقلابِ عظیم کے حامی تھے۔ آجکل جبکہ کانپور میں مالکان کارخانہ جات اور مزدوروں کے درمیان زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ نعرہ انقلاب خاص قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب　　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام　　　آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

ایک جگہ مزدوروں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر اس طرح نادری حکم سناتے ہیں ؎

اُٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　　جس کھیت سے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　　میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

آج کل ہندوستان میں جسے دیکھئے تقلید مغرب کی رَو میں بہا چلا جاتا ہے۔ لیکن اقبال مرحوم جو مغربی تہذیب و تمدن کا غور سے مطالعہ فرما چکے تھے، اس کے سخت مخالف ہیں۔ اور اہلِ مغرب کی مادہ پرستی سے سخت بیزار ہیں۔ چنانچہ طنزیہ لہجہ میں فرماتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا!

ایک جگہ مغربی تہذیب سے بیزار ہو کر اس طرح آہنگِ فریاد بلند کرتے ہیں ؎

فریاد ز افرنگ و دلاویزیٔ افرنگ

فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ

معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

ہندوستان کے چار شاعر اپنی خصوصیات کے لیے مشہور ہیں۔ امیر خسروؒ کے الفاظ کی روانی، بے ساختگی اور ترنم، میر تقی میر کا سوز و گداز، خواجہ میر درد کا تصوف اور مرزا غالب کا فلسفہ و حکمت۔ لیکن قدرت نے ان چاروں کی خصوصیات کو جس شخص واحد کی طبیعت میں سمو دیا ہے، وہ سر محمد اقبال ہیں۔ روانی و ترنم کے نمونے تو ہم اوپر نذر کر چکے ہیں۔ سوز و گداز کی مثال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا — یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اقبال کا کلام تصوف میں بھی بے نظیر ہے۔ خصوصاً جہاں وہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کی تشریح کرتے ہیں تو پڑھنے والے میں ایک شان خودی و خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش — زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بھگوت گیتا میں اسی بات کی تلقین ہے کہ انسان کے افعال و اعمال صلہ کے خیال سے بے نیاز ہونے چاہئیں۔ یعنی کام کئے جاؤ چاہے معاوضہ ملے یا نہ ملے۔ لیکن دنیا کی کیفیت یہ ہے کہ جو پوجا پاٹ کی جاتی ہے وہ مکتی کے شوق میں اور جو سجدہ ہوتا ہے وہ حور و قصور کے خیال میں، اسی بات پر بگڑ کر اقبال فرماتے ہیں ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اقبال کے مجموعۂ کلام سے اسی قسم کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

فلسفہ و حکمت میں اقبال مولانا رومؒ کے مقلد ہیں۔ اور ان کا فلسفہ جد و جہد اور سعی و عمل کا پیغام ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو چمکائے اور اپنی خودی کو فروغ دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو خدائی پر قابض ہو سکتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

دیکھیے سست کار اور غافل انسان کو کس طرح درسِ عمل دیتے ہیں سے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو ساقی بھی تو، محفل بھی تو
بے خبر تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ خاموشی کہاں تک، لذتِ فریاد پیدا کر   زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

اقبال کو ریاکار و مکار مذہبی رہنماؤں سے سخت نفرت تھی۔ اور وہ ہمیشہ ریاکار پیرانِ طریقت کے خلاف لکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ حریص لیڈروں کی بابت فرماتے ہیں ؎

جن کو سالار میسّر ہوں شکم کے بندے
ایسی قوموں کی ترقی کی حقیقت معلوم
ہر گھڑی رنگ بدلتا ہو نیا جن کا ضمیر
حریت کا بھی سمجھ سکتے ہیں کیا وہ مفہوم؟

مکار صوفیوں اور سیہ کار پیروں پر بھی خوب لے دے کی ہے، فرماتے ہیں ؎

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ابتدا میں اقبال پُرخلوص وطن پرست شاعر تھے مگر ۱۹۱۰ء کی جنگِ بلقان کے بعد ان کی طبیعت نے یک لخت پلٹا کھایا۔ اور وہ وطنیت سے نفور ہو کر عالمگیر اسلامی اخوت کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں ہندوستان کو سب سے اچھا سمجھتے تھے۔ اب بیساختہ کہنے لگے کہ ؎

نہ میں اعجمی و ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

آخر کار اقبال کو وطنیت سے اس درجہ بیزاری ہو گئی کہ وہ یہ شعر کہنے پر مجبور ہو گئے ؎

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔

(۱۹۳۸ء)

پروفیسر عبدالحمید

اقبالؒ کے چند جواہر ریزے جنہیں چننے کا مجھے موقع ملا

"ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال علیہ الرحمتہ سے پہلی بار ملاقات کا شرف مجھے نومبر ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوا، اس سے پہلے میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے بیسیوں بار ان کو دور سے دیکھ چکا تھا، اسلامیہ اسکول لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں جب کبھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو ہر شخص کی زبان پر ہوتا"۔ آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے۔" ہر کس و ناکس وہاں موجود ہوتا، آپ بالعموم لے سے اپنی نظم پڑھا کرتے تھے، پہلی نظم جو میں نے ان کی زبان سے بغیر ترنم کے سنی "شکوہ" تھی۔ اس کے بعد "شمع و شاعر" اور "جواب شکوہ" (جو موچی دروازہ کے باغ میں پڑھی گئی) پھر دوبارہ ترنم "خضر راہ" سے شروع ہوا جو اسلامیہ اسکول دروازہ شیرانوالہ کے صحن میں پڑھی گئی تھی، ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت قدرے علیل تھی اس لیے "نظم مذکورہ" گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر پڑھی تھی۔

اس زمانے سے پہلے مجھ جیسے شخص کے لیے ڈاکٹر صاحب کا نام، ان کی شکل وصورت اور ان کا ترنم ہی باعث کشش ہوتا تھا، اسکول اور کالج کے زمانہ میں ہر مسلمان طالب علم کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ نہ کچھ اشعار (اور لاہور میں تو ہر ملت کے طلبہ کو) یاد ہوتے تھے اور مجلسیں ان اشعار کے ترنم سے گرمائی جاتی تھیں۔ کالج کے زمانہ میں میں ڈاکٹر صاحب کو ہر روز مشن کالج

کے دروازہ سے باہر والی سڑک پر اپنی مختصر سی گاڑی (ڈگ) میں چیف کورٹ سے واپس آتے دیکھتا تھا، چہرہ سرخ، سنہری مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ سوٹ، ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ، غرض اسی شان سے ہر روز تفریح کی گھنٹی میں مجھے دور سے ان کی زیارت نصیب ہوتی تھی، لاہور میں ہم لوگوں میں "ڈاکٹر صاحب" کا لقب "صرف اقبال" ہی کے لیے وقف تھا، اس لیے آئندہ سطور میں میں اسی لقب سے یاد کروں گا۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان بھر میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی، لاہور میں کانگریس کے کارکنوں کی خاص توجہ اسلامیہ کالج کی طرف مبذول تھی، مسلمان اور ہندو اکابر لاہور میں جمع تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق کانگریسی کارکنوں نے اسلامیہ کالج میں "جماعتوں" کا کام تقریباً ناممکن کر دیا تھا، خود اسلامیہ کالج کی ہستی معرض خطر میں تھی، ڈاکٹر صاحب ان دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سیکرٹری تھے۔ چنانچہ ایک روز کالج کے چند پروفیسروں نے (جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا) فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چل کر ان متضاد فتووں اور قراردادوں کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی، گاندھی جی کی انہوں نے بہت تعریف کی، اور جو کام وہ ہندو قوم کی بہتری کے لیے کر رہے تھے، اسے مدنظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کوئی تعجب نہ ہو گا۔ اگر ہندوؤں کی آئندہ نسلیں انہیں اوتار تسلیم کر لیں، ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، ظریفانہ انداز میں فرمایا "جس قدر کام کالج میں ہوتا ہے ہے، کرتے جاؤ، ہاں بھئی یہ ڈر ہے کہ کالج ٹوٹ نہ جائے اور آپ لوگوں کو تلاش روزگار کی زحمت اٹھانی پڑے، سو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا کاٹ دو، میں نے بھی یہ کام شروع کیا ہے اور میری صحت پر اس کا اثر بہت اچھا پڑا ہے، اس پر قہقہہ پڑا اور ہم لوگ واپس آئے۔

اس کے بعد مجھے گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا

رہا، اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک تو شاید کوئی ہفتہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی خدمت میں ایک یا دو بار حاضری کا اتفاق نہ ہوا تو ان صحبتوں میں طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں، اگر کوئی اور صاحب موجود نہ ہوتے تو میں ان سے بعض باتوں اور مسائل کے متعلق سوالات کرتا جن کا وہ کمال مہربانی سے شافی جواب مرحمت فرماتے، میرے ذمہ ایک فرض یہ تھا کہ فلسفہ اور جنرل سائنس کے متعلق جو اچھی اور تازہ چھپی ہوئی کتاب نظر سے گزرے اسے ان کی خدمت میں پیش کروں، اور پیش کرنے سے پہلے پڑھ لوں، چنانچہ کتاب لیتے وقت وہ مجھ سے اس کے متعلق رائے پوچھتے ہوئے اچھا خاصا امتحان لے لیا کرتے تھے،

ڈاکٹر صاحب کی زبان فیض ترجمان سے جو ہزارہا جواہر ریزے بکھرتے رہے ہیں، ان میں سے چند (جو مجھے یاد ہیں اور جن میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لئے بار خاطر ہو) میں نے یہاں جمع کیا ہے، ان میں ان باتوں کو درج نہیں کیا ہے جن میں ملی یا سیاسی معاملات پر تفصیلی بحث تھی، یا جن میں فلسفہ یا سائنس کے دقیق مسائل پر بحث تھی، ایسی باتوں کو بھی ترک کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ذاتیات سے ہے، ایسی باتیں بھی نہایت پر لطف اور سبق آموز ہوتی تھیں، لیکن ان کا شائع کرنا مناسب نہیں،

ڈاکٹر صاحب کی یاد ان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں ابھی تازہ ہے، وقت گزرتا جائے گا، اور ان کی شخصیت کے خط و خال ذہن میں دھندلے پڑتے جائیں گے، اس وقت ہر اس شخص کے پاس جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا (اور ایسے اشخاص کی تعداد ہزارہا ہے) ان کا کوئی نہ کوئی ذہنی تبرک ضرور موجود ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ان تبرکات کو جمع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو زندگی میں کوئی بوسول (BOSWELL) نہ ملا، اس لیے درخواست ہے کہ جن بزرگوں اور دوستوں کو ان سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا ہو وہ ان کے جواہر ریزوں کو ضائع ہونے نہ دیں اور جلد تر انھیں دنیا کے سامنے پیش کر دیں،

ڈاکٹر صاحب کے بصیرت نگاروں کو اس مواد سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ انتہیٰ"

۱۔ ایک روز طہارت کے اسلامی قواعد کا ذکر اتفاقاً چھڑ گیا۔ اس سلسلہ میں غیر مسلم قوموں کی طہارت بھی معرض بحث میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے۔ "میں جب طالب علمی کے سلسلہ میں انگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ تھا، میں جب کبھی رفع حاجت کے لیے غسلخانہ جاتا، تو میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا، چند روز اسی طرح سے گذرے، آخر میری میزبان یعنی مالکہ، مکان (LANDLADY) سے رہا نہ گیا (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ ہوں گی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھیں) مجھ سے پوچھنے لگیں، یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لیجاتے ہو، میں نے ان سے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ہے۔ بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، میں (یعنی ڈاکٹر صاحب) نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کئے، مثلاً یہ کہ غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طہر کا غسل، میں نے کہا، بڑی بی، کسی خاص غسل کی تو آپ کو حاجت نہ ہوگی، البتہ طہارت کے لیے پانی ضرور استعمال کیا کیجئے، یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں کہ ضرور ایسا کروں گی، مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں،

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ سائنس داں اور اہل طب کو اسلامی قواعد طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں جو کام اہل فقہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہیئے۔

۲۔ "یہود" کا لالچ اور دولت کا عشق ضرب المثل ہے، اس کے متعلق کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے میری گفتگو ہوئی، ایک مرتبہ مثال کے طور پر فرمانے لگے کہ جب انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ میرے قیام کا انتظام ایسے گھرانے کر وادیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو، یورپ میں صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں۔ چنانچہ ایک اچھے یہودی گھر میں میری رہائش کا انتظام کر وادیا گیا، ان لوگوں میں بہت خوبیاں تھیں، اپنی "نماز" باقاعدہ پڑھتے تھے۔ جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا، میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ میرے لیے بھی پیغمبر ہیں۔

اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں، وغیرہ، لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا، مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں ان کے ذریعے سے منگواتا تھا، یہ لوگ دوکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے، ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

۳۔ ہندوستانی مذاہب پر ایک روز مجھ سے باتیں کر رہے تھے، بدھ مت کا ذکر آگیا، فرمانے لگے انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا، یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی، اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا، گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا (ALL CHANGE) یعنی "سب بدل جاؤ"۔ ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا، کہ میرے اردگرد اخبار بیں مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیئے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا، میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں، یہ کہہ کر چپ رہا، چند منٹوں کے بعد انھوں نے دوبارہ مجھ سے پوچھا، میں نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہوں، وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں، میں نے کہا ہاں، اس دوران میں اسٹیشن آگیا اور گارڈ (ALL CHANGE) پکارنے لگا، میں نے کہا بس یہی بدھ مذہب ہے، ALL CHANGE (یعنی مسئلہ تناسخ)

۴۔ کیمبرج کے زمانہ میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیانِ مذہب دنیا میں آئے، وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پیترا جمایا، اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اسی لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے، وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ انہوں نے جواب دیا، یہ تمہارے میکاؤلی اور مشہور اہلِ سیاست اس کے رسول ہیں، اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

۵۔ یورپ اور انگلستان میں اس وقت بھی ہزاروں اشخاص ایسے موجود ہیں جن کے خیال میں ہندوستان میں صرف بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جنگل، بیابان، چند بڑے بڑے شہر، شیر، سانپ، بچھو، سپیرے اور جنگلی لوگ پائے جاتے ہیں، یہ خیال بہت کچھ یورپین پادریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی جدت طبع کا مرہون منت ہے، اسی طرح سے یہ لوگ اپنی بہادری اپنے ہمعصروں پر جتا سکتے ہیں اور گپیں ہانک کر مجلسوں کو گرما سکتے ہیں، چنانچہ طالب علمی کے سلسلہ میں جب اقبال انگلستان گئے (یہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا) تو انھیں بھی اس طرز خیال کا تجربہ ہوا، ایک مجلس میں ایک لیڈی صاحبہ پوچھنے لگیں، کیوں مسٹر اقبال! کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟ ڈاکٹر صاحب نہایت سنجیدگی سے بولے، نہیں بی جان، ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن،

۶۔ ایک مرتبہ ایشیا اور یورپ کے باہمی فرق و امتیاز کا ذکر ہو رہا تھا، میں نے پوچھا کیسا ایشیا اور یورپ کی عورتوں میں بھی وہی فرق ہے جو ان ممالک کے مردوں کے درمیان ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں میں نے انگریز اور جرمن عورتوں کے باہمی امتیاز اور فرق کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا (انگریز اور جرمن عورتوں کی تخصیص اس لئے کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب طلب علم کے زمانے میں زیادہ تر ان ہی دونوں ملکوں میں رہے تھے) فرمایا "انگریز عورت میں وہ "نسائیت" اور "بے ساختگی" نہیں جو جرمن عورت میں ہے، انگریز عورت گھریلو زندگی اور اس کی بندشوں کی اس طرح شیدا نہیں جس طرح کہ جرمن عورت ہے" میں نے عرض کیا آپ کے اس خیال کی تصدیق مسٹر ڈبلیو، ٹی، سٹیڈ (W. T. STEAD) (جو انگلستان کے مشہور سیاست دان تھے اور کسی زمانہ میں انگریزی رسالہ ریویو آف ریویوز کے مدیر بھی تھے) کے ایک قول سے ہوتی ہے، جو اس وقت مجھے یاد ہے ایک موقع پر انہوں نے یہ کہا تھا کہ جرمن عورتیں درحقیقت پردہ میں ہیں، (یہ قول زمانہ قبل از جنگ کا ہے، لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اب بھی صحیح ہو) انگریز اور امریکن عورتوں کی آزادی کے مقابلہ میں جرمن عورتیں تقریباً پردہ ہی میں ہیں۔

۷۔ طلب علم کے سلسلہ میں جب ڈاکٹر صاحب لندن میں تھے، تو سر سید علیہ الرحمۃ کے ایک رفیق جن کا اسم مبارک مولوی...... صاحب تھا (غالباً آپ ایڈووکیٹ تھے) سیاحت کے

اور ہندوستان جاتے ہوئے، لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات لے کر جاتے لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رخ خواہ برا ہو یا بھلا بہت اہم ہے، اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھا دوں، میں انھیں جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا، اقبال کا یہ خیال کہ زندگی کا ہر پہلو دیکھنے سننے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے، ان کے اسلامی فلسفہ کا ایک اہم رکن تھا اسی خیال سے مجبور ہو کر انہوں نے سوامی۔ بی کے سوانح نگاروں کو ٹوکا تھا، دیکھئے نیچے نمبر ۸)

۸۔ جسم اور روح کی جو غلط تقسیم پرانے زمانے سے فلاسفہ اور مذاہب میں ہو چکی ہے۔ اس کے برے نتائج میں سے سب سے برا نتیجہ یہ ہے کہ عام مذاہب میں جسم اور اس کی خواہشات کو برا کہا گیا ہے، لیکن اسلام میں نہ "جسم" کو کبھی برا کہا گیا اور نہ جسمانی لذات کو کوسا گیا ہے صرف اس کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں، جو شخص اسلامی حدود کے اندر رہ کر جسمانی لذات حاصل کرے، اس سے مواخذہ نہیں، اور نہ وہ گنہگار ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ ان لذات میں ترتیب کا لحاظ رکھے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کے لیے قربان نہ کرے، دوسرے مذاہب کے بانی اور پیرو لذات جسمانی سے اس قدر متنفر ہیں، کہ خود "جسم" کا وجود ہی گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اس گناہ کا کفارہ صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر طرح سے "جسم" کو ایذا دی جائے اور جسمانی لذات کے حصول کو گناہ کبیرہ سمجھا جائے، ادھر "جسم" میں خودی ہے، جس قدر اس کو ٹھکراؤ بگڑتا ہے، دباؤ ابھرتا ہے، لذات سے محروم رکھو تو ہر وقت ان ہی کی فکر میں رہتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس اسلامی تعلیم کو بار بار اور نئے نئے رنگ میں اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے۔

قریباً بارہ یا سترہ سال ہوئے، میں ایک روز شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں یہی مسئلہ معرض بحث میں آ گیا، فرمانے لگے، ابھی چند ہی روز ہوئے کہ مجھے اس اسلامی تعلیم کی صحت کا ثبوت ضمناً ذکر کرنا پڑا، دو تین ہندو صاحبان میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے رشی سوامی جی کی سیرت لکھی ہے، آپ چونکہ سوامی جی کے گہرے دوست تھے، اس لیے آپ اس سیرت پر نظر ثانی فرمائیں اور ہمیں مزید مواد

سلسلہ میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے انگلستان پہنچے، (ان بزرگ کو میں نے ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے وفد میں لاہور میں دیکھا تھا، میں ان دنوں اسلامیہ اسکول میں پڑھتا تھا، اس وقت مولوی صاحب شکل و ہیئت میں بالکل سرسید کا ثنی تھے، وہی لمبی ترکی ٹوپی، لمبی سفید داڑھی سیاہ مارننگ ڈریس، الغرض چھوٹے پیمانے پر سرسید معلوم ہوتے تھے) پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جنہیں اقبال سے شغف تھا اور جن کی توجہ سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی مستفید ہوئے تھے، ان دنوں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے اور اقبال کے مربی خاص تھے، بلکہ جب پروفیسر موصوف چند ماہ کے لیے مصر تشریف لے گئے تو اقبالؔ ہی کو وہ اپنا جانشین بنا کر گئے تھے۔

مولوی صاحب لندن میں تشریف لائے چونکہ پروفیسر آرنلڈ سرسید مرحوم کے حلقۂ اثر بلکہ خود علی گڑھ کالج میں رہ چکے تھے، اس لیے مولوی صاحب ان ہی کے پاس گئے، انھوں نے اقبال کو حکم دیا کہ بھئی مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابل دید جگہیں اور چیزیں دکھادو...... اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا، اور شام کے قریب کسی قہوہ خانہ میں جا بیٹھایا، وہاں چائے اور قہوہ کے علاوہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اور خدا جانے اقبال کے اشارے یا خود اپنی جولانی طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہوگئیں، کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پینے کی تلقین کرتی، کوئی ان کی نورانی داڑھی پر شیدا تھیں، ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت مندی کی ایک دو مہریں بھی جڑ دیں، اس مصیبت سے جب ان کو نجات ملی تو وہ غصہ سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کی خدمت میں پہنچے اور اقبال کی شکایت کی، دوسرے روز جب اقبال، پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بہت خفا تھے، فرمانے لگے، اقبال تم لندن میں آکر بے حد شریر ہوگئے ہو، تمہیں شرم نہ آئی، مولوی صاحب ایسے بزرگ کو اس قہوہ خانے میں لے گئے۔ اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا، "قبلہ" آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابل دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھادوں، اگر میں مولوی صاحب کو صرف لندن کا عجائب خانہ، چڑیا گھر، محلات، تاریخی عمارتیں، وغیرہ ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے،

دیں، بلکہ خود بھی کچھ لکھیں وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے کہا "جو سیرت آپ نے لکھی ہے، دکھلیئے"۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا، یہ سیرت بالکل اسی طرح سے لکھی گئی تھی جیسے اس نوع کی کتابیں بالعموم لکھی جاتی ہیں یعنی ممدوح کو فرشتہ سیرت، ولی اور ہر قسم کی لغزشوں اور نقائص سے مبرا اور منزہ ثابت کرنا، ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا۔ آپ لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، اور نہ اس درس عبرت کا جو ان کی زندگی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں ذکر ہے، انہوں نے پوچھا وہ کیا، فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ فلاں سال سوامی جی اپنی تعلیم ہمہ اوست اور "برہمچاریہ" کے پرچار کے لئے امریکہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں بعض لوگ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، ان کے حلقہ اثر میں آگئے۔ ان میں ایک مریدنی ضرورت سے زیادہ فیضیاب ہوئی، لیکن واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچہ دونوں کو امریکہ ہی میں چھوڑ آئے، یہ واقعہ ایک نہایت اہم اور عبرت آموز سبق ہے جو سوامی جی کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے، کہ وہ خود "برہمچار" کو نباہ نہ سکے اور اپنے اس فعل سے انہوں نے اپنی تعلیم کو غلط ثابت کر دکھایا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس غلط تعلیم اور غلط اصول کو چھوڑتے، انہوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا، اور اس وجہ سے انھوں نے بچہ اور اس کی ماں کو امریکہ میں چھوڑ کر ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا، آپ لوگوں کا فرض تھا کہ سوامی جی کی زندگی کے اس اہم واقعہ کو کھول کر بیان کرتے تاکہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی کس حد تک کامیاب رہے"۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ان دوستوں کو کیوں بھاتی، کہنے لگے "جناب والا ان باتوں کو کتابوں اور سیرتوں میں لکھنا نہیں چاہیئے، یہ کہہ کر واپس چلے گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ سوامی جی سے آپ کی دوستی کس زمانہ میں تھی، فرمایا کہ لاہور میں طالب علمی کے زمانہ ہی میں میری ان سے دوستی بڑھ گئی تھی، میں نے انہیں مثنوی مولانا روم سے آشنا کیا تھا، بلکہ پڑھائی بھی تھی، سوامی جی سے میں نے سنسکرت سیکھنا شروع کی تھی، ڈاکٹر صاحب سوامی جی کے خلوص نیت اور روحانی سرشاری کے بہت معترف تھے۔ اور اسی لیے وہ سوامی جی کے برہمچار کی ناکامی میں ان کی حیات کا اہم ترین سبق پاتے تھے، یعنی جو

بات سوامی جی سے بھی نبھ نہ سکی وہ ہے غلط۔

۹۔ چند سال ہوئے ایک جرمن یا آسٹرین سیاح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا، آپ اس زمانہ میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے، سیاح صاحب "جہاں گرد" (GLOBETROTTER) تھے۔ علی بخش (ڈاکٹر صاحب کا ملازم) نے اسے پہلے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پٹھانستان کا کوئی فقیر ہے، اسے اندر بلوایا گیا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی "بیاض" دکھائی جس میں ہر ملک کے مشہور و معروف لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا، سیاح مذکور نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی اس میں کچھ لکھدیں، انہوں نے فارسی کا ایک قطعہ لکھکر دستخط کر دیئے، اس نے پوچھا آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا۔ میرے آباؤ اجداد برہمن تھے، انہوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے۔ میں اپنی عمر اسی سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسانیت کیا ہے۔

۱۰۔ ۱۹۲۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا، ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھتے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پہ بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے۔ یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے۔ میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لیے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کے صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے؟" انہوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعربازی" سے تمہیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعربازی" کی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعربازی کی طرف اسی لیے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں "بقا" کا عنصر موجود ہو۔

آپ نوجوان ہیں، آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہیئے۔ ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کم وبیش یہی ماحصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوانوں شعرا کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور وہ بیچارے سن کر بورڈنگ ہاؤس سدھارے۔

۱۱۔ ۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے۔ ان کی لیاقت، وسعت علم اور بالخصوص فصاحت وبلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں۔ فن تقریر میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان، محاورہ، تلفظ اور ادب میں تو انھیں بلا کی دسترس حاصل تھی۔ میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ بھی نئے نئے وارد ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزی فن تقریر میں ان کا پایہ مسلم ہے، لیکن یاد رکھو کہ انبیا اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر جو لوگ بےضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔ IN PEAPLE OTHER THAN PROPHETS AND GREAT NATIONAL REFORMERS, TOO MUCH OF PUBLIC SPEAKING IS VERY OFTEN A SIGN OF SPIRITUAL POVERTY - "بانونی" حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں، میں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لیے بہت منہمک رہا، لیکن بعد میں میں نے اسے بالکل ترک کر دیا، علامہ نے جو کلیہ اوپر بیان فرمایا ہے۔ اس میں "بےضرورت" (TOO MUCH) یا "ضرورت سے زیادہ" پر زور دیا ہے۔ عوام اور سامعین سے خراج تحسین حاصل کرنے میں مقرر صاحب کو وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث پر پورا عبور کئے بغیر دھواں دھار تقریر فرما دیتے ہیں، اس لئے ایسے بزرگوں کے اقوال وتقریروں میں سطحیت کا عنصر زیادہ نمایاں رہتا ہے، بہت کم مقرر ایسے ہوتے ہیں جو کاوش اور مطالعہ سے اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ رکھتے ہیں، ان

سطحی مقررین کے برعکس جو شخص کچھ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ اپنے الفاظ پر غور کرتا ہے اور جب تک اسے اپنی بات اور اپنے استدلال پر پورا یقین نہیں ہوتا، وہ انھیں عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس حقیقت کو البتہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کے دلوں کی تسخیر کے لیے جو طاقت اور جذب تقریر میں ہو سکتا ہے وہ تحریر میں ممکن نہیں۔

انبیاء اور مصلحین اقوام ہر وقت فکر و عمل میں مصروف رہتے ہیں وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ان کے الفاظ ان کے فکر و عمل اور ان کی روحانیت و الہام کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ شوقِ تقریر سے مجبور ہو کر نہیں بولتے بلکہ صرف اس لیے بولتے ہیں کہ بغیر تقریر کے چارہ نہیں، ان کی تقریر سراسر روحانیت ہوتی ہے کیونکہ خود خدا ان کا سکھانے والا ہوتا ہے۔

۱۲۔ ۱۹۲۶ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیت مدیر کریسنٹ (CRESCENT) (رسالہ اسلامیہ کالج لاہور) حاضر ہوا، اور ملتجی ہوا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکلنا ہے، براہِ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لیے دیجیے، تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے فرمانے لگے، مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو۔

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیش برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

میں نے اسے چھاپ دیا، اس سے بہتر پیغام مسلمان طلبہ کے لیے تو شاید ناممکن تھا۔

۱۳۔ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں جب مسٹر منوہر لال وزیر تعلیم پنجاب تھے۔ تو مسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب محکمہ تعلیماتِ پنجاب ان دنوں سر جارج اینڈرسن تھے۔ مسلمان ممبرانِ کونسل کا ایک مختصر سا وفد اس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب کے پاس گیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی وفد میں شامل تھے۔ رسمی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں ہوئیں، ڈائرکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا۔ اور جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اس کی تلافی کی پوری کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافتِ سقراط سے کام لیا اور سر جارج سے فرمانے لگے، اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا۔ ہم لوگ تو مسلمان

ہیں، آپ کے اس وعدہ ہی سے خوش ہو گئے ہیں۔ اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔

۱۴۔ ۱۹۲۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ (KNIGHT HOOD) کا خطاب ملا، تو اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے پر مدعو کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے (جوان کا عمر بھر شیوہ رہی) یہ دعوت قبول فرمائی، چنانچہ وقتِ مقررہ پر آپ تشریف لائے، آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب بھی ساتھ تھے، چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی۔ کہ ان کی ہدایت کے لیے چند کلمات فرمائے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے، جسے "فن برائے فن" (ART FOR ART O'SAKE) کہتے ہیں۔ اس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیار صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیت کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حقدار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا ارتقاء کسی فوق کے بلند اصول کے ماتحت نہ ہو، وغیرہ، مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے۔ اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان اقوام کو گمراہ کر رہے گا، میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا، فن جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے، تو وہ بہت جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے۔ اعلیٰ مقصد کی تکمیل یا پیروی کے لیے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کرے گا اور قوم و ملت میں ایک نئی روح پھونک دے گا، لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا تو قوم و ملت کے حق میں زہر قاتل بنے گا۔"

میں نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا ماحصل (جو شاید دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ تھی) اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، بالخصوص اس نظریہ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کر کے بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے۔ یہ تقریر سنے مجھے کئی سال گذر چکے ہیں۔ لیکن بعد

کے واقعات نے ان خیالات کو میرے ذہن سے محو ہونے نہیں دیا، ہر طرف "فن برائے فن" کی تباہ کاریاں ایک وبا کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ جرمنی اور اٹلی میں تو ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی بیخ کنی کی ہے۔ لیکن دوسرے مشہور مغربی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا۔ ہندوستان میں کچھ عرصہ سے یہ نظریہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے، آزاد خیال فنین (ARTISTS) اس کے مبلغ ہیں اور عریانیت ان کے فن کے اسرار کی کلید، ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کے مہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً "محکوم اور زوال پذیر اقوام کے جمالیات" کے تذکرہ میں بیان کیا ہے اس نظریہ کے برعکس انہوں نے اپنی تعلیم اس شعر میں نہایت بلیغ طریقہ سے بیان کی ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است

۱۵۔ ۱۹۲۷ء میں میں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا۔ ممبران سٹاف نے کمال مہربانی سے چائے کی ضیافت دی۔ ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی۔ اس لیے انھیں مدعو کیا گیا۔ (یعنی اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے) وہ از راہ ذرہ نوازی شامل ہوئے۔ باتیں ہوتی رہیں، دوران گفتگو میں منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا فرمانے لگے پروفیسر میرا دوست ہے۔ اس کے ملازمتی جنازہ کے لیے مجھے ضرور وقت نکالنا تھا ——

THE PROFESSER IS MY FRIEND - I HAD TO FIND TIME FOR HIS OFFICIAL FUNERAL اس پر قہقہہ پڑا۔ فرمانے لگے کہ میں نے ان الوداعی پارٹیوں کے لیے "ملازمتی جنازے" کی اصطلاح وضع کی ہے۔

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ باتوں باتوں میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا۔ یوسف علی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا! کیوں صاحب، آپ کو تو پردہ کی مخالفت ضرور کرنی چاہیئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہوں، یوسف علی صاحب نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ پردہ سے جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے۔ بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھل جاتا ہے۔

جو جنیت کی جان ہے۔ اس مختصر سے جواب میں انھوں نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصول کو لطیف پیرایہ میں بیان کر دیا۔

۱۶۔ ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ ان کا کلام اور ان کا کام باقی رہے گا، عرصہ ہوا، میں نے ایک روز عرض کی کہ یورپی زبانوں میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صورت میں شائع ہو جائے تو نہ صرف خود یورپ کے حق میں مفید ہوگا۔ بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق بھی اہل یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دور ہو جائیں گی۔ آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں۔ فرمانے لگے کہ میرا کلام باقی رہے گا (MY WORKSHALL LIVE) تراجم آہستہ آہستہ ہو ہی جائیں گے۔

۱۷۔ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور جھوٹا اعتراض اسلام کے خلاف دہرایا۔ اور پوچھا کہ "سر محمد کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے روح نہیں ہوتی"۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "کیا روح سے آپ کی مراد وہی شے ہے۔ جو آپ لوگوں کے خیال میں جسم سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔" معترض صاحب نے کہا جی ہاں۔ انھوں نے جواب دیا "تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی روح نہیں ہے۔" اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے کہ روح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور یہ پرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں۔ لیکن روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں۔ جن سے وہ بنا ہوا روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے، جس کی وجہ سے بیسیوں ناقابل حل مسئلے فلسفہ، مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں۔ اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت (SPIRITU AL AND ORGANIC BEING) تصور کرتا ہے اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لیے بھی قائم رہتا ہے۔

چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لئے جو جزا اور سزا مقرر ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے۔ وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی، ڈاکٹر صاحب نے مندرجۂ بالا جواب میں اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے کہ اسلام کے مطابق روح جسم سے علیحدہ کوئی شے نہیں۔ اس لیے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں کس بلاغت اور ظرافت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے۔ بلکہ ایک اہم اصول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی روزمرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی۔

۱۸۔ دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں انگلستان کی مشہور سیاح خاتون، مس روزیٹا فوربس (MISS ROSITA FORBES) نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، چنانچہ مس صاحبہ نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا، یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں اور ان پر اس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ ان کا محل جو لندن میں ہے۔ وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرز آرائش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے۔ سامان آرائش، غالیچے، زیب و زینت کے انداز ہر لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون الرشید کے بغداد کے کسی محل کا خاکہ ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی ضیافت ہوئی، اور پر لطف مجلس رہی، لیکن انھیں خاتون کے محل کی تعریف کا موقع نہ ملا، روانگی کے وقت مس صاحبہ سے نہ رہا گیا۔ پوچھنے لگیں۔ "سر محمدؐ میرے اس مکان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "آپ نے اپنی بہشت دنیا میں پائی، میں اپنی بہشت کا منتظر ہوں"۔

۱۹۔ دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی۔ اس ملاقات میں موسولینی نے ان کی تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی تعریف کی۔ گفتگو آدھ گھنٹہ سے زیادہ رہی دورانِ گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اطالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے، جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی۔ ایران کی تہذیب فرسودہ تھی اور قوم کے قواشل ہو چکے تھے۔ ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی۔ ایران کی خوش قسمتی سے اس

کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی۔ جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اور یہ قوم ایک پرشکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہلِ فن، اہل سیاست اور اہلِ سیف پیدا ہوئے۔ اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون دیا۔ اور اسے قرون وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے، کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب ترکمان موجود ہیں۔ اور مغرب میں اندرون عرب کے جری قبائل۔ یہ قومیں اپنا خون دے کر ایران کو پھر زندہ اور قوی کر دیں گی۔ لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مہذب قومیں آباد ہیں۔ جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں۔ اطالیہ تازہ خون کہاں سے لے گی؟" ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ موسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا۔

۲۰۔ ڈاکٹر صاحب پر حسن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا، روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے موسولینی کی ملاقات کے لیے وقت مقرر کرایا تھا) جو اطالیہ کے طبقۂ امراء سے تھی، ان سے دریافت کیا۔ اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہے، تو فرمائیے؟ تاکہ اس کا انتظام کیا جائے، فرمایا کہ اطالیہ کا حسن مشہور ہے۔ میں اس شہر روما کی حسین ترین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی، فرماتے تھے، کہ اطالیہ کا حسن یورپ میں بہترین ہے، اور اس ضیافت میں روما کے حسن کے بعض نہایت لطیف نمونے تھے۔

۲۱۔ گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگسان سے ہوئی، برگسان کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا، اس کا نظریہ "واقعیت زمان" (REALITY OF TIME) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے بہت قریب تھا، چنانچہ دوران ملاقات میں اس پر بحث ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے برگسان کو

یہ حدیث سنائی، کہ "زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خدا ہے،" فرماتے تھے، کہ جس وقت برگسان نے یہ حدیث سنی تو وہ کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کیا یہ سچ ہے؟"

۲۲- گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا، اس سفر کے واقعات انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے مفصل سنائے قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اس کے مالک (مینیجر) سے آپ نے سب سے پہلے ہی پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں، اس نے جواب دیا، کہ بڑی تعداد میں، آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے، مینیجر مسکرا کر بولا، اس کام کے لیے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، میں خود مراکشی اصل سے ہوں (جنوبی ہسپانیہ کے ان باشندوں کو مورسکو (MORISCO) کہا جاتا ہے) حسنِ اتفاق سے آپ کو پرانی عمارتیں دکھانے کے لیے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا، (آپ نے شرط یہ رکھی تھی، کہ راہبر انگریزی جانتا ہو، کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے آشنا نہیں) وہ بھی مراکشی اصل سے تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشی اثر چہروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے، چنانچہ "مسجد قرطبہ" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے،

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال   اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے   رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسی سفر ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسین (ASIN) سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ یہ وہی پروفیسر ہیں، جنہوں نے قریباً پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوتے ہیں، ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی تھی، جس میں یہ ثابت کیا تھا، کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص ان حدیثوں اور روایتوں کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور عذابِ دوزخ سے متعلق ہیں، کسی قدر غالب تھا، دانتے کی شہرۂ آفاق تصنیف ڈیوائنا کامیڈیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ پروفیسر آسین کی خواہش تھی، کہ مسلمان طالب علم بالخصوص ہندوستان کے مسلمان طالبعلم ہسپانیہ میں آئیں، اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی مخطوطوں کا مطالعہ کریں، جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں، (خدا جانے اس خوفناک جنگ

میں ان نایاب مخطوطوں کو کس قدر نقصان پہنچا ہو،)

ڈاکٹر صاحب کو سفرِ ہسپانیہ میں معلوم ہوا، کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، ملک میں ایسے نوجوان اور فضلاء نکل آئے تھے، جو ہفت صد سالہ اسلامی حکومتِ ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہہ کر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا، کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا، حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادت گاہیں بنالی تھیں، وطنیت کی اس تحریک، کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے مسجد کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا، اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت الٰہی کی ایک دلپذیر مثال یہ سنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضہ میں آئی، تو انھوں نے آیاتِ قرآنی پر جو سنہری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں، پلستر کرا دیا، آج قریباً پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثار، قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے، تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دنیا کے سامنے آتے ہیں اگر پلستر نہ ہوتا، تو یہ نقوش غالباً اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے کہ "مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھکر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا"، ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے نوٹ کرنی پڑی کہ اس وقت اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے، ان کا خیال تھا کہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بے دردی سے گرا دیا ہوگا، اور یا خود مراکشی اندلسی مسلمانوں کو یہ ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا، جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے، پہلا خیال غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کی آب و ہوا کی بے حد تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اس ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں، اور ان کی فضا، اس قدر پاک اور شستہ ہے کہ آج کا پکا ہوا

سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا۔

۲۳۔ دو سال کے قریب ہوئے اسپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہوا تو یہ خبریں بھی پہنچنا شروع ہوئیں، کہ جنرل فرانکو کی فوج کا زیادہ حصہ خصوصاً وہ حصہ جو یلغاروں میں اور فیصلہ کن لڑائیوں میں (STORM TROOPS) صف شکنوں کا کام دیتا ہے، تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضاکاروں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ کے بعد ان جفاکش اور جری سپاہیوں کی تصاویر بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں، ان خبروں سے ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہوا تھا اور ہے، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خیال کے اثر کا ذکر کیا کہ سرزمین اندلس قریباً بارہ سو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی بہادروں کے قوی بازوؤں سے سر ہو رہی ہے، ڈاکٹر صاحب فوراً بولے تمہیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا، اس میں میں نے پیشینگوئی کی تھی۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی	دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں	میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے	لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

۲۴۔ ڈاکٹر صاحب پر جرمن مفکر نٹشے کا بہت اثر تھا، "خودی" کے اسرار ان پر اس وضاحت اور حقیقت سے فاش نہ ہوتے، اگر نٹشے کی تصانیف سے وہ لاعلم رہتے، بالِ جبریل چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ میں نے ان سے عرض کیا، کہ پچھلے دنوں میں نے نٹشے کی فلاں فلاں کتابیں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے، لیکن اس کی فکر میں وہ تازگی، جوش اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اس کے بنیادی خیالات اسلام سے اس قدر قریب ہیں کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا، قرآن سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں "انکارِ الوہیت" (GODLESSNESS) کی تعلیم دینا پڑی، عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو بکری کا بیلا اور اخلاق کو روحانی پست ہمتی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "تمہارا یہ خیال بالکل صحیح ہے، اسی لیے تو میں نے نٹشے کے متعلق کہا ہے کہ ع

قلبِ او مومن، دماغش کافر است

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہین کا فقیر و درویش ہونا نطشے کے زروشت کے اس وعظ سے بہت قریب ہے، جس میں وہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسائیگی نصیب ہے۔

۲۵۔ ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین موقعوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پوچھا، بیدل کے متعلق ان کی رائے نہایت اچھی تھی، میں نے ایک بار کہا کہ اس کی فارسی میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے، فرمانے لگے کہ تھوڑی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے، بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جنھیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی، بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے۔

۲۶۔ پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک روز جب میں شام کے وقت حاضر خدمت ہوا تو آپ حسب معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے، اس سے چند مہینے پہلے ایک دو مرتبہ انھوں نے اپنے بچوں کے لیے ایک معلمہ یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا، کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں ایک یورپین خاتون بچوں کو لے کر گزریں۔ میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ یہ خاتون بچوں کی اتالیقہ ہیں، جرمن نسل سے ہیں اور نہایت شریف الطبع ہیں، انھیں ہر وقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے، اور فرصت کا کوئی وقت بھی وہ بے کار نہیں گزارتیں، کچھ کام نہ ہو تو کمرہ ہی جھاڑنا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ بچوں کی طرف سے تو میری طبیعت اب بالکل مطمئن ہے، البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی محسوس ہو رہی ہے، علی بخش میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن میرے لیے اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گزرتا ہے، لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، شام کا وقت بھی اسی طرح گزرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، پڑھنا بند ہو چکا ہے، اور سوئے انسان کب تک، میں نے عرض کی کہ موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین ہو گی، فرمایا کہ مجھے

موسیقی کی بہت خواہش ہے، میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں المیت کا عنصر بہت غالب ہے، اور ذوقِ حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سُنا، اس نتیجہ پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکے تھے۔

۲۷ء ۱۹۳۷ء میں سید سر راس مسعود مرحوم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی، اس کے چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم ان کو بہت عزیز تھے، چنانچہ جب میں نے ان کی خدمت میں اظہار افسوس کیا تو انھوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی، میں نے پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیاں کیا تھیں، فرمانے لگے کہ دو باتیں ان میں نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ بے حد فیاض تھے، ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، کسی کی تنگدستی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اسی لیے ان کی تنخواہ (اگرچہ معقول تھی) ان کے لیے کافی نہ تھی، کوئی سائل ان کے گھر سے خالی نہ جاتا تھا، میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں، ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انھیں لکھا کہ میں نے اپنی وصیت میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب فوت ہو گئے ہیں مجھے بہت خوشی ہوگی، اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں، انہوں نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دور ہوں، اس لیے بحیثیت سربراہ میں بچوں کو کیا فائدہ پہنچا سکوں گا، البتہ آپ براہ مہربانی اپنی وصیت میں یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچوں کو خدانخواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار مجھے سمجھا جائے۔ دوسری نمایاں خصوصیت مرحوم میں یہ تھی، کہ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا، اور ان کا کھانا بہترین، ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے اور عمدہ کھانوں اور ضیافتوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا، الغرض مرحوم ہندوستان کے خوش وضع اور مخیر اکابر میں سے تھے اب ان کا جانشین یا ثانی مشکل

سے ملے گا۔"

۲۸۔ ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس وقت وہ خوابگاہ میں پلنگ پر بیٹھے تھے، کچھ دیر تک وہیں باتیں ہوتی رہیں، پھر علی بخش نے آکر اطلاع دی، کہ کھانا تیار ہے، (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے چلو دوسرے کمرہ میں بیٹھیں، ڈاکٹر صاحب سوفا پر بیٹھ گئے، علی بخش نے کرسی سامنے رکھدی، اور کھانا اس پر چن دیا، میں کھانا کھاکر گیا تھا، اس لیے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، آپ اشتہا سے کھانا کھاتے رہے، اور باتیں بھی ہوتی رہیں، اتنے میں رحما (دوسرا ملازم)، اندر آیا، اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میاں (نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب مرحوم کے صاحبزادے) آئے ہیں، آپ نے فرمایا یہیں بلاؤ، چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھدی گئیں، اور دونوں صاحب اندر تشریف لائے، مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پرسی کی، ڈاکٹر صاحب نے عادت کے مطابق فرمایا، بہت اچھا ہوں، مسٹر یوسف علی نے فرمایا، میرا بھی خیال ہے، کیونکہ کھانا کھانا خود صحت کی نشانی ہے، ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، بتائیے انگلستان سے کیسے آمد ہوئی، یوسف علی صاحب نے جواب دیا کہ قرآن کریم کے آخری تین پاروں کا ترجمہ زیر طبع ہے، یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کے لیے آیا ہوں، کسی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا، (جو میں بھول گیا، اس میں وہابیوں کی "پیوست" کا ذکر تھا) میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا، لیکن غالباً وہ مجھے پوری طرح سے پہچان نہ سکے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ پروفیسر حمید کو پہچانتے ہیں؟ اسلامیہ کالج میں دوسال آپ کے ماتحت کام کر چکے ہیں مسٹر یوسف علی بولے ہاں، ہاں، بعد میں تمہیں گجرات میں بھی تو دیکھا تھا، لیکن بھئی تم نے اپنے بال کیوں اس قدر سفید کر رکھے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مڑکر کہا، آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے، وہ بولے پہلے (اسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا، آج کل آزاد ہوں، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے لیے (میری طرف اشارہ کرکے) زمان (TIME) کی رو آگے کی طرف بہہ رہی ہے، اور آپ کے لیے پیچھے کی طرف

TIME IS MOVING FORWARS FOR THE PROFESSER AND BACKWARDS FOR YOU)

اس کے بعد حسب ذیل باتیں ہوئیں۔

یوسف علی صاحب۔ فرمائیے آجکل کچھ زیر تصنیف ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ اردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے۔

یوسف علی صاحب:۔ آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے کہ آئندہ فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گا۔

ہیں۔ بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ جی ہاں میں اردو میں چند سالوں سے لکھ رہا ہوں۔

یوسف علی صاحب۔ موجودہ تصنیف کب مکمل ہو گی؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اگلے سال انشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچکر۔

یوسف علی صاحب:۔ آئندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جائیے گا؟

ڈاکٹر صاحب۔ جی ہاں ارادہ تو یہی ہے، اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے کہ اطالوی کمپنی لائڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا، یہ جہاز جدہ میں تو نہیں ٹھہرتے لیکن جدہ کے سامنے اطالوی سمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں، وہاں سے وہ میرے لیے ایک خاص اگن بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، جو مجھے جدہ پہنچا دے گی، اس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی، اس کے متعلق خط وکتابت جاری ہے۔

یوسف علی صاحب:۔ بے شک اطالوی حکومت کو اسلامی دنیا میں آپ کی اہمیت کا پورا علم ہوگا۔ اور وہ ہر طرح سے اس کو سہولت پہنچانے کی کوشش کرے گی۔

ڈاکٹر صاحب۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں، صحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کر سکوں گا،

چند منٹ اور گفتگو ہوئی، اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے، اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفر حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا،

انھیں حج کی اس قدر لو لگی تھی، کہ غالباً انتقال کے وقت انھیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا اس وقت میرے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آسکتا تھا، کہ چار مہینہ میں کے قلیل عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدت مندوں کو داغِ مفارقت دے جائیں گے اس وقت ان کے چہرہ سے صحت ٹپک رہی تھی، خط تھوڑی دیر پہلے بنوا کر بیٹھے تھے، مونچھوں کو قدرے تاؤ بھی دے رکھا تھا، چہرہ کی شان جرمن جرنیلوں کی سی تھی۔ طبیعت بہت بشاش تھی، صرف دو تکالیف تھیں، ایک آواز جو کسی طرح کھلتی نہ تھی۔ اور دوسرے موتیا بند جو کچھ عرصہ سے اتر آیا تھا، آواز کے نہ کھلنے کا انھوں نے کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ اور موتیا بند کا وہ مارچ ۳۸ء میں آپریشن کرانا چاہتے تھے ان کی شکل و ہیئت سے کوئی آثار ایسے ظاہر نہ تھے، جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا کہ خودی کا یہ دانائے راز سفرِ آخرت کے لیے تیار بیٹھا ہے ——

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (1938ء)

مہاراجہ کشن پرشاد شاد

خطبۂ صدارت

اردو شاعری کے اس "جشن جھوم" میں آج کا دن حقیقت میں ایک یادگار دن ہے۔ کیونکہ آج ہم سر اقبال جیسے مشہور اور مقبول شاعر کی خصوصیات کی داد و تحسین کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

مجھے اس کی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسہ کے دوسرے اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا کیا۔ میرے سر اقبال سے ذاتی تعلقات بھی ہیں یہی تعلقات مجھے اپنی کم نظری کے باوجود اس کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔

حضرات! دنیا کا رخ بدل چکا ہے، جو طرز شعر اب سے چند سال قبل مطبوع و مقبول تھا۔ اب اس کی مانگ بہت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب شعر مجلس کی گرمی اور دلوں کی تازگی کے لیے نہیں کہے جاتے۔ بلکہ قومی، مذہبی اور ملکی تعمیر کا بار گراں بھی ان کے دوش پر رکھ دیا گیا ہے۔ اسے اقبال ہی کی زبان سے سنیئے۔

محفل دانش گری برہم زدم
زخمہ بر تار رگ عالم زدم
بسکہ عود فطرتم نادر نواست
ہم نشیں از نغمہ ام نا آشناست

باوجود اس کے ہندوستان کی فضا میں ابھی ایسے شعرا موجود ہیں شعر کو ترک کرنا مشرب سخن سنجی کا گناہ عظیم سمجھتے ہیں مگر۔۔۔۔۔

یہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

ہندوستان کی جدید نسلیں، مختلف اقوام و ملل کے نادر نگاہ سے باخبر ہو چکی ہیں اور ایک تیز رو دھارے کی طرح یہ حقیقت عام ہوتی جا رہی ہے کہ ہماری عہد گزشتہ کی شاعری آرٹ کی حیثیت میں خواہ کتنی ہی کامیاب سہی لیکن اس نے ہماری ہیئت اجتماعی پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ غرض زمانہ ہر پرانی چیز کو ترک کرنے اور نئی کو سراہنے کی سنت ادا کر رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس نقطۂ نظر کے متعلق آئندہ نسلیں کیا رائے قائم کریں گی۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ فن شعر کی اس کایا پلٹ نے ہندی شاعر کے سینے میں بھی تحقیق و تلاش کی روح دوڑا دی اور اب قدیم "چابکدست" معماروں کے بنائے ہوئے اجزا سے اپنے کلام کو درست کرنے کی بجائے اس نے خود اپنی ایک عمارت تعمیر کرنے پر توجہ کی، اس سے ایک طرف جدید نسلوں کی توجہ تحصیل علم کی جانب بڑھنے لگی اور دوسری طرف ان کے افکار شعری صرف "جمالیاتی اور حزنی" کیفیات تک محدود نہیں رہے بلکہ ان میں بصیرت و بصارت کے اسرار جھلکنے لگے۔ ہندوستان میں اردو اور فارسی میں اس طرز شعر کا علمبردار یقیناً اقبال ہے جس نے مشرقی انداز بیان کو قائم رکھ کر شاعری ہی میں حکمت و بیداری کے دریا بہا دیئے اور جدید نسلوں کو اپنے بلند آہنگ نغموں کے ذریعے جینے اور اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کا راز سمجھایا۔

"خودی" اقبال کے کلام کا سرنامۂ امتیاز ہے اور یہی ایک لفظ اس تمام دعوت سعی و عمل کا آئینہ دار ہے۔ خودی احساس نفس بلکہ عظمتِ نفس کا ایک راز ہے جسے اقبال کی باریک بیں نظروں نے پہچانا اور مشرق کی موجودہ پستی نے اس کے حساس دل کو سمجھایا کہ جب تک اس کو نصب العین نہ بنایا جائے گا۔ یہ حضیضِ تنزل میں آئی ہوئی اقوامِ مشرق کائنات میں اپنی بقائے حیات کے لیے جگہ نہ حاصل کر سکیں گی۔

حقیقت میں اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے وہ اس کا جائز حق ہے اور اس کا پیام فرزندان مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے آئندہ نسلیں اس کا فیصلہ کریں گی ہندوستان کی ادبی ناہمواری کی اصلاح اور قومی ترقی میں اس زندہ جاوید شاعر کا کس قدر حصہ تھا۔ اعلیٰ تخیلات کے کسی شاعر کی نسبت جیسے اقبال ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی مذہب اور ذات کے قیود کا وہ تابع ہو سکتا ہے اقبال کی ذات بحیثیت شاعر لطیفیات عالم کے ہر حسن پر حاوی

ہے۔ اقبال بہ حیثیت فرزند ہند اپنی وطنیت پر نازاں ہیں اقبال کو مسلم ہونے پر بجا فخر ہے تو کے ہندوستان سے وابستہ جذبات وطنی اور قومی بھی ایسے ہی اعلیٰ تخیلات سے مملو ہیں جو اقبال جیسے بلند پایہ شاعر کے شایان شان ہیں۔ کوئی اقبال کا مسلم ترانہ دیکھ کر ان کو مسلمانوں کا شاعر خیال کرے تو اس سے بڑھ کر گناہ نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے مسلمانوں کی خوبیوں کو کماحقہ واضح کر دکھایا کہ مسلمانوں کو بیدار کیا جائے۔ ہندوؤں کی حقیقتوں کو موثر پیرایہ میں پیش کیا کہ ہندو حقیقت آگاہ ہو جائیں جہاں اقبال نے اس ملک کو بیدار کرنے میں اس طرح بلند حصہ لیا ہے، ہندو مسلمانوں میں اتحاد قومی کی روح بھی پھونکی ہے۔ جس کی ترجمانی اقبال کی بے شمار نظمیں کرتی ہیں۔ جن کا یہاں حوالہ خالی از طوالت نہیں۔

ظلم ہوتا اگر مشرق ایسے باکمال شاعر کو اس کی زندگی میں کم سے کم خراج تحسین بھی ادا نہ کرتا اور مجھ کو دلی مسرت ہے کہ ہمارے اہل ملک دوسرے اقطاع ہندوستان سے پیچھے نہیں رہے اور کیونکر پیچھے رہتے جبکہ اہل علم وفن کی قدر افزائی ان کا روایتی شیوہ رہا ہے اور انہوں نے اقبال کا وہ "قرض" جو علمی اور ادبی حیثیت میں ان پر تھا کسی حد تک ادا کر ہی دیا۔ میری دعا ہے کہ خدا سر اقبال کو بہت دن تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان ان کے نغمۂ بیداری سے زندگی اور کامیابی کا درس حاصل کرتا رہے۔

میں اب ان سطور کو ختم کرتا ہوا آپ حضرات کا شکر گزار ہوں اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اقبال کے کلام کا کچھ انتخاب نہ پیش کر سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس جلسہ میں اس فرض کو دوسرے اصحاب ادا کرکے رہیں گے اور ہم سب کو تھوڑی دیر کے لیے اقبال کے "اسرار خودی" "بے خودی کی لذتوں سے آشنا کرکے رہیں گے آخر میں اعلیحضرت آقائے ولی نعمت سلطان العلوم کی عمر و اقبال کی دعا کرتا ہوں جن کی علمی وفنی سرپرستی اظہر من الشمس ہے اور جن کی فارسی و اردو شاعری کا وہ مرتبہ ہے جس کا اعتراف حافظ و سعدی اور میر و امیر کی روحیں کر رہی ہیں اور جن کا واحد ذوق فارسی زبان کی نشاۃ ثانی کا ضامن ہے اور یہ اسی متوارث ذوق علمی

کا اثر تھا کہ حضرت والا شان ہز ہائنس پرنس آف برار نے اس خاص علمی جلسہ کے اجلاس اول کی صدارت سے ہم سب کو سرفراز فرمایا اور نہ صرف ہمیں بلکہ خود اقبال کو بھی اپنی رونق افروزی سے مفتخر و معزز فرمایا۔ خداوند حقیقی ان سب کی عمر و اقبال میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔۔۔

محمد جلال الدین اشک

اقبال کی نسبت میرے ذاتی تاثرات

مدت سے میری خواہش تھی کہ اقبال کی نسبت اپنے ذاتی تجربات کو تفصیل کیساتھ قلمبند کر دوں مگر میری فطری کاہلی اس خواہش کی تکمیل میں مانع ہوتی رہی۔ مجھے اس کا افسوس ہے بہت سخت افسوس ہے۔ اب وہ شاعر اعظم وہ عظیم المرتبت انسان اس عالم فانی سے کوچ کر گیا ہے اور وقت گزر جانے کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرنے بیٹھا ہوں۔ کاش! میں یہ کام اس کی زندگی ہی میں انجام دے دیتا۔ آہ! اگر میں ایسا کر سکتا تو اس مضمون کی ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ لکھتے وقت کتنی مسرت اور کتنا لطف محسوس کرتا۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب پچھتانے سے کیا فائدہ ہے۔ آج میں اپنی کاہلی اور اپنے اوپر نفرین کرتے ہوئے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی کوشش کرتا ہوں۔ اقبال کی شاعری سے میں پہلی مرتبہ کس طرح روشناس ہوا اور اس کا مجھ پہ کیا اثر پڑا یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے اس لیے کسی قدر تفصیل سے اس کو سپرد قلم کرتا ہوں۔

بچپن کا ذکر ہے جس کو شاید ایک قرن سے کچھ زیادہ ہی عرصہ گزرا ہے کہ میں دادا جان کی کتابوں کی الماری کھول کر پرانی کتابوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اتفاقاً رسالہ مخزن کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ نمبر میرے ہاتھ لگا اور میں بڑے اشتیاق سے اس کی اوراق گردانی کرنے لگا۔ اس نمبر میں اقبال کی ایک نظم کوہ ہمالہ موجود تھی۔ میں نے اس نظم کو شروع سے آخر تک دیکھا۔ اگر میں اپنے ان تاثرات کو جو اس نظم کو پڑھنے سے میرے دل و دماغ پر مرتب ہوئے ضبط تحریر میں لاؤں تو معلوم نہیں کتنے صفحے سیاہ ہو جائیں۔ مختصر یہ کہ

اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے ایک نئی دنیا تمام رنگا رنگیوں اور اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ موجود ہو گئی ہے جس کو میں نے پہلے کبھی بھی دیکھا ہی نہیں تھا اور جس کے دیکھنے کی مجھے کوئی توقع ہی نہیں تھی۔ مجھے شعرا اور ان کے کلام سے آغاز طفولیت سے ہی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس زمانے میں بھی کسی نہ کسی حد تک میر اور سودا، انشا اور مصحفی، غالب اور ذوق، انیس اور دبیر، داغ اور امیر کے کلام سے واقف ہو چکا تھا لیکن اقبال میرے لیے بالکل نیا شاعر تھا، اور اس کی شاعری میرے لیے ایک ایسی چیز تھی جس کی مثال مجھے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ کوہ ہمالہ والی نظم میں اقبال نے فطرت کے حسن کی نقاشی کی ہے۔ میں چونکہ اس حسن کا بچپن ہی سے نہ صرف قدر دان بلکہ پرستار ہوں۔ یہ نقاشی مجھے بڑی دلچسپ اور دلکش نظر آئی۔ میں جب اس شعر پر پہنچا۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تو میری عجیب حالت ہو گئی۔ میرا تخیل پرواز کرنے لگا اور آن کی آن میں میں نے اپنے کو کوہ ہمالہ کے دامن میں پایا تخیل کی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ کوہ ہمالہ میرے سامنے برف کی "دستارِ فضیلت" باندھے کھڑا ہے جس پر "مہرِ عالم تاب" کی ہزارہا کرنیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ آہ! بچپن کا تخیل بھی کتنا طاقتور اور کتنا پُر لطف ہوتا ہے۔

میں نے اس نظم کو کئی مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کتنا لطف اٹھایا۔ اس دن سے آج تک اگرچہ اس کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ میں اس نظم کو کم از کم مہینہ میں ایک مرتبہ بلکہ بعض اوقات ہفتہ میں دو چار مرتبہ پڑھ لیتا ہوں اور ہر دفعہ اپنے اندر ایک طوفانِ مسرت محسوس کرتا ہوں۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کے باعث میں اقبال کی شاعری سے پہلی مرتبہ روشناس ہوا۔ اس وقت سے اب تک مجھے اقبال اور اس کی شاعری سے بڑا شغف رہا ہے۔ اس کے بعد کا ذکر ہے کہ میں اپنے والد اور خاندان کے ساتھ ایک ضلع میں رہا کرتا تھا۔ ہمارا مکان بستی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے قریب چند مزدور اور باغبان رہا کرتے تھے

مگر کسی ایسے شخص کا مکان نہیں تھا جس سے یا جس کے خاندان سے میں اپنی مجلسی حیثیت کے لحاظ سے ربط پیدا کر سکتا۔ اس زمانہ میں میرے بڑے بھائی علیگڑھ میں زیر تعلیم تھے اور والد بالعموم دورے پر رہا کرتے تھے۔ میں مجبور تھا کہ بڑی حد تک اپنی زندگی کو تنہائی میں گزاروں اور اپنی مرضی کے مطابق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہوں۔ والد نے میری صحت کی خرابی کے باعث مجھے کسی مدرسہ میں شریک نہیں کرایا تھا اس لئے میں آزادی سے اپنی پسند کے موافق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور جب اس کام سے طبیعت اکتا جاتی تھی تو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لیے بڑا نازک اور طوفانی تھا کیونکہ میں آغازِ شباب کی خطرناک منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ آغازِ شباب کا زمانہ انسان کی زندگی میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان طفلانہ کھیلوں اور اپنے کم عمر دوستوں سے کچھ بیزار سا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ بڑے لوگوں کی مجلسوں اور کھیلوں میں آزادی کے ساتھ شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ فطرتاً اس زمانے میں انسان کو تنہائی کا تلخ احساس ہوتا ہے اور دنیا کی بندشوں کے خلاف اس کے دل میں بغاوت کے جذبات بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں جبکہ یوں بھی ایک انسان کے دل میں تنہائی کا احساس پیدا ہوتا ہے میرے دلی جذبات کی کیا کیفیت ہو گی۔ میں حقیقی معنوں میں بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ ایک طرف تو میرے چھوٹے بھائی بہن مجھ سے بہت زیادہ کم عمر تھے اس لیے میں ان کے ساتھ رات دن کھیل میں مصروف رہ کر اپنے وقار کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور دوسری طرف جن لوگوں سے مثلاً ملازمین وغیرہ سے مجھے سابقہ پڑتا تھا۔ میں ان کے ساتھ بھی بلا تکلف اور بغیر اذیت محسوس کئے ہوئے اپنا زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ یہ زمانہ میری زندگی کا بڑا نازک دور تھا جس میں قوسِ قزح کی رنگینیاں بھی تھیں اور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی۔ اس زمانے میں میرے دل کی دنیا پر کبھی آفتابِ عالم تاب کی ہزارہا کرنیں جگمگاتی تھیں اور کبھی سیاہ بادلوں کی وحشت ناک تاریکی بھی چھا جاتی تھی۔ میں اس زمانے میں ذہنی اعتبار سے بھی اور مادی اعتبار سے بھی سخت ہولناک تنہائی کی مصیبتیں برداشت کیا کرتا

تھا۔ اگرچہ اس زمانہ کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنا دل بہلانے کے لیے کیسی کیسی دلچسپ ترکیبیں نکالا کرتا تھا۔ کبھی تو بلند درختوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا اور نیلگوں آسمان کی طرف گھنٹوں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی ندی کے کنارے جا کر چھوٹے چھوٹے ریت کے ذروں کو جمع کرتا تھا اور پانی کی لہروں کو گن گن کر وقت کاٹا کرتا تھا۔ کبھی اشعار گنگناتا بھی اور کبھی یہ تصور کر کے کہ میرے سامنے ہزار ہا لوگ بیٹھے ہوئے ہیں حسن فطرت پر برجستہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ تمام ترکیبیں بھی میرا دل بہلانے کے لیے کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوتی تھیں۔ میں بالآخر سخت مایوسی اور کوفت کی حالت میں اپنے پلنگ پر جا لیٹتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے سے سوال کرتا تھا کہ آخر اللہ میاں نے مجھکو کیوں پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب مجھے کیا ملتا۔ میں اس زمانہ سے آج تک یہی سوال کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب نہیں ملا ہے اور نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے خیر اس زمانے کا ذکر ہے کہ میں اردو نظم و نثر کی کتابیں بڑی کثرت سے اور بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اقبال کے کلام سے واقفیت کے متذکرہ صدر واقعہ کے بعد سے مجھے اس کے کلام سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں کتب فروشوں کی فہرستوں کو بالاستیعاب دیکھا کرتا تھا اور جہاں کہیں اقبال کی کسی نظم کے شائع ہونے کی کیفیت معلوم ہوتی تو فوراً بذریعہ وی پی اس نظم کو منگوا لیتا تھا۔ اس زمانہ میں بانگ درا شائع نہیں ہوئی تھی — اقبال کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اس ایجنسی سے شکوہ جواب شکوہ، تصویر درد اور شمع و شاعر منگوائیں اور روزانہ ان کا مطالعہ وظیفے کے طور پر کیا کرتا تھا۔ شروع ہی سے مجھے اس کا کامل احساس ہو گیا تھا کہ اقبال کی شاعری میری روح کی آواز ہے۔ جب کبھی اقبال کی کوئی تازہ نظم وصول ہوتی تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ میں کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اس کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس وقت مجھے نہ تو نیلگوں آسمان کو دیکھنے کا خیال آتا اور نہ ندی کے کنارے جا کر ریت کے ذروں کو جمع کرنے کا۔ جب تک اقبال کی نظم میرے ہاتھ میں رہتی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا اور اپنے "تلخ ترین" احساس کو

مٹانے کے لیے ان اشعار کو اکثر پڑھا کرتا تھا۔ خاص کر شمع و شاعر کے یہ دو اشعار سے

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم — نے نصیبِ محفلے نے قسمت کاشانۂ

مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم — در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ

میری زبان پر ہمیشہ جاری رہتے تھے۔ میں شام کے وقت وسیع میدانوں میں تنہا جادہ پیمائی کرتے ہوئے ان اشعار کو بڑے سوز و گداز سے پڑھا کرتا تھا اور مجھے ان سے ناقابل بیان تسکین حاصل ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ایسے لمحوں میں جب مجھے اپنی تنہائی کا احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا تو مذکورہ بالا دو اشعار خود بخود میری زبان پر جاری ہو جاتے تھے اور میں اپنے دل سے کہتا تھا کہ دنیا میں ایک تو ہی ایسا نہیں ہے جو تنہائی کی جانفرسا تکالیف برداشت کر رہا ہے۔ خود ڈاکٹر اقبال کو بھی اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہی مجھے بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی اور میں اپنے اندر ایک حیات تازہ محسوس کرتا تھا جو زندگی اور اس کے سارے مصائب کو بہ آسانی برداشت کر سکتی ہے۔ یہ زمانہ بدل گیا۔ میری زندگی کا یہ نازک دور گزر گیا۔ آغاز شباب کا عجیب و غریب اور رنگین عہد اپنی تمام طفلانہ دلچسپیوں کے ساتھ اختتام کو پہنچ گیا اور میں اب شباب کی مست و مخمور اور دلکش سرحد میں داخل ہوا۔ حالات بھی بدل گئے۔ مجھے حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ ایک لطیفہ غیبی کی بدولت میں میٹرک میں کامیاب ہو گیا۔ اور مجھے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں میرے لیے دوستوں کی کچھ کمی نہیں تھی۔ پورے کالج میں مجھے ہر طرف اپنے دوست ہی دوست نظر آتے تھے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ تقدیر نے جس نعمت سے یعنی دوستوں سے مجھے آغاز شباب میں محروم رکھا تھا۔ اب اسی کو حاصل کروں اور اس طرح حاصل کروں کہ آج تک کسی نے اس طرح حاصل نہ کیا ہو گا۔ میں نے اپنے دوستوں کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ مجھے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ چند ماہ کے اندر میرے دوستوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انٹرمیڈیٹ سال اول سے لے کر ایم اے سال آخری تک ہر جماعت میں مجھے ~~اپنے~~ دوست

مل گئے۔ اب میں تنہائی سے سخت بیزار ہو گیا تھا اور ممکنہ حد تک اپنے کو اس خطرہ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس زمانہ میں تنہا بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ نہ کرتا تھا۔ بلکہ جہاں تک بھی ممکن ہوتا دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ امتحان کی تیاری بھی پانچ چھ دوستوں کے ساتھ کرتا تھا یہ زمانہ میرے لیے اگرچہ بڑا دلچسپ اور پر لطف رہا۔ لیکن کبھی کبھی رات میں سوتے وقت یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنی پہلی سطح پر نہیں رہا ہوں بلکہ کچھ نیچے اتر آیا ہوں اور اگر یہی لیل و نہار رہیں تو غالباً بہت کچھ نیچے اترنا پڑے گا۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ کیا مجھے اس کا حق حاصل نہیں تھا کہ میں جو اتنے عرصہ تک تنہائی کے جانفرسا مصائب برداشت کر چکا ہوں کچھ دنوں تک دوستوں کی دوستی کا لطف اٹھاؤں اور زندگی کو ہنس بول کر گزار دوں۔ میں اس خیال کے تحت اپنی موجودہ زندگی میں تبدیلی کرنے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔ وقت سے پہلے کالج جاتا تھا۔ جہاں میرے دوست میرے منتظر رہتے تھے اور کالج ختم ہونے کے بہت دیر بعد تک دوستوں سے باتیں کرتے چمن میں گلگشت کرتا رہتا تھا۔ تعطیلات میں بھی میں اپنا وقت دوستوں کے ساتھ کسی نہ کسی ریستوران میں گزارتا تھا یا کبھی گنڈی پیٹھ یا ہفت گنبدوں کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ اس طرح دو تین سال گزر گئے۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ تنہائی اگرچہ سخت تکلیف دہ اور اذیت رساں ہے مگر وہ حقیقت ہے اور دوستوں کا لطف ملاقات کو کتنا ہی فرحت بخش اور دلکش ہو مگر ایک سراب ہے۔ انسان تنہا پیدا ہوتا ہے اور تنہا ہی مرتا ہے دوست عمر کی چند منزلوں تک ساتھ دے سکتے ہیں مگر ہمیشہ تو ساتھ نہیں دے سکتے۔

جس زمانہ میں میرے دل میں یہ احساس رفتہ رفتہ پیدا ہو رہا تھا اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک دوست نے برسبیل تذکرہ اقبال کی پیام مشرق شائع ہونے کا ذکر کیا۔ عزیز دوست کی زبانی سن کر میں بیتاب ہو گیا اور اسی وقت کتب فروش کی دوکان پر دوڑا دوڑا گیا۔ حسن اتفاق سے مجھے یہ کتاب وہاں مل گئی۔ میں نے اسے خرید لیا اور گھر جا کر رات کے وقت اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ دیر تک محویت کے عالم میں اس کو پڑھتے رہا۔ آدھی رات کے وقت اچانک میری نظر "تنہائی" والی مشہور و معروف نظم پر پڑی۔ میں اس عجیب د

غریب نظم کو صبح کے چار بجے تک پڑھتا رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی اور میرے جذبات کی طوفان خیزی کس درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ خاص کر اس بند کو پڑھتے وقت سے

شدم بحضرتِ یزداں گزشتم از مہ و مہر
کہ در جہان تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاک من ہمہ دل
چمن خوش ست و لے درخورِ نوایم نیست
تبسّمے بہ لب او رسید و ہیچ نگفت

میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

مسلسل تین روز تک میں کالج نہیں گیا اور مسلسل تین روز تک صبح کے سات بجے سے رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میں پیام مشرق پڑھتا رہتا تھا۔ پیام مشرق میں مجھے وہ سب کچھ مل گیا۔ جس کے لیے میری روح اتنے عرصے سے بے قرار تھی۔ تخیل، ترنم، فلسفہ، تصوف، حسن، عشق، فطرت، میں نے اس چھوٹی سی کتاب میں کیا نہیں دیکھا، اگر میں ان تمام احساسات، جذبات اور تصورات کو یہاں پیش کر دوں جو اس کتاب کو پڑھتے وقت میرے قلب و دماغ میں پیدا ہوئے تھے تو یہ داستان بہت طولانی ہو جائے گی۔ اس لئے چند دلچسپ اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ غزل کا شعر ہے۔

حلقہ بستند سرِ تربت من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں

غور کیجئے کہ اقبال نے تصور کے لیے اس شعر میں کیسی عجیب دنیا فراہم کی ہے جو بہ یک وقت دلکش بھی ہے۔ اور غم انگیز بھی۔ دلکش اور غم انگیزی کا اس شعر میں جو سنگم نظر آتا ہے وہ میرے لیے معجزہ سے کم نہیں ہے۔ اس شعر کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔ اس کا ذکر کر کے میں شعر کے لطف کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ یہ باتیں محسوس کرنے کی ہیں بیان کرنے کی نہیں ہیں۔ البتہ اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس شعر کی بدولت میں ہفتوں تک تخیل کی ایک

ایسی دنیا میں پرواز کرتا رہا۔ جہاں ہر طرف خونِ شفق کی رنگینیاں نظر آتی تھیں اور جہاں ہر وقت آبشاروں کی مدھم اور اداس موسیقی سامعہ نوازی کرتی تھی۔ ایک اور غزل کا شعر ہے۔

از ما بگو سلامے آں یارِ تند خو را
کآتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

اس معشوق کی شان ملاحظہ کیجیے۔ وہ معشوق ہی کیا جو یک شہر آرزو کو ایک نگاہ گرم سے نذرِ آتش نہ کر سکے۔ اقبال کے پاس معشوق کا تخیل حد درجہ بلند اور پاکیزہ ہے۔ یہاں وہ حسن کا انتہائی کمال انتہائی دلاویزی، اور انتہائی پاکیزگی دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے انسان کو مہد سے لے کر لحد تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اس کا معشوق اور شاعروں کے معشوق کی طرح نہیں ہے کہ جس سے دس پانچ سال ہی میں طبیعت اکتا جاتی ہے اور ابوالہوسی "کوئی اور" کے نعرے لگانے لگتی ہے۔ اسی تخیل کو اقبال کی ایک اردو غزل کے حسب ذیل دو اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کیسی
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

ایک اور غزل کا شعر جو کسی صوفی کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے۔

من جواں ساقیؑ و تو پیر کہن میکدۂ
بزمِ ما تشنہ و صہبا ز تو واری درِ زمن

اس شعر کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو زندگی اور اس کے راز کو سمجھنے کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ وہ کبھی فلسفیوں کے خشک مقالوں پر وقت ضائع کرتے ہیں اور کبھی صوفیوں کے آستانوں پر جبہ سائی فرماتے ہیں۔ لیکن دل کا سکون اور اطمینان انھیں کہیں سے بھی نہیں ملتا مجھے تو اس شعر میں ہزارہا بے قرار دلوں کی دھڑکن صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ بزم تشنہ ہے اور تشنہ ہی رہے گی۔ آہ! اس کی پیاس کون بجھا سکتا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم "نوائے وقت" کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

چنگیزی و تیموری مشتے زغبارِ من | ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ اُو از نقش و نگارِ من | خونِ جگر مرداں سامانِ بہارِ من

من آتشِ سوزانم من روضۂ رضوانم

میں عرض نہیں کر سکتا کہ اس بند کو پہلی مرتبہ پڑھتے وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اچانک ایک ویرانے میں مجھے دنیا کے سب سے زیادہ قیمتی جواہرات مل گئے ہیں۔ میں حیرت سے چاروں طرف دیکھتا تھا اور اس بند کو پڑھتا تھا اور پھر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے وقت کی یہ آواز فضاؤں میں ہر طرف گونجتی سنائی دیتی تھی۔ اُف! اس بند میں کتنا ترنم، کتنا تخیل اور کتنی حقیقت ہے۔

"آدم از بہشت بیروں آمدہ گوید" والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہِ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن
بگداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسی بہ حریم ناز کردن

اس نظم میں اقبال نے تخیل کے لیے ایک عجیب بستی بسائی ہے۔ آدم بہشت سے نکالا گیا ہے۔ انوارِ قدیم کی یاد اس کے دل کو تڑپا رہی ہے۔ بہشت کی جدائی نے غم کے اتھاہ سمندر میں اس کے وجودِ عزیز کو غرق کر دیا ہے۔ ندامت اور غم کے جانگسل جذبات اس کے دل کی کشتی کو جھکولے دے رہے ہیں۔ وہ ایک ویرانے میں تنہا بالکل تنہا بیٹھ جاتا ہے اور اپنے جذبات کو آنسوؤں کے ذریعہ بہا دینا چاہتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کچھ کہتا ہے۔ اس کے الفاظ نغمہ بن کر زبان سے نکلتے ہیں جس کو سن کر کوہ و دشت و صحرا کے دل کانپنے لگ جاتے ہیں۔ غور کیجیے کہ یہاں اس ابن آدم نے آدم کے جذبات کی

کیسی صحیح ترجمانی کی ہے اور آدم کے دوسرے فرزندوں کے لیے تخیل کی کیسی دلکش دنیا آباد کی ہے۔

اس قسم کی صدہا مثالیں پیام مشرق سے نکال کر پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں ان کو بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کی پیام مشرق دیکھنے کے بعد مجھ پر اس کے شاعرانہ کمال اور بلند تخیل کا کتنا زبردست اثر پڑا ہے۔ یہ ایک واقعہ اور حقیقت ہے کہ اس کی شاعری میرے قلب و دماغ پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے۔ جو شعر اس عظیم المرتبت شاعر کے قلم سے نکلتا ہے مجھے اپنی روح کی صدائے بازگشت نظر آتا ہے۔ میں اس کلام کا مطالعہ محض شاعری کا لطف اٹھانے کی خاطر نہیں کرتا ہوں بلکہ جس طرح کوئی عقیدت مند مرید اپنے مرشد کے ملفوظات کو کمال عقیدت کے ساتھ پڑھتا ہے اسی طرح میں اقبال کے ایک ایک شعر کو پڑھتا ہوں اور وقت یوں قدرتی طور پر دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقبال نے اس حد تک اور اس شدت کے ساتھ مجھے کیوں متاثر کیا ہے۔ یہ ایک نازک سوال ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں الجھ کر میں بڑی مشکلوں سے اس سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں۔ تاہم کوشش کرتا ہوں کہ اس کی نسبت سرسری طور پر چند خاص خاص وجوہ کا یہاں اظہار کر دوں۔

میرا خیال ہے کہ اقبال کی جس خصوصیت نے مجھے حد سے زیادہ اس کا گرویدہ بنا دیا ہے وہ اس کا لہجہ (TONE) ہے۔ اس کی شاعری کا لہجہ اتنا بلند اور اثر انداز ہے کہ مجھے اردو اور فارسی شاعری میں اس کی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ لہجہ کی تعریف کرنی اتنی ہی مشکل ہے جتنی خود شاعری کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ لہجہ شخصیت کا ایک آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں شاعری کے صحیح خدوخال پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اقبال اپنے لہجے کے لحاظ سے تمام اردو فارسی شاعروں میں بہت ممتاز ہے۔ وہ کسی موضوع پر بھی اظہار خیال کرے اپنے مخصوص لہجے ہی میں کرتا ہے جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اقبال بول رہا ہے۔ کوہ ہمالہ جیسی ابتدائی نظموں سے لے کر ضرب کلیم اور بال جبریل

کی آخری نظموں تک اقبال کا لہجہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ میں اس امر کو شاید تسلیم کروں کہ اقبال نے بعض بعض نظموں میں دوسروں کے خیالات سے اکتسابِ فیض کیا ہے اور کہیں کہیں توارد خیال بھی نظر آجاتا ہے لیکن کسی طرح یہ نہیں مان سکتا کہ اقبال کا لہجہ کسی حد تک بھی کسی دوسرے شاعر کا رہینِ منت ہے۔ اقبال اپنے لہجے میں شروع سے آخر تک اقبال ہے اور یہاں کسی دوسرے شاعر کی پرچھائیں تک نہیں پہنچی ہیں۔ اقبال کا لہجہ کیا ہے؛ وہ شاعری کا ایک معجزہ ہے وہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جو دلوں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے عظیم المرتبت انسان کی صدا ہے جو قوموں کے باطن میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ آسمانی آواز ہے۔ ربانی نغمہ ہے۔

دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے اس کی شاعری نے میری روح پر پوری طرح قبضہ جمایا ہے اس کے تخیل کی بلندی اور رفعت اور اس کا انقلاب آفریں ترنم ہے۔ اقبال کے پورے کلام میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آسکتی جس میں کسی قسم کا ابتذال یا عامیانہ پن کا ذرا سا بھی رنگ جھلکتا ہو۔ اس کی بلند فطرت کسی متبذل، ناپاک اور محدود چیز کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس نے حسن وعشق کے میدانوں میں بھی جولانی دکھائی ہے مگر کہیں بھی ہم اسے کسی "بیسوا" کی زلفِ گرہ گیر میں پھنسا ہوا نہیں دیکھتے۔ وہ حسن کو ایک انسان ایک شاعر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اسی طرح اس کی بلند فطرت وطنیت کے محدود تخیل سے بھی برگشتہ رہی ہے۔ جس طرح اس نے حسن کو ایک بوالہوس نواب کی آنکھ سے نہیں دیکھا بالکل اسی طرح وہ وطن کو بھی ایک سود خوار سرمایہ دار بن کر کبھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھ کروڑوں انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کو دیکھنے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ اسے بوالہوس نوابوں یا سود خوار سرمایہ داروں سے مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہی راز اقبال کے انقلاب آفریں ترنم کا ہے۔ اس کا ترنم بربط، ارغنوں یا ساز کا ترنم نہیں ہے بلکہ یہ وہ ترنم ہے جو فضائے بسیط میں ستاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے جس سے کائنات میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہر ذرہ ایک کیفِ سرمدی میں ڈوب جاتا ہے۔

اقبال کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو کچھ کم اہم نہیں ہے یہ ہے کہ وہ مجھے ہمارے عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وہی ناقابل برداشت مصائب، وہی شکوک و شبہات، وہی زندگی کے اہم اور پیچیدہ مسائل جن سے آج کل ہم دوچار ہیں اقبال بھی ان سے دوچار ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی اور حافظ، خیام اور امیر خسرو، نظیری اور عرفی، میر تقی اور میر درد، حکیم مومن خاں اور غالب، جامی اور اکبر کا کلام ہمیں بہت متاثر کرتا ہے اور ہم پر وجد آفریں اثرات پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہے لیکن ان سب شعرائ کے کلام کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ شعرائ ہمارے دور کے نہیں ہیں۔ ان کے زمانے میں زندگی کے مسائل اس سے بہت مختلف تھے جن سے آج کل ہم دوچار ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق نقطۂ نظر اگر بالکلیہ نہیں تو کسی نہ کسی حد تک ہمارے نقطۂ نظر سے ضرور مختلف تھا۔ تشکیک، ارتیابیت موجودہ دور مادیت کا ایک تلخ اثر ہے اس کو انہوں نے کبھی چکھا ہی نہیں تھا، ان کے دلوں میں شکوک اور شبہات کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مذہب اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کی نسبت انہوں نے جرح و قدح کرنی سیکھی ہی نہیں تھی۔ ان کے دلوں میں کبھی یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ تصوف، وجدان اور عشق پر کوئی بحث مباحثہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بطور مسلم حقائق کے تسلیم کرتے تھے اور ان پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے کلام میں ایمان اور ایقان کے بکثرت جلوے نظر آتے ہیں۔ البتہ صرف خیام کے کلام میں کہیں کہیں کچھ ارتیابیت اور تشکیک کی جاں سوز بجلیاں چمکتی ہیں مگر اس کی ارتیابیت ہمارے دور کی ارتیابیت سے بہت مختلف ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسے ارتیابیت قرار دینا بھی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں خیام کے کلام میں بھی بہت سارے خیالات ایسے موجود ہیں جو اس کے دور کے عام رنگ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ غرضیکہ متذکرہ صدر شعرائ ایک بالکل جداگانہ دور کے شعرائ تھے اور ہمارا دور کچھ اور ہی دور ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کا کلام گو بڑی حد تک لائق احترام ہے۔ لیکن ہماری روحوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتا ہے۔ ان کا کلام پڑھتے وقت اکثر اوقات ہمارا دل چیخ اٹھتا ہے۔ کہ انہوں نے زندگی اور اس کے تلخ حقائق کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا جس طرح آج کل

ہم محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اقبال کے ہاں یہ کمی نہیں ہے۔ وہ کامل اور مکمل طور پر ہمارے درد کا اور ہمارا شاعر ہے۔ اس نے ہر چیز کو اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے ہماری روحوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمارے بے پایاں درد و غم میں ہمارے ساتھ آنسو بہاتا ہے۔ وہ ہمارے شکوک و شبہات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کیونکہ اسے اس جہنمی آگ کے خوب تجربے ہیں۔ وہ ہمارے مصائب و آلام سے ہم سے زیادہ واقف ہے اور ہم کو ان سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں یقین کی حرارت اور ایمان کا نور ہے۔ وہ نا امید ہونا نہیں جانتا۔ نا امیدی اس کے نزدیک کفر سے کچھ کم نہیں۔ وہ حیات تازہ کا پیام بر اور نغمۂ عمل کا مطرب آتش نفس ہے۔ وہ ایک سپہ سالار کی طرح اپنی شاعری کا علم بلند کرتا ہے اور اپنے مخصوص لہجے میں جو دلوں کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ آواز بلند ارشاد کرتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم

اس آواز کو سنتے ہی ہماری روحیں تڑپ اٹھتی ہیں اور ہمارے دلوں میں عمل کا قیامت خیز طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں ہر طرف امید کی کرنیں جگمگاتی نظر آنے لگتی ہیں۔ اقبال کی بے مثال عظمت کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔

اقبال کی ایک اور خصوصیت جو اس کے شاعرانہ کمال پر دلالت کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری بلکہ مشرقی شاعری کو بے حد وسیع اور بے پایاں بنا دیا۔ اس سے پہلے شاعری سے مراد گل و بلبل کی حکایات، حسن و عشق کی داستانیں، مدح اور ہجو کے طومار، نعت اور منقبت کے کارنامے ہوتے تھے یا اس سے کچھ ترقی ہوئی تو قوم پر نوحہ خوانی۔ لیکن اقبال نے اس میدان کو بہت وسیع کیا۔ اس نے اپنے زورِ قلم اور بلندیٔ تخیل سے یہ محسوس کرایا کہ ہر وہ بات جو انسان کے قلب کو متاثر کرے شاعری کی قلمرو میں داخل ہے۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہو گا کہ اقبال نے ہماری شاعری کی آبجو کو دریائے ذخار اور اس کے محدود گلستاں کو لامحدود دشت پر بہار بنا دیا اور شاعری کی دنیا دل کی دنیا سے ہم آہنگ بنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

اب اس مضمون کو طول دینا مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ میرا ایقان ہے کہ اقبال

کی اور متعدد خصوصیات ایسی ہیں جن کا ذکر لازمی ہے لیکن میں یہاں صرف اپنے ذاتی تاثرات کو پیش کر رہا ہوں اقبال کی شاعری کی نسبت کوئی عالمانہ مقالہ سپرد قلم نہیں کر رہا ہوں۔ اس لیے ان کا ذکر کچھ ایسا ضروری نہیں ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اقبال کی شاعری نے مجھے جس حد تک اور جس قوت کے ساتھ متاثر کیا ہے۔ اس کا اظہار زبان قلم سے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اقبال اس عالم فانی میں پیدا نہ ہوا ہوتا اور اس نے اپنے غیر فانی نغموں سے دنیا کو متلاطم نہ کیا ہوتا تو میرے تخیل کی دنیا اس سے بہت مختلف ہوتی جو آج ہے۔ غالباً میں اس صورت میں کوئی اور ہی قسم کا آدمی ہوتا۔ ایک فاضل مورخ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ اگر کلیوپیٹرا کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ یہی کیفیت میرے دل کی دنیا کی بھی ہے اگر اقبال کی شاعری اس سے ذرا مختلف ہوتی جو آج ہے تو یقیناً میرے دل کی دنیا بھی کچھ اور ہی ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک اس قسم کا احساس مجھ جیسے اور ہزارہا لوگوں کا بھی ہوگا اور ہزارہا لوگ ایسے بھی موجود ہوں گے جو صاف الفاظ میں اس احساس کا اظہار نہ کر سکتے ہوں گے مگر در اصل اقبال کی شاعری نے ان کے اندر بھی وہی انقلاب پیدا کیا ہوگا جو میرے دل میں کیا ہے۔

اب میں اس مضمون کو اقبال کے حسب ذیل شعر پر ختم کرتا ہوں جو اس شہنشاہِ اقلیم معانی کے رہ گرائے عالم جاودانی ہونے کے بعد سے میری زبان پر خود بخود جاری ہو گیا ہے اور جس سے آجکل مجھے بے انتہا تسکین حاصل ہو رہی ہے۔

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس کا نہ فردا ہے نہ دوش

(۱۹38ء)

محمد عمر نور الٰہی

حُسنِ عقیدت

(حضرت علامہ اقبال مدظلہ کی ایک غیر معروف رباعی)

سال اور اس کے متعلقات کی تفریح جانے دیجیے اور انجمن حمایت اسلام کے اس سالانہ جلسہ کا تصور کیجیے۔ جس میں ڈاکٹر حافظ نذیر احمد، مولانا حالی، میرزا ارشد مولوی عبدالمجید دہلوی آخری بار اس قومی دربار میں جمع ہوئے۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا مجمع حکیمانِ امت سے اپنے مرض کا علاج مانگ رہا تھا۔ چبوترہ پر عالم اسلام کا بہترین دل و دماغ جمع تھا۔ یہ وہ عہد تھا کہ میاں سر محمد شفیع مرحوم۔ شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین جو بعد میں افق اسلام پر آفتاب بن کر چمکے۔ ہنوز اپنے طلوع کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جن کی سحر بیانی اور جادو نگاری کی اقصائے عالم میں دھوم ہے۔ اس وقت دو بول بولنے میں چھوٹی موٹی ہوئے جاتے تھے۔ وہ حسن نظامی آج جن کی شرکت ہر مجلس سیاسیات و ادب کی زینت خیال کی جاتی ہے۔ ابھی اگرئی بابا اور کاپنچ کے گجروں کے چکر سے نہ نکلے تھے۔ یہ سب حضرات اس جلسہ میں موجود تھے۔ عصر کے قریب انجمن کا ایک اجلاس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کی صدارت میں شروع ہوا اور اس کے دوران میں پنجاب کے ایک شاعر نے اپنی نظم پڑھی۔ دستور یہ تھا کہ جب کوئی شاعر کوئی بولتا ہوا شعر پڑھتا تو اس کی داد انجمن کو عطیہ کی شکل میں دی جاتی۔ چنانچہ اس شاعر کے ایک شعر پر حضرت حالی مغفور نے دس روپیہ کا ایک نوٹ مرحمت فرمایا۔ صحن نعرۂ تحسین، تالیوں اور اسی قسم کے دیگر مظاہروں سے گونج اٹھا۔ اور شاعر کی پگڑی بآفتاب رسید کی مصداق ہو گئی۔ اس فخر بجا کے جوش میں شاعر نے پکار کر کہا کہ "صاحبان اب اس سے بڑھ کر داد کی معراجِ کمال کیا ہو گی کہ خود خدائے سخن نے میرے کلام کی داد دی عت۔"

شاعر بے چارے کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا مگر یاروں نے اسے دیگر شعراپر چوٹ آنا ظاہر کرنا شروع کیا۔ اور مجلس میں اس کا اچھا خاصہ چرچا ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بقولیکہ شمع مولانا حالی کے آگے آئی۔ مگر ضعفِ پیری کا آواز پر قبضہ ہوچکا تھا۔ اور اس کا دو قدم تک پہنچنا محال تھا۔ جو کان دن بھر سے اس آواز کی سماعت کے لیے بے قرار تھے۔ اس مایوسی سے کلبلا اُٹھے۔ ہر شخص سکوت چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے اس کی کوشش خود شوروغل کی موجب ہو جاتی تھی۔ آخر جلسہ میں کچھ ہم ہمی سی پیدا ہوگئی۔ تو شیخ عبدالقادر صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ حضرات ان کلماتِ قدسیہ کو "تبرکا" جس قدر سن سکتے ہیں۔ سن لیں۔ اور بعد میں شیخ محمد اقبال صاحب اسی نظم کو پڑھ کر سنائیں گے۔ حالی کی نظم اور اقبال سنائے۔ سونا پر سہاگہ! لوگوں پر ان کلمات نے جادو کر دیا۔ اور بت بن کر بیٹھ گئے۔ جب حالی صاحب نے نظم ختم کی۔ تو شیخ صاحب گیلری سے اتر کر سٹیج پر تشریف لائے۔ اور حالی کی نظم پڑھنے سے پیشتر یہ رباعی ارشاد فرمائی۔ سبحان اللہ چار مصرعوں میں قصیدہ بند کر دیا۔ رباعی۔

مشہور زمانہ میں ہے نام حالی　　معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا　　نازل ہے میرے لب پہ کلامِ حالی

(۱۹۳۲ء) ۔

فکر کے زاویے :

- اسلوب احمد انصاری ” اقبال کا ذہنی ارتقا “
- بشیر احمد ” اقبال اور فلسفۂ خودی “
- مولانا سرور ہاشمی ” حضرت علامہ اقبال کا فکری جہاد “
- رفعت ” علامہ اقبال اور فلسفۂ خودی “
- م۔م جوہر میرٹھی ” اقبال اور مارکس کے زاویہ ہائے نگاہ “
- مرزا صفدر بیگ ” اقبال اور اشتراکیت “

اسلوب احمد انصاری

اقبال کا ذہنی ارتقاء

اقبال عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہوا ہے جس کے افکار کے نغموں نے "رنگ و آب شاعری" کے طلسم کو ایک نئے انداز سے باندھا اور جس کے خیالات کی بلند پردازی نے ادب کے خزانوں کو بھرپور کر دیا ہے خیالات کی بوقلمونی ہر مرتبہ ایک نئی ادا نئی شان کے ساتھ مختلف پیراؤں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور زمین شعر میں وہ گل کھلاتی ہے جس میں دائمی کشش، حسن اور سحر آفرینی کے عناصر ملے جلے ہوتے ہیں۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا اصول اس کے اشعار میں پڑھ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے تخیلی پیکروں میں سچا رنگ روپ ہوتا ہے۔ ان میں توانائی بھی ہوتی ہے صداقت بھی، حسن بھی ہوتا ہے کشش بھی لطافت بھی ہوتی ہے، موسیقیت بھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ اعجاز ہوتا ہے جو اپنے نفس گرم سے "خاک ہزار سالہ" میں زندگی کا احساس اور گرمی، حرارت اور گداز پھونک دیتا ہے اور زندگی کی ایسی لہریں دوڑ جاتی ہیں جن سے دل گرفتہ غنچوں کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے درون لالہ بھی تازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک الہامی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک سرمدی نشہ ہوتا ہے۔ ایک بے پیئے کی مستی۔ لیکن اس سے خود فراموشی کی بجائے خود شعوری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تشائم پسندی کے بجائے تفاعل پسندی کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے۔ قنوطیت کے بادل چھنٹ جاتے ہیں۔ رجائیت کی سحر طلوع ہونے لگتی ہے۔ سینوں میں تمناؤں کی فروزاں آگ مشتعل ہو جاتی ہے۔ زندگی میں حسن اور حسن میں زندگی نظر

آنے لگتی ہے۔ آتش نفس تیز تر ہو جاتی ہے۔ ممکنات زندگی کا میدان وسیع ہو جاتا ہے اور دل کیف و مستی کی تھاہ میں ڈوب کر جب ابھرتا ہے تو قوت، حیات اور امید سے لبریز ہو جاتی ہے۔

اس کے ہر خیال میں ایک نئی شان اور ہر بات میں ایک نیا رنگ ہے۔ اس میں جدت بھی ہے اور اخلاق بھی، لوچ بھی ہے اور تنومندی بھی۔ خون تازہ بھی اور حقیقت پژوہی بھی۔ اس کے ہاں محض الفاظ کی صنعت کاری نہیں بلکہ رنگ و آہنگ، کیف وکم اور خط و خال کے ایسے ایسے حسین مرقعے ہیں۔ جن میں سے زندگی جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے اور یہی اس کی بلندی کی دلیل ہے۔

اقبال کے ابتدائی اشعار میں داغ کی شوخ بیانی، جدت اور شیرینی صاف نظر آتی ہے۔ اس کی تصویروں میں وہی بانکپن، وہی رعنائی اور وہی دلکشی پائی جاتی ہے ان میں داغ کا انداز بیان سمویا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ اقبال نے فلسفیانہ طبیعت پائی تھی اس لئے غالب کے کلام کے اثر نے اسے اور چمکا دیا اور ان کے ذہنی ارتقار کے ساتھ ساتھ یہ حکیمانہ طریق فکر بڑھتا گیا۔ لیکن شاعری کی روح نے اسے شعریت کے سانچہ میں ایسا ڈھالا کہ اس کی شان انوکھی ہو گئی حالی کے درد دل نے بھی اقبال کی رگ جاں کو متحرک کیا اور چونکہ اقبال کو بھی ایک سوئی ہوئی قوم کی واماندہ رگوں میں خون حیات دوڑانا تھا اس لئے اس کی لَے نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ مگر اقبال ایک رجائی شاعر ہے۔ اور قوم کے سامنے ایک بلند اور امید افزا مطمح نظر پیش کرتا ہے اس لئے اس کے اشعار نالہ و زاری اور حزن یاس کے عناصر سے آزاد ہیں۔ بلکہ ان کی بجائے ان میں امید اور زندگی کی حرارت اور سوز ہے لیکن جس طرح ہر بڑا شاعر قوت تخلیق کا مالک ہوتا ہے اسی طرح اقبال نے ان تینوں شاعروں کے اثرات کو اپنی فطرت میں اس طرح سمویا۔ اور اپنی انفرادی ذہنی اپج سے اس طرح چمکایا کہ اس کی راہ سب سے الگ اور سب سے پُرشوکت نظر آتی ہے۔ اس کے ہاں داغ کی زبان، غالب کا فلسفہ اور حالی کا درد اور تپش حل ہو کر موزوں قالب میں جلوہ گر

ہو گئے ہیں۔

اقبال کے ابتدائی کلام کے مجموعہ "بانگ درا" میں داغ، غالب اور حالی پر بڑی نظمیں ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ان تینوں کا کس حد تک رہین منت ہے اور اس کے قلب کی گہرائیوں میں احترام، عظمت کے کتنے لطیف جذبات ہیں۔ "بانگ درا" میں شاعری کے تین دھارے الگ الگ بہتے نظر آتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر جو ابھی پر تول رہا ہے۔ آئندہ کن بلندیوں پر پرواز کرنے والا ہے۔ ان تینوں دوروں کو سامنے رکھنے سے تخیل کے تدریجی ارتقا کا نقشہ صاف نظر آجاتا ہے۔ ہر نقش ثانی، نقش اول سے زیادہ پختہ ہوتا ہے اور ایک دور کی خامیاں دوسرے دور میں رفع ہو جاتی ہیں۔ جو نقش پہلے دھندلے اور پھیکے ہوتے ہیں وہ زمانہ کی نشو و نما کے ساتھ روشن، جاذب اور دلفریب بن جاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ایک تصویر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اقبال کے پہلے دور کی نظموں میں سب سے پہلی نظم "ہمالہ" ہے اس میں خیالات انگریزی ہیں اور زبان پر فارسی کا رنگ غالب ہے۔ تخیل بے انتہا حسین ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ رعنائی اور زیبائی کی جھلکیاں شاعر کے مصورانہ کمال کی غمازی کر رہی ہیں۔ اس کے الفاظ قوس قزح کی طرح رنگین اور دلکش ہیں۔ اور خیالات کا تسلسل موسم بہار کی رنگا رنگ دلآویزیوں کی طرح دلپذیر ہے۔ شاعر کے دل میں وطن کی محبت کے جذبات بھی موجیں لے رہے ہیں اور اس کی روح اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ نظم پہلے دور کی نظموں کی خصوصیات کا آئینہ ہے۔ منظر کشی جس میں اقبال کو خاص مہارت حاصل ہے اس میں موجود ہے۔ ادبی مصوری کا یہ اچھوتا نمونہ ہے جس میں شعریت کا عنصر موجود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ہے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی ۔۔۔ کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی ۔۔۔ سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو
چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو

ایک نظم "ماہ نو" میں تشبیہوں اور استعاروں کی لطافت اپنے انتہائی کمال تک پہنچ گئی ہے "ماہ نو" کو خورشید کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ٹکڑا قرار دینا انوکھا خیال ہے۔ اپنے بے مثل تخیل کی صناعی سے اقبال نے جو تصویر پیش کی ہے اس کا ایک پہلو دیکھئے ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب؟

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی؟

تصویر درد اس دور کی بہترین نظموں میں ہے۔ جس میں اقبال ایک وطن پرست کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ احساس جس نے ان سے یہ کہلوایا کہ "خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" یہاں بھی موجود ہے ان کا دل ہندوستانیوں کے نفاق پر نوحہ خوانی کر رہا ہے اور اس کے مستقبل کا خیال کر کے ان کا دل بیٹھا جاتا ہے وہ ہندوستانیوں کی غیرت قومی کے جذبہ کو متحرک کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ فرقہ آرائیوں کی زنجیروں کو توڑ کر اور "افسانہ ہائے ماضی" کو بالائے طاق رکھ کر موجودہ صورت حالات کا جائزہ لیں اور مستقبل کی تعمیر کی فکر کریں۔ وہ انہیں متنبہ کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے قومی مصیبت کا احساس نہ کیا اور ماضی کے سیمیائی طلسم کے اسیر رہے تو وہ ایک دن صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دئے جائیں گے اور تاریخ ان کے قومی تشخص کی کوئی یادگار محفوظ نہ رکھ سکے گی۔ قوموں کا اجتماعی احساس جب کمزور پڑ جاتا ہے تو دوسری قومی سیرت رکھنے والی قوموں کے اندر جذب ہو جاتی ہیں۔ اس نظم میں ایک قومی ہمدرد کی سچی اور ہمدرد مضطرب روح آہ و فغاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے دلدوز نغمے ہر ہندوستانی کے لئے ایک عمومی اپیل رکھتے ہیں ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بدقسمت ہندوستان کی حالتِ زار انہیں یہاں تک بے چین کرتی ہے کہ بالآخر پکار اُٹھتے ہیں ؎

عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں

وطنیت کے اس شدید احساس کے ساتھ ساتھ شاعر کی عشق پرور روح بھی اپنا مظاہرہ کیے بغیر نہیں رہتی۔ اسے فطرت کے ہر مظہر اور قدرت کی ہر نیرنگی میں حُسن نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس روح کو رقصاں دیکھتا ہے ہر طرف اسے اسی کیف کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔ بتانِ شوخ و شنگ کا تو کیا کہنا جن کے عارضِ تاباں کی جھلک میں حُسن کی تمام فتنہ زائیاں مرکوز ہو گئی ہیں اور جن کی نکیلی پلکوں کے ستم کش تیروں سے شاعر کا دل خون ہو کر رہ گیا تھا۔ اس چمن کا ذرہ ذرہ محشر بداماں ہے اور ہر شئے سے حسن کی شعاعیں پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ ماہِ نو کی چاندنی، سورج کی کرن، شفق کے رنگ، چشمہ کی روانی، پہاڑ کی بلندی اور طائرِ خوش الحاں کے نغموں میں اسے حسن کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ کسی ایسے نظارہ سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس کی روح ابدی مسرت میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کا دل وفورِ شوق سے بیتاب ہو جاتا ہے اور اسے ایک روحانی کیف محسوس ہوتا ہے اس کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس جذبہ سے بھرپور ہے اور اس کی رنگینیاں ہر چیز پر چھائی ہوئی ہیں ؎

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حُسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن

حُسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے

آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ

عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں / طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے / ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن / شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس / ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حسن کے اس عام جلوہ میں بھی یہ بے تاب ہے / زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

دورِ اول کی نظموں میں ہمیں دو عنصر کام کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل وطن سے بے انتہا محبت دوسرے مظاہرِ فطرت میں زندگی کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی جستجو۔ اُن نظموں میں جہاں اقبال فطرت کی مصوری کرتا ہوا نظر آتا ہے وہاں ایک خاص قسم کی جھجک، جستجو اور تلاش کا جذبہ بھی کار فرما ہے۔ وہ حسن میں حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ شاعر فطرت سے درس لینے کی کوشش کرتا ہے اور قدرت کی نیرنگیوں کو دیکھ کر بعض اوقات حیران سا رہ جاتا ہے۔ اس کی حقیقت پژوہی کی صلاحیتیں ہر موقع پر اپنا اظہار کرتی ہیں۔ چاندنی رات آبِ رواں اور شمعِ فروزاں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہے اور پھر اپنے ذہنی تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منقش کر دیتا ہے ؎

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی! / کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی!
نور کا طالب ہوں، گھبراتا ہوں اس بستی میں میں / طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں!
پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے / درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو / سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے / یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس / ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

اسی طرح "ایک پرندہ اور جگنو" میں بھی خیال بندی کے بعض نادر نمونے نظر آتے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر اقبال یورپ چلے گئے۔ ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر انہوں نے جو نظم پڑھی وہ اس دور کی آخری نظم ہے۔ یہیں سے ان کی شاعری میں مغربی علم و حکمت کے اثرات کی ابتدا ہوئی اور دانش کدۂ فرنگ سے مستفید ہونے کے بعد انہوں نے جو نظمیں کہیں ان سے ان کی شاعری میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ اس نظم میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں ان کی علو ہمتی اور خلوص صاف نظر آتے ہیں اور اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو ہمیشہ انہیں بزرگان دین کے ساتھ رہی۔ اس وقت اقبال نے اپنے لئے جو دعا کی تھی وہ بارگاہ خداوندی میں قبول ہو گئی ہے

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے — یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کے دوسرے دَور کی نظموں میں ہمیں شاعر کی رومانی طبیعت کی تصویر بے نقاب نظر آتی ہے فطرت کی منظر کشی جو پہلے دور میں قومی اور وطنی نظموں کے جھرمٹ میں کبھی کبھی ایک لمحہ کے لیے لمعہ افگن ہوتی تھی اب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نظر آتی ہے۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فطرت کے حسین جلووں کے لئے مشاطگی کا کام دیتی ہے جس میں شاعر خود بھی کبھی کبھی اپنی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ اجزائے کائنات میں حُسن کی جو بظاہر خاموش قوتیں کام کر رہی ہیں، وہ انہیں نمایاں کرتا ہے اور فطرت کے نرم و نازک ہاتھ میں ساغر حُسن کو دیکھ کر بیخود ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ایک ایک بوند کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک حسن و صداقت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ حسن کا منتہا یہ ہے کہ وہ ہمیں صداقت کے قریب کر دے اور ہمارے دل میں اعلیٰ مقاصد کی قدر کا جذبہ پیدا کرے۔ حُسن، محبت کی فطرت کے لئے جذبۂ محرکہ کا کام کرتا ہے۔ اقبال محبت کو ایک لطیف

کیفیت سمجھتا ہے جو زندگی کی رگ و پے میں جاری وساری ہے۔ اس کے عناصر عالم خاکی سے نہیں بلکہ عالم بالا کے موسیقار کے ذروں سے مرکب ہیں۔ اس میں لرزتے ہوئے تاروں کی چمک، تڑپتی ہوئی بجلی کی کڑک، حور کی پاکیزگی، شبنم کی افتادگی اور فرشتہ کی معصومیت کے اجزا ملے ہوئے ہیں۔ اور کائنات کی تمام حسین چیزیں اسی لطیف آمیزش کے خارجی مظاہر ہیں۔ محبت کے عنوان سے پہلی نظم میں لکھتے ہیں ؎

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

اور پھر اس کا اثر یہ ہوا ؎

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

"حقیقت حسن" کے نام سے جو نظم کہی ہے اسے اس دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ رمزیت (SYMBOLISM) جو اقبال کے آرٹ کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ اس میں بھی موجود ہے۔ اس میں شاعر نے رمز و کنایہ سے حُسن کی بے ثباتی پر بڑے لطیف پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے اور پھر "حقیقت زوال" کی توجیہہ عجیب انداز سے کی ہے۔ اس نظم میں کسی قدر قنوطی انداز نمایاں ہے جو اس دور کی ایک خصوصیت ہے اور جو حساس نوجوانوں میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ ان اشعار کی وقعت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک شاعر کا دل اور ایک مصور کی نگاہ چاہئے۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا　　شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

"طلبائے علی گڑھ کالج کے نام" جو پیام اقبال نے دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نظم ہستی کے ان اجزا کو کس قدر اہم سمجھتے تھے اور ملت کی زندگی نوجوانوں کے کردار سے کس حد تک وابستہ ہے۔ اقبال پوری قوم کو جو پیام دینا چاہتے تھے وہی پیام انہوں نے اس قوم کے اہل علم نوجوان طبقہ کے سامنے پیش کیا۔ ۱۹۰۷ء کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی شورش کا زمانہ تھا اور مسلمان اپنے نصب العین سے ہٹ کر مختلف راستوں کی طرف بھٹک رہے تھے۔ اس وقت اقبال نے نوجوانوں کو ذوق عمل اور ذوق تپش کا سبق دیکر انہیں اپنی زندگی کا ایک جزو بنا لینے کا پیام دیا اور ان کی سرد رگوں میں احساس اور زندگی کی تازہ لہریں دوڑا دیں۔ اس پیام میں ہمیں بعض وہ چیزیں ملتی ہیں جنہوں نے اقبال کی آئندہ شاعری میں ایک منظم فلسفہ زندگی کی صورت اختیار کر لی اور جنہوں نے اقبال کو رومانی شاعری سے اونچا اٹھا کر نشاۃ جدیدہ کی طلوع ہونے والی سحر کا نقیب اور قوموں کی زندگی کے دھارے کو موڑ دینے والا مفکر اور شاعر بنا دیا۔ یہی وہ دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جو بعد میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں اور جنہوں نے اقبال کی شاعری کی پیشانی پر حیات جاوید کا جھومر لگا دیا ؎

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں　　کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا　　اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو　　گردش آدمی ہے اور، گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز　　غمکدہ نمود میں شرط دوام اور ہے

یورپ کے عیش پرور ماحول نے اقبال کے دماغ پر جو تاثرات مرتب کئے۔ ان کا عکس کم و بیش تمام نظموں میں نظر آتا ہے اس وقت اقبال عام نوجوان شاعروں کے انداز میں حسن و عشق کے رموز آشکارا کرنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ اور بعض وقت ایسا کھو جاتا ہے گویا اس کی روح اس میں ڈوب گئی ہے۔ "حسن و عشق" کے عنوان سے ایک نظم میں یہ احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں اقبال محبوب مجازی کے

جمال کے مشاہدہ میں غرق ہے تاکہ اس جذبہ کی تسکین کر سکے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اقبال کا انداز بیان بہت دلکش اور سحر آفریں ہے فرماتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

اسی نوع کے چند اشعار اور دیکھئے ؎

شبنمِ دہر میں مانند مئے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شئے میں جھلک ہے اس کی
کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

شیلے کا فلسفۂ محبت بھی اسی کے قریب ہے اس کے نزدیک اجزائے عالم کی باہمی وابستگی کا نام محبت ہے جس کے بغیر کائنات کا وجود ناممکن ہے اور انسانی زندگی کیف سے خالی۔

"چاند اور تارے" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے نہایت دلکش انداز میں زندگی اور حرکتِ دوام کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور عمل پیہم اور ذوق طلب کو ترقی اور حیات کے لوازمات قرار دیا ہے۔ قوموں کی زندگی میں جب یہ عنصر کمزور پڑ جاتا ہے۔ تو ان کا اجتماعی احساس ختم ہو جاتا ہے اور وہ بہت جلد اپنی انفرادیت کو ختم کر کے زندگی کے چراغ کو گل کر دیتی ہیں۔ اقبال نے چاند کی زبانی یہ پیام پہنچایا ہے۔ زبان اسقدر سادہ دلنشیں اور مسلسل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور داغ کے بعض اجزاء لے کر اقبال کے پیکر میں ڈھالے گئے ہیں ؎

کہنے لگا چاند ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے | پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں | جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حُسن | آغاز ہے عشق، انتہا حُسن

یورپین معاشرت کی رنگارنگ بزم آرائیوں اور رومانی شعرا کے کلام نے اقبال کے نوجوان اور شاعرانہ دل پر جو اثرات ڈالے انہیں ایک حد تک ابیقوریت ...... (EPICUREANISM) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وہ زندگی سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور غم و اندوہ کے گرد و غبار سے شیشۂ دل کو صاف رکھنے کا خواہشمند ہے۔ اسے ساقیان جمیل، شراب طہور، ذکر سلسبیل اور جلوۂ طور سے کوئی دلچسپی نہیں وہ تخیل کے ان طلسموں کو توڑ کر اس دنیا میں اپنی روح کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دور کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کی زندگی میں بالیدگی اور نمو کا سلسلہ جاری رہے۔ وہ عیش و سرور کے ان رنگین پردوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے تاکہ انسان کسی فریب میں مبتلا نہ رہے۔ سرمدی کیفیت کے یہ حسین جلوے ایک نوجوان شاعر کے دل کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ یہ اس کی بے چین اور ناشکیبا روح کی ایسی آزمائش ہے جس سے وہ دامن بچا کر نکل جانا چاہتا ہے اور شاعر زندگی کے "چھلکتے" ہوئے افشردہ کو خوب دل کھول کر پینا چاہتا ہے۔ وہ خیام کی طرح عشرت امروز کا قائل ہے۔

مقام امن ہے جنت مجھے کلام نہیں | شباب کے لئے موزوں ترا پیام نہیں
شباب آہ کہاں تک امیدوار رہے | وہ عیش، عیش نہیں جس کا انتظار رہے
وہ حسن کیا ہے جو محتاج چشم بینا ہو | نمود کے لئے منت پذیر فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا | عقیدہ "عشرت امروز" ہے جوانی کا

لیکن شراب زندگی میں اس قدر منہمک ہونے کے باوجود بھی اقبال حقیقت کی جستجو سے غافل نہیں۔ وہ اسرار و رموز کے چہرہ سے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے۔ اس کا ذوق آگہی زندگی کا راز معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ اور وہ ہمہ تن استعجاب بنا ہوا طلسم زمان و مکان کی پہنائیوں کو ناپ رہا ہے۔ اپنی نظم "انسان" میں اقبال نے

انہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان گنت مخلوقات کی اس نیرنگی میں اقبال نے انسان کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بہت دلکش ہے۔ اس کے ارد گرد تمام فضا میں ہر چیز کیف اور نشہ میں چور ہے اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے۔ موج دریا بادل، تارے، خورشید، اپنے اپنے کام میں منہمک ہیں۔ اور ان کی طمانیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے معموں کا حل پا گئے ہیں۔ لیکن اس "نگار خانۂ جہین" میں انسان یکہ و تنہا کھڑا اپنے تخیل کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تلخیٔ روزگار پر نوحہ خوانی کر رہا ہے

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انسان کو راز جو بنایا | راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا | کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے | آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟
لذت گیر وجود ہر شئے | سرمست مئے نمود ہر شئے
کوئی نہیں غمگسار انساں | کیا تلخ ہے روزگار انسان

تیسرے دور کی ایک نظم "انسان" میں قنوطیت کا انداز رجائیت سے بدل گیا ہے۔ اس تصویر میں انسان با اختیار اور دوسرے موجودات سے برتر نظر آتا ہے اور اس کی ہستی میں زندگی کے شاندار امکانات مضمر ہیں چنانچہ لکھتے ہیں ؎

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں | انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے!
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم | یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی | یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے!

"ایک شام" اور "تنہائی" دو نظمیں دوسرے دور میں امتیازی شان رکھتی ہے۔ ان دونوں نظموں میں ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) کا تخیل اقبال کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ زبان اس قدر پیاری اور دلکش ہے۔ اور شاعر نے اندازِ بیان سے ایسا سحر پھونکا ہے کہ انہیں ادب العالیہ کے بہترین نمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔
فطرت کی اس سے بہتر تصویر کشی جس میں جذبات، زبان اور تخیل مل جل کر افسوں بن گئے

ہیں، خیال میں نہیں آسکتی۔ جس وقت اقبال نے یہ نظم کہی ہوگی تو اس کا تخیل آسمانوں میں پرواز کر رہا ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل فطرت کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ ہوگیا ہے کہ اس کی انفرادیت غائب ہوگئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش　　کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہو گئی ہے　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا　　قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا　　آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟　　انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟
یہ رفعت آسمان خاموش　　خوابیدہ زمیں، جہان خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار　　فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے　　یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!　　قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

"عبدالقادر کے نام"، کی نظم میں اقبال کے ارادوں اور ولولوں کا خواب صاف نظر آتا ہے۔ یہ نظم در اصل ان کے ذہنی نقوش کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو بعد میں شاعرانہ معجز نمائی کے ساتھ زیب قرطاس ہوئے۔ یہی وہ دھندلی سی تصویر ہے جو آئندہ "شکوہ"۔ "جواب شکوہ"۔ "شمع و شاعر"۔ "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" میں تخیل کی صورتگری سے دلکشی و زیبائی کا جامہ پہن کر ظاہر ہوئی ہے اور جس کی نقاب کشائی نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

مارچ ۱۹۰۷ء کی نظم میں جو دوسرے دور کی آخری نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے اپنے شاعرانہ ماضی کے خلاف کھلا ہوا مظاہرہ کیا۔ یہیں سے اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے رجحان کا آغاز نمایاں ہوتا ہے۔ یو تیسرے دور

کی نظموں میں پوری وسعت میں پھیل کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

پہلے دور میں شاعر ذوق استفہام کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے دور میں فطرت کے جلوے اس پر رازہائے سربستہ کی پردہ دری کر رہے ہیں اور تیسرے دور میں وہ زندگی کے رازوں سے واقف ہو کر اپنی ملت کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اپنی شاعری کے عہد طفولیت میں وہ ایک وطنی شاعر تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ فطرت کا ایک چابک دست منظر کش۔ دوسرے دور میں جذبات حسن و عشق کا تلاطم، فطرت کی حسین صناعی اور زندگی کے رازوں کی آشکارائی، اس کے ذہنی نشو و نما کی غمازی کر رہے ہیں۔ بعض نظمیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے جس چیز کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اب اسے پا گیا ہے اور ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ تیسرے دور میں وہ ایک مفکر ملت اور نبض شناس حکیم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اپنی دور رس نگاہوں سے قومی زندگی کے مد و جزر کا جائزہ لے کر حیات قومی کے اصول مرتب کر رہا ہے۔ اور مسلمانوں کی کشتی حیات کو موجوں کے تھپیڑوں سے بچا کر ہمکنار ساحل کر دینا چاہتا ہے۔

قیام ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی پیغمبرانہ شان کا آغاز ہے۔ اس سے پہلے کا اقبال محض شاعر تھا۔ مگر اس کے بعد کا اقبال ایک پیغامبر کی حیثیت رکھتا ہے جو سست عناصر قوم کے جسد خاکی میں حیات نو کا شرارہ پھونک کر اور ممکنات زندگی کے شعلہ کو بھڑکا کر اسے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے مغرب کی معاشرتی زندگی میں رس بس کر اس تمدن کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور اس دریا کے عین منجدھار میں پہنچ کر اس کی انتہائی

گہرائیوں کا جائزہ لیا تھا۔ چنانچہ اس کے غیر معمولی غور و فکر اور ژرف نگاہی نے اسے مغرب کی سرد روحانیت سے بیزار کر دیا اور اس نے کہا ؎

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر   اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

مغربی تہذیب و تمدن کی رنگا رنگ دلفریبیوں نے اقبال کے ذہنی توازن کو بگاڑا نہیں بلکہ اس پر صیقل کر کے اس میں گہرائی، صداقت اور دور رسی پیدا کر دی اور جب اس نے اس کا مقابلہ اسلامی تمدن سے کیا تو حقیقت ظاہر ہو کر سامنے آ گئی اور اقبال کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تمدن کی بنیاد کس قدر کمزور اور سست ہے۔ اور ان رنگین پردوں کے پیچھے اوہام کا ایک حسین پیکر ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔ ان دونوں تہذیبوں کے موازنہ نے اقبال کی زندگی کا عظیم الشان نصب العین متعین کر دیا۔ اور اس نے اپنے تخیل اور جذبات فکری اور ذہنی استعداد کے اظہار کے لئے ایک راہ نکال لی۔ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ تہذیب کی یہ چمک دمک زوال پذیر ہے اور اس کے ساتھ مغربی قوموں کا خرمن حیات بھی خاکستر ہو جائے گا۔ انہیں اس تہذیب میں روحانیت کی موت نظر آ رہی تھی۔ اور ان کا خیال تھا کہ مادیت کی بنیادوں پر جو فلسفہ حیات مرتب کیا جائے گا وہ انسانیت کی حفاظت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ انہی خیالات کو اقبال نے دوسرے دور کے آخر میں ان الفاظ میں بلند آواز سے منتشر کیا ؎

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہوگا

اس موضوع پر اقبال نے اپنی آئندہ تصانیف میں مستقل طور سے اظہار خیال کیا اور ہندوستانیوں کو اس فریب سے آگاہ کر کے صحیح راہ عمل دکھائی۔

شروع شروع میں اقبال نے سیاسی تحریکات سے متاثر ہو کر وطنیت کی

نغمہ سرائی کی تھی۔ لیکن قومیت کے تصور کی تنگ دامنی ان کے بین الاقوامی فلسفہ کا ساتھ کیوں کر دے سکتی؟ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی آڑ میں قومیں کس طرح قوت و اقتدار کی خواہش کو پورا کر کے انسانیت کے زوال کا باعث ہوتی ہیں۔ اور اپنے حرص و آز کو شیریں الفاظ کا جامہ پہنا کر امپیریلزم کے قیام و بقا میں ممد ہوتی ہیں۔ ہر بڑے شاعر کا پیام عالمگیر ہوتا ہے اور اس کی نگاہ میں جغرافیائی حدبندیاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اقبال نے اس بت کو جو تراشیدۂ "تہذیب نوی" ہے پاش پاش کر دیا۔ اور ان خیالات کی بیخ کنی کر کے اسلامی نظریۂ قومیت پیش کیا۔ اب اس ترانہ ہندی کی بجائے ترانۂ ملی لکھا اور وطنیت کے مذموم اور اوچھے فلسفہ کو اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا۔ جس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تہذیب کے ان خوشنما کھلونوں میں کس قدر زہر ملا ہوا ہے ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ۔۔۔ رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔۔۔ تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ۔۔۔ قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

"شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں اقبال نے مسلمانوں کے ماضی کی شاندار روایات حال کی تباہ حالی، اور مستقبل کی امید افزا جھلکیوں کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا ہے۔ "شکوہ" میں ماضی کا گلہ اور "جواب شکوہ" میں حال کی توجیہ جس انداز میں کی گئی ہے وہ خیالی مذہب پرستوں کے نزدیک بیباکانہ سہی مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھی چیز ہے جس سے اقبال کی گہری نظر اور جدت کا پتہ چلتا ہے۔ "مسدس" بھی اسی قسم کی ایک نظم ہے جسے مسلمانوں کی حیات ملی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں گو انگریزی کی واقعیت (REALISM) اور ہندی کی گھلاوٹ پوری طرح موجود ہیں جس سے حالی کی استادی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اس میں گہرائی کے ساتھ شگفتگی موجود نہیں۔ اور واقعیت نے شعریت کے چہرہ پر نقاب ڈال دی ہے۔ "شکوہ" میں حقیقت نگاری کے ساتھ جامعیت موجود ہے۔ اور انداز بیان اس قدر دلکش ہے

کہ خود بقول اقبالؔ "شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے" حالی نے اپنے پر سوز اشعار سے جن میں عرب شاعروں کی سی گرمی ہے نیند کے متوالوں کو چونکا دیا۔ اور انکے خون میں حرارت اور تپش پیدا کی۔ مگر اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری نمک سے خالی ہے۔ مسدس کے دیباچہ میں انہوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر اپنے دَور کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس دَور کے لوازمات اور تقاضوں کے مطابق اس کی شاعری کا پیکر تیار ہوتا ہے۔ مگر طرز ادا ایک الگ چیز ہے۔ جو شاعر کی شخصیت اور انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ حالیؔ کے یہاں جو کسک اور کھٹک ہے اقبالؔ نے اسے اور بڑھا دیا ہے۔ حالیؔ کے یہاں قومی احساسات کی وہ دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ اقبالؔ نے اسے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ فارسی شاعری کے رسیا ہر چیز کو نغمہ، جام اور مے، محفل، ساقی اور اسی قسم کے دوسرے اصطلاحات شاعری میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کے دماغوں میں تکلفات اس قدر رچ گئے تھے کہ وہ ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبالؔ نے انہی پرانے ساغروں میں تند و تیز شراب ایک نئے انداز سے بھر کر پیش کی اور اپنی غیر معمولی قوت بیان سے کام لے کر اس کام کو پورا کیا۔ جس کی ابتدا حالیؔ نے کی تھی۔ ایک جگہ شکایت کا انداز کس قدر پیارا ہے ؎

در دلیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی	نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حُسن کا جادو بھی وہی	اُمت احمد مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگیٔ غیر سبب کیا معنی؟	اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی!

اور پھر ایک دوسری جگہ یہ طرز کس قدر دلکش ہے ؎

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے	سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے	تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے	برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

قدرت کے مناظر کی دلکشی کے ساتھ ساتھ اپنے پیام کی نشر و اشاعت کا

سلسلہ تیسرے دور میں بھی جاری ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اہمیت پر اقبال نے جگہ جگہ زور دیا ہے۔ اجرام فلکی کی باہمی آویزش سے اقبال نے اجتماعی قوت کا اصول مرتب کیا ہے جس کے بغیر افراد کی زندگی میں کوئی زور نہیں ہوتا۔ تنظیم اور اخوت اور اجتماعی احساس ملت کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور باہمی ربط سے وہ چشمے پھوٹے ہیں۔ جو کشت زار قوم کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک نظم "بزم انجم" میں اقبال نے تاروں کی زبان سے زندگی کا اصول واضح کیا ہے ؎

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اجتماعی تنظیم کے بغیر انفرادی زندگی بیکار ہے۔ قطرہ دریا میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کو ختم نہیں کر دیتا۔ بلکہ اصل میں اس کی زندگی کے سوتے یہیں سے کھلتے ہیں۔ فرد اور ملت کے اس تعلق کو اقبال نے "شمع اور شاعر" میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بُو ہوا

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

"شمع و شاعر" میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا ہے ہمتیں بڑھائی ہیں۔ ولولوں کو تازہ کیا ہے۔ احساس کمتری کے افسوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ نظام کائنات میں ان کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے پیام کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے۔ اور حالات کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر مستقبل کا حسین اور تابناک چہرہ دکھایا ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا — جو نظام دہر میں پیدا ابھی ہے پنہاں بھی ہے
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

"جواب شکوہ" میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی — برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے — یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

"خضر راہ" میں جو تیسرے دور کی مقبول ترین نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے حالات حاضرہ پر بڑی گہری تنقید کی ہے۔ یہ نظم ۱۹۲۰ء میں لکھی گئی اور سوز و گداز سے لبریز ہے۔ جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا نقش اقبال کے دل پر مرتسم ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس میں انسانیت کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ ممالک اسلامیہ کہ جو پہلے ہی سے اضمحلال کی گہرائیوں میں ڈوب چکے تھے۔ اس دھچکے کی تاب نہ لا سکے، انتشار کی قوتیں نشو و نما پا چکی تھیں۔ پراگندگی اور بدنظمی سے حالت پہلے ہی دگرگوں تھی اس پر دوسرا چرکہ لگا۔ دنیائے اسلام پر نکبت و ادبار کی گھٹائیں ہر چہار طرف سے چھا گئی تھیں اور اسلامی سلطنت کا خیال افسانۂ پارینہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نظم میں اقبال نے صحرانوردی کی حقیقت بیان کی ہے۔ زندگی کے رموز آشکارا کئے ہیں۔ سلطنت اور حکومت کی ماہیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ سرمایہ و محنت کی آویزش پر روشنی ڈالی ہے۔ ایشیا کی یورپ زدگی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ممالک اسلامیہ کی سیاسی روش پر تنقید کی ہے اور مسلمانوں کو امید کا درس دیا ہے۔ یہ نظم گوناگوں خیالات سے لبریز ہے اور اس میں زندگی کے بہت سے باریک نکات حل کئے ہیں۔

زندگی کا فلسفہ پیش کرنے میں اقبال نے بڑی ندرت سے کام لیا ہے۔ وہ زندگی عام پیمانوں سے ناپنا نہیں چاہتے، ان کے خیال میں حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک تخلیقی حرکت ہے جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے

سخت کوشی زندگی کا اساسی اصول ہے اور آزادی اس کی نشو و نما اور تسلسل اسکا جزو لاینفک غلامی سے زندگی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں اور انسان زندگی کی حقیقی مسرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ روح کی بالیدگی تخلیقی قوتوں کی نشو و نما اور بلند مقاصد کو حاصل کرنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور انسانی تگ و تاز کا میدان تنگ ہو جاتا ہے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

"طلوع اسلام" میں اقبال نے اپنا رجائی پیغام بڑے پُر شوکت انداز میں پیش کیا ہے۔ یاس و ناامیدی کی کالی کالی گھٹاؤں میں امیدوں کا چمکتا ہوا چہرہ صاف نظر آرہا ہے۔ اقبال نے اسلام کی سربلندی کا جو خواب دیکھا تھا۔ زمانہ نے اس کی تفسیر پیش کر دی اور جنگ عظیم کے بعد کچھ ہی عرصہ میں اسلامی سلطنت کے تن خاکی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں الہامی رنگ ہوتا ہے۔ وہ محض افکار کی سرمستی میں محو نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے "آئینہ گفتار" میں مستقبل کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے اور وجدان تیز تر۔ وہ زمانہ کا بڑا نبض شناس ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے پیام میں حیات قومی کی تعمیر کے لئے ایک لائحہ عمل موجود ہوتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

"طلوع اسلام" میں ایک نئے انداز سے پھر اسے دہرایا اور کہا ؎

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

"خضر راہ" میں شاعر کے جذبات میں ایک ہلکا سا قنوطی انداز ہے لیکن اب اس کا پیام شک اور تذبذب اضطراب و بے چینی کی جگہ یقین و وثوق، سکون اور اطمینان کے جذبات سے مملو ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر مسلمان کے ایمان کی

چنگاریوں کو مشتعل کیا جائے تو وہ پھر تقدیر کی صورت گری کر سکتا ہے۔

"طلوعِ اسلام" میں وہ امید کے گیت الاپ رہا ہے۔ اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اس کی لَے میں ترنگ ہے اور انداز میں مستی۔ ترانوں میں تازگی ہے اور موسیقیت وہ شرابِ زندگی سے مدہوش کیف و سرور کے عالم میں گائے جا رہا ہے اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے جذبات کو چھیڑ رہا ہے۔ اس کی آواز میں سحر ہے اور اندازِ بیان میں بے پناہ دلکشی۔ احساسات میں خوشی مسکرا رہی ہے۔ نواؤں میں زندگی ہے اور زندگی میں حسن اس کے ہر لفظ سے امرت کے رس کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ اور اس کا دل انبساط کی لہروں کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ یہی کیفیت اس کے ساز کے ہر تار سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہو گئی ہے ؎

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد — بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا — صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش — پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم — کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد
"بیا" تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم — فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اِدھر تو "بانگِ درا" کی تیسرے دَور کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں اور اُدھر "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کا تانا بانا تیار ہو رہا تھا۔ یہی وہ معرکۃ الآرا مثنویاں ہیں جنھوں نے اقبال کی شہرت کو چار چاند لگا دئے اور ان کے عالمگیر پیام کا شہرہ تمام دنیا میں پھیل گیا۔ جس طرح ملٹن کی "گم شدہ فردوس" نے اس کی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ اور شہرتِ عام اور بقائے دوام کا مرصع تاج اس کے سر پر رکھ دیا' اسی طرح اقبال سب سے پہلے ان ہی مثنویوں کی بدولت ایک مفکر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اُن کی ان دو مثنویوں نے دنیائے تصوّف اور دنیائے ادب میں تہلکہ ڈال دیا۔ اور انھوں نے افراد، قوموں اور کائنات کی خودی کا جو نظریہ پیش کیا اس سے انانیت کے تمام پرانے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ڈھکے ہوئے اشارے اور دبی ہوئی آوازیں جو کبھی کبھی "بانگِ درا" میں ذوقِ عمل

اور 'ذوقِ طلب' کی مبہم اصطلاحوں کے پردوں میں ظاہر ہوتی تھیں اب ایک گرج بن کر گونج اُٹھیں۔ شاعری فلسفہ اور تصوف کی جھلکیاں پہلے بھی نظر آتی تھیں۔ اب اقبال نے ایک فلسفی شاعر کی قبا پہن لی اور اس کے فلسفہ نے ایک منظم فلسفۂ زندگی کی حیثیت اختیار کر لی۔

اقبال کے فلسفہ کا سنگِ بنیاد جو "اسرار خودی" کا موضوع ہے۔ اثبات خودی میں مضمر ہے۔ اپنی ہستی کا احساس اور اپنی قوتوں کا ادراک فرد کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ اس سے انسان میں یقین، وثوق اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس پر زندگی کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ انسان خدا کی ہستی کا ایک پرتو ہے۔ اس لئے شعورِ ذات کے بغیر ہستی مطلق کی معرفت حاصل ہونا ممکن نہیں اگر خدا کو ایک بحرِ ذخار تصور کر لیا جائے تو اس میں انسان کی ہستی ایک قطرہ کی مانند ہے۔ شعورِ ذات سے انسان میں عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ تمنائیں اور ولولے تازہ ہو جاتے ہیں جن سے رزمگاہ خیر و شر میں وہ اپنی دنیا آسانی سے بنا سکتا ہے۔ فرد کا نفس گو ایک فانی ہستی ہے مگر وہ اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ خودی کا استحکام اور نشو و نما اُس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ غیر خود یعنی عالمِ طبعی سے مسلسل برسرِ پیکار رہے۔ اس سے نت نئی خواہشات کی تخلیق ہوتی رہتی ہے اور نئے نئے مقاصد کا تعین ہوتا ہے۔ اسی سے ارادے اور امنگیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ سوزِ آرزو پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے تڑپ اور بے چینی بے قراری اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کا دوسرا نام ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دل خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاک تو مزار

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرت ہر شئے امینِ آرزوست

آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بے تابے ز دریائے خودی

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

خودی کی منازلِ ترقی زمان و مکان کی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتیں بلکہ ان کے طلسم کو توڑ کر عالم ماورے کی پہنائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور اپنی تگ و تاز کے لئے نئے نئے میدان تلاش کرتی ہیں ؎

خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں!
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر!
"بالِ جبریل"

خودی کی تقویت اور رہنمائی کے لئے عشق ضروری ہے۔ اقبال نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد وہ جذب اندروں ہے جس کا سرچشمہ وجدان ہے۔ محبت ہی سے خودی معراج کمال تک پہنچتی ہے اور اسی سے اس شرارہ میں سوز، جلا اور تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادیں اسی سے استوار ہوتی ہیں اور وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو روحانیت کا جوہر ہے۔ عشق ہی کائنات کی اصل روح ہے اور اسی سے انسان اعلیٰ مدارج تک پہنچتا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است — زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر تابندہ تر
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
دل ز عشق او توانا می شود — خاک ہمدوش ثریا می شود

احساس خودی کی اہمیت کو اقبال نے جگہ جگہ دہرایا ہے اور اس کی لازوال قوتوں کی مدح سرائی میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی ہے ؎

پیکر ہستی ز آثار خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او — غیر او پیداست از اثبات او

اقبال کا فلسفۂ انفرادیت جس میں زندگی اور کائنات کی وحدت کا تصور پیش کیا گیا ہے ہیگل کے فلسفہ سے بالکل مطابقت نہیں کرتا۔ اس کے

خیال کے مطابق انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کردے۔ اقبال خود کے ابھار اور نشوونما کے قائل ہیں جس سے انسان میں تسخیر النفس و آفاق کی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ خدا کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کے عزائم کا یہ حال ہو جاتا ہے ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال کی رائے میں مصائب و آلام خودی کی تربیت اور اصلاح کا موجب ہیں شوپنہار کے نزدیک یہی چیز خودکشی کے جواز میں پیش کی جاسکتی ہے۔ فقر و استغنا، خودی کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیازی، نوامیس فطرت کی تسخیر اور دنیا میں انسانیت کے نصب العین کو فروغ دینے کا نام ہے۔ جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے پختگی حاصل کر لیتی ہے تو اس میں زندگی کی لازوال قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں اور کائنات میں اپنی برتری کا سکہ جمادیتی ہیں۔ اس وقت اس کی برائی کے خلاف کوئی روک نہیں کی جاسکتی اور انسان اپنی اس حیثیت سے بہت بلند ہو جاتا ہے اسی سے اس میں روحانیت کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے اور احساس نفس کے مکمل نشوونما کے بعد وہ قرب الٰہی حاصل کرسکتا ہے اور یہی ارتقائے خودی کا انتہائی نصب العین ہے جو اقبال پیش کرتے ہیں۔

فرد اور ملت کے قانون کو اقبال نے بیخودی سے تعبیر کیا ہے جس سے انسان کی انفرادی قوتیں زیادہ منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی خودی کا احساس فرد کی خودی کے احساس کو تقویت پہنچاتا ہے اور اسے وسیع تر محکم تر کر دیتا ہے۔ اس سے اس کی تیغ خودی آبدار ہو جاتی ہے اور اس کی فطرت کا جوہر اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ اسلام کے تمام ارکان میں اجتماعی احساس کی یہی روح کام کر رہی ہے اور اسی نے ابھی تک مسلمانوں کو ایک مضبوط معاشرتی نظام،

ہیں باندھ رکھا ہے۔ ملت میں گم ہو کر افراد کی ہستی گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ زیادہ موثر اور معنی خیز بن جاتی ہے افکار اور کردار کی وحدت جو اسلامی تعلیمات کا اساسی اصول ہے۔ آئین ملت کو سامنے رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اسی سے کسی قوم میں سربلندی پیدا ہو سکتی ہے اقبال نے اس موضوع پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے ۔

فرد را ربط جماعت رحمت است   جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش   رونق ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام   ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود   قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

خلافت راشدہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے بنیادی تصورات بھی متزلزل ہونے لگے عباسیوں کے عہد حکومت میں جب عجمیت کا عنصر اپنے شباب پر تھا اور مسلمانوں کی ذہنی زندگی اس سے پورے طور پر مرعوب ہو چکی تھی۔ اسلامی نظریوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ یونانی اور ہندی فلسفہ جب مسلمانوں کے ہاں منتقل ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں پر بہت گہرے پڑے۔ افلاطون کے فلسفہ نے مسلمانوں کی زندگی میں جمود پیدا کر دیا اور ان کے قوائے عملیہ شل ہو گئے۔ جن کا نتیجہ رہبانیت اور تباہی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ ویدانت کے فلسفہ نے اسلامی فلسفہ کی صورت مسخ کر دی۔ اور مسلمانوں پر تصوف کا رنگ غالب آگیا۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد ہمہ اوست کے نظریہ پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ہمہ اوست منفی، صوفیوں کا رقص مستانہ افلاطونی روح کا عکس ہے جس نے زندگی کی عملی قوتوں کو معطل کر دیا ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ اسلامی شعائر اور عقائد کو ان تاثرات سے آزاد کر دے اور مسلمان پھر جادۂ عمل پر گامزن ہو کر زندگی کی نبرد آزمائیوں میں شریک ہوں اور اس جہان رنگ و بو کی تزئین و آرائش کریں۔ فلسفۂ عمل کے متعلق

"اسرارِ خودی" میں لکھتے ہیں ؎

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات
یا جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند او قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است
زندگانی قوتِ پیدا ستے — اصلِ او از ذوقِ استیلا ستے
عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات — سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات
ناتوانی زندگی را رہزن است — بطنش از خوف و دروغ آبستن است

اقبال کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے انحطاط کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عمل کی زندگی کی بجائے افلاطونی بے عملی اختیار کر لی ہے ۔ وہ انہیں افلاطون کی تشائم پسندی کے خلاف خبردار کرتا ہے اور اس سے بہت بیزار ہے ۔

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گفت سرِ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام — لذتِ رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب — طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش — از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قومہا از سکرِ او مسموم گشت — خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

"اسرارِ خودی"

اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی پروردہ و ساختہ نسل سے ان کی بیزاری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان کے دماغوں سے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت کو زائل کر دیا۔ مادی فلسفہ و سائنس سے اکتساب نور کرنے والوں کا ذوق و شوق سرد پڑ گیا۔ ان کے دماغ نورروشن ہیں۔ مگر دل تیرہ اور نگاہیں بیباک ہیں۔ فقر و استغنا جو اقبال کے آئیڈیل انسان کی لازمی صفات ہیں ان میں مفقود ہیں۔ کیونکہ موجودہ تن آسانیوں کے ساتھ ان چیزوں کا تطابق نہیں ہو سکتا۔ قومیت اور وطنیت کے خیالات ان کے دماغوں میں اس طرح رچ چکے ہیں کہ اب انسانیت کی کوئی قدر ان کی نگاہوں میں نہیں رہی۔ اقبال کے نزدیک عورت کا سب سے بڑا جوہر عصمت و عفت ہے۔ جو یوروپین معاشرت کے اثرات کی وجہ سے ننگ آلودہ ہو گیا ہے۔ اقبال اس کی نظر میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنی نسائیت کو برقرار رکھنے کی ہدایت کرتا ہے ؎

واں تہی آغوش نازک پیکرے — خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است — ظاہرش زن، باطن او نازن است
بند ہائے ملت بیضا گسیخت — تازہ چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزاد نیش — از حیا نا آشنا آزاد نیش
علم او بار امومت بر نتافت — بر سر شامش یکے اختر نتافت
این گل از بستان ما نارستہ بہ — داغش از دامان ملت شستہ بہ

"رموز بیخودی"

وطنیت کے مغربی نظریہ پر بھی اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا ہے۔ یورپ میں سب سے پہلے اس ذلیل فلسفہ کو رواج دینے والا میکاولی تھا۔ جس نے مادیت کی بنیادوں پر یہ عمارت اٹھائی وہ فلارنس کا رہنے والا تھا۔ اور اس نے "الملوک" ایک کتاب لکھی جو بعد میں

شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی۔ مگر اقبال کی برہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے حب وطن کو جغرافیائی حد بندیوں میں مقید کر دیا۔ وطن یا وطنیت محض ایک عارضی چیز ہے۔ تاریخی حوادث اس کی حدود میں ہمیشہ تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں، اس لئے وہ ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی میکاولی کے اس فلسفہ نے یورپ میں اس قدر رواج پکڑا کہ اس کی ایک مستقل حیثیت قائم ہو گئی۔ آج بھی وہ یورپ کے مفکروں اور سیاستدانوں کے دماغ پر مسلط ہے اور اسی کی بنا پر اقوام یورپ منافشات کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہر ملک کے لئے اس کی متعینہ حدود کی انسانی آبادی سربلندی اور سرفرازی کے قابل ہے اور افراد کا انتہائی نصب العین وطنیت پرستی ہے۔ بین الاقوامی روح کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اقبال نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے ؎

دہریت چوں جامۂ مذہب درید — مرسلے از حضرت شیطاں رسید
آں فلارنساوی باطل پرست — سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
بتگری مانند آذر پیشہ اش — بست نقش تازہ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت — فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد — نقد حق را بر عیار سود زد
طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت — ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشم اہل عالم چیدہ است — مصلحت تزویر را نامیدہ است

"رموز بیخودی"

"اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کے کچھ ہی عرصہ بعد "پیام مشرق" منظر عام پر نمایاں ہوئی۔ "اسرار خودی" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں حقیقت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اور "رموز بیخودی" میں تخیلی عنصر غالب ہے۔ "پیام مشرق" میں شاعر نے حقیقت اور تخیل کا بڑا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ اس پر فارسی کی شیرینی نے وہ اثر کیا ہے کہ "پیام مشرق" کو بجا طور پر دنیا کے بہترین ادبی

شاہکاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شعریت قدم قدم پر موتی لٹاتی ہے اور زبان کی سلاست اور ترنم ریزی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلکش نغمے الفاظ کے پیکروں میں ڈھل گئے ہیں تخیل کے آبدار موتیوں سے تمام کلام مرصع ہے اور زبان کے سحر نے ان کی شان کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ اس لالہ زار کی نکہت آنی جانی نہیں بلکہ دائم و قائم رہنے والی ہے۔ کیونکہ شاعر نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر اس میں رنگ و بو پیدا کیا ہے۔ یہ کتاب گوئٹے کی مشہور کتاب "سلام مغرب" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اقبال نے شروع کے اشعار میں خود کہا ہے ؎

پیر مغرب، شاعر المانوی آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق ماہ تاباں ریختم بر شام شرق

اس مجموعہ کی تمام تصویریں بڑی پیاری ہیں۔ جن میں اقبال نے اپنے موقلم سے بڑی شوخ گلکاریاں کی ہیں۔ اور ہر چند وہ "آرٹ برائے آرٹ" کے نظریہ کا قائل نہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خدا نے اسے شاعر پیدا کیا ہے۔ اس کے افکار کی صورتگری میں شعریت کا دامن کہیں بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور شاعر کا جمالیاتی ذوق ہر تصویر میں جھلکتا ہے۔ "پیام مشرق" میں یہ رنگ اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ اسے رنگ اور لطافت کا دلپذیر مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ جس نے اپنے اظہار کے لئے الفاظ کی شکل اختیار کر لی صوری اور معنوی حیثیت سے اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کا صحیح ادراک کرنے کے لئے روح ادب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ کتاب کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکتہ دان المانوی" اور "بلبل شیراز" کی دو روحوں نے اقبال کے قالب میں جنم لیا ہے۔

کتاب "پیشکش" سے شروع ہوتی ہے۔ جس کے بعد رباعیات ہیں۔

جن میں اقبالؔ نے زندگی، سخت کوشی، خودداری، عقل و عشق اور خودی پر بعض نہایت بلیغ اشعار قلمبند کئے ہیں۔ اور زبان کی نزاکت کے ساتھ عقل اور حکمت کے ایسے ایسے رموز آشکارا کئے ہیں جن سے ان کی وسعت فکر، تازگی تخیل کا پتہ چلتا ہے ان انمول موتیوں میں سے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے، چند گوہر بے بہا کو پیش کرتا ہوں ؎

دمادم نقشہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است — بخاک تو شرار زندگی نیست

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت — شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

زمین خاک در میخانۂ ما — فلک یک گردش پیمانۂ ما
حدیث سوز و ساز ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

دوام ما ز سوز ناتمام است — چو ماہی جز تپیش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل — تپیدن یک دم و مرگ دوام است

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

اگر آگاہی از کیف و کم خویش — یمے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا در یوزۂ مہتاب تا کے؟ — شب خود برافروز از دم خویش

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

سفالم را مئے او جام جم کرد — درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانۂ ریخت — خلیل عشق دیرم را حرم کرد

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور — کہ جان تو ز خود نامحرمی است
قدم در جستجوئے آدمی زن — خدا ہم در تلاش آدمی است

فطرت کی منظر کشی کے بعض حسین نمونے جو "بانگ درا" میں ملتے ہیں، وہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ "پیام مشرق" میں یہ نمونے اور زیادہ دلکش ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں موسیقیت اور ترنم کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے۔ "فصل بہار"، "سرود انجم"، "نوائے وقت"، "نغمۂ سارباں" اور "ساقی نامہ" اس طرز کے بہترین نمونے ہیں جن میں اقبال نے سبک و شیریں الفاظ کی نشست و ترکیب سے دل موہ لینے والی راگنیاں پیدا کی ہیں اور نغموں کے نشاط انگیز انتشار سے کیف آور فضا پیدا کر دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار
مست ترنم ہزار　　طوطی و دراج و سار
بر طرف جوئبار　　کشت گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

خیز کہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید
باد بہاراں وزید　　مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید　　حسن گل تازہ چید
عشق غم نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید
حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزیں
بر لب جوئے نشیں　　آب رواں را ببیں
نرگس ناز آفریں　　لخت دل فرودیں
بوسہ زنش بر جبیں
حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزیں　　"فصل بہار"

ہستیٔ ما، نظامِ ما   مستیٔ ما، خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما   زندگیٔ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما، می نگریم و می رویم

خواجہ ز سروری گزشت   بندہ ز چاکری گزشت
زاری و قیصری گزشت   دورِ سکندری گزشت
شیوۂ بت گری گزشت، می نگریم و می رویم

پردہ چرا؟ ظہور چیست؟   اصلِ ظلام و نور چیست؟
چشم و دل و شعور چیست؟   فطرتِ ناصبور چیست؟
این ہمہ نزد و دور چیست؟ می نگریم و می رویم   "سرود انجم"

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم   در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم   من دردم و درمانم، من عیشِ فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری، مشتے ز غبارِ من   ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ او یک نقش و نگارِ من   خونِ جگرِ مردان سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم۔ من روضۂ رضوانم

آسودہ و سیارم این طرفہ تماشا بین   در بادۂ امروزم کیفیتِ فردا بین
پنہاں بہ ضمیرِ من، صد عالمِ رعنا بین   صد کوکبِ غلطاں بین صد گنبدِ خضرا بین
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم   "نوائے وقت"

ناقۂ سیارِ من   آہوئے تاتارِ من
درہم و دینارِ من   اندک و بسیارِ من
دولتِ بیدارِ من
تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست

دلکش و زیبا ستی　　شاہد رعنا ستی
روکش حورا ستی　　غیرت لیلا ستی
دختر صحرا ستی
تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

نغمۂ من دلکشائے　　زیر و بمش جانفزائے
قافلہ ہا را درائے　　فتنہ ربا فتنہ زائے
اے بہ حرم چہرہ سائے
تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

"نغمۂ ساربان"

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے　　نجوم پرن رست از مرغزارے
لب جو خود آرائی غنچہ دیدی؟　　چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
نواہائے مرغ بلند آشیانے　　در آمیخت با نغمۂ جوئبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را　　نہاد است در دامن کوہسارے
چہ خواہم دریں گلستاں گر نخواہم　　شرابے، کتابے، ربابے نگارے

"ساقی نامہ"

زندگی کے متعلق اقبال کا نظریہ نامی اور وسعت پذیر ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ جمود اور سکون زندگی کی قوتوں کو مردہ کر دیتے ہیں۔ پیہم حرکت میں زندگی کا راز پنہاں ہے اس سے خون تازہ پیدا ہوتا ہے، آرزوئیں ہوتی ہیں اور زندگی میں نمو کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ "پیام مشرق" میں اقبال نے "زندگی و عمل" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھا ہے ؎

ساحل افتادہ گفت　　گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد　　آہ! کہ من چیستم

موج زخود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

زندگی اور موت کی حقیقت کے متعلق اقبال نے ایک بہت ہی بلیغ شعر کہا ہے۔ یعنی خواب کیا ہے؟ ایک ہلکی سی موت، اور موت کیا ہے؟ ایک گہرا خواب ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

زندگی کی آسائشوں کو ڈھونڈنے والی قوم کو جس کے افراد کا میخانۂ حیات خالی ہو چکا ہے اور جس میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں اقبال کا پیام یہ ہے ؎

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
از سر تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز

سوشلزم کے متعلق اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ وہ سرمایہ داری کی موجودہ صورت کو انسانیت کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ انہیں مزدوروں کے ساتھ سچی ہمدردی ہے اور وہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے مؤید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اشتراکیت کے مادی فلسفہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ اس تحریک کی عالمگیری سے پریشان خاطر نہیں ہیں۔ وہ اس جور و استبداد کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں جو قیصریت کے پردے میں مزدوروں پر روا رکھا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں مزدوروں کو ابھرنے کا موقع ملے اور وہ انسانیت کے کسی حق سے محروم نہ رکھے جائیں۔ اپنی نظم "خضر راہ" میں انہوں نے سرمایہ و محنت کے مسئلہ پر اظہار خیالات کرتے ہوئے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت کی تھی اور مزدوروں کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی تھی۔ انہوں نے مزدوروں کو ایک روشن مستقبل کی خوشخبری سنائی تھی۔ "پیام مشرق" میں بھی انہوں نے اس کی ہمنوائی کی ہے ؎

بیا کہ تازہ نوائے تراود از رگ ساز مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

زرہ زنان چمن انتقام لالہ شمیم | بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر انداز یم
بہ طوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے ؟ | ز خویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

اقبال مزدور کے جذبہ غیرت کو ابھار کر اسے موجودہ نظام کو درہم برہم کر دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور اس کی خودداری سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان پرانے بتوں کو مسمار کر کے ایک نئی طرح ڈالے وہ اسے طواف غیر سے آزاد ہو کر اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک اس سرمایہ دارانہ استبداد کا شکار ہو چکا ہے لیکن آخر تا بہ کے ؟ انتقام کی آگ پوری طرح روشن ہو چکی ہے۔ اقبال اسے تیز تر کر دینا چاہتے ہیں۔

" جاوید نامہ" اقبال کا بہترین شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں دماغی اور روحانی کیف کے لئے اچھا سامان موجود ہے۔ اقبال نے کافی عرصہ تک اس کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچا اور پھر اپنے جوش وجدان سے مستفید ہو کر ان نقوش کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا جو اس کی دماغی سطح پر قائم ہو چکے تھے۔ آسکر وائلڈ نے کہا ہے کہ " فن کار کا عمل اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے" جاوید نامہ کو اگر اقبال کی دماغی کاوش کا یگانہ ثمر کہا جائے تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں اقبال نے اپنی قوت تخلیق کا پورا ثبوت دیا ہے۔ اور فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ شعریت کے عنصر کو قائم رکھا ہے" جاوید نامہ" میں اقبال نے پیر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے اور اسی سلسلہ میں مختلف روحوں سے ملاقات کا منظر دکھایا ہے۔ اس کا نقشہ کسی قدر ڈوائن کامیڈی (DIVINE COMEDY) اور دوسری کتابوں سے ملتا ہے۔ مگر اس سے اقبال کی جدت طبعی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس کے تخیل کا اچھوتا پن، انداز بیان کی ندرت اور طرز تحریر کا سحر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ جس کے ساتھ اس کی شاعرانہ عظمت کا دامن وابستہ ہے۔ ڈوائن کامیڈی نے دانتے کو بین الاقوامی شہرت کا مالک بنا دیا۔ اور جدید ترین تحقیقات کی بنا پر یہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی کہ دانتے اسلامی حکمار کے خیالات اور معراج کے واقعات سے بے انتہا متاثر ہوا تھا اس کی

شہرت اپنی جگہ قائم ہے۔ اقبال بھی اپنی اس کتاب کی بدولت صدیوں یاد رکھے جائیں گے اور دنیا ہمیشہ ان کے لازوال کارناموں سے اکتساب فیض کرتی رہے گی۔

"جاوید نامہ" میں موجودہ حالات پر بھی بڑے اہم مباحث موجود ہیں۔ اشتراکیت کے متعلق اقبال کا نظریہ ہم ابھی واضح کر چکے ہیں۔ اقبال کو اس بات سے خوشی ہے کہ اشتراکیت نے قیصریت کے چراغ کو گل کر دیا ہے اور سرمایہ داری کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہاں تک اسلامی نظریہ اشتراکیت بھی اس کا موئد ہے مگر ہر تخریب کے بعد تعمیر کا عمل ضروری ہے۔ ورنہ کوئی کارآمد راہ عمل پیدا نہیں ہو سکتی۔ لا کی تخریب کے بعد الا کی تعمیر ضروری ہے۔ ہم لامحدود نظریوں کے ہجوم میں کھوئے جاتے ہیں۔ اور کسی مستقل نظریہ کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے۔ موجودہ تحریک اشتراکیت کی بے راہ روی اور شورانگیزی کا سبب یہی ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی کلیسا کی نفی، املاک کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی، (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) مسائل زندگی کی نفی، "تدبیر منازل کی نفی" اس نفی کے گرداب میں آج وہ تمام قومیں گرفتار ہیں جنہوں نے اشتراکیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ اگر اشتراکیت میں نفی کے بعد اثبات کے عنصر کو بھی داخل کر لیا جائے تو پھر حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے جو موجودہ بے چینیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا ایک حد تک خاتمہ کرنے والی ہو جائے گی۔ اقبال نے "جاوید نامہ" میں انہی خیالات کو یوں پیش کیا ہے ؎

تو کہ طرح دیگرے انداختی ۔۔۔ دل ز دستور کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیان اندر جہاں ۔۔۔ قیصریت را شکستی استخواں
تا بر افروزی چراغ اندر ضمیر ۔۔۔ عبرتے از سرگذشت ما بگیر
در گذر از لا جانب الا خرام ۔۔۔ در گذر از لا جانب الا خرام (ص ۸۸)

"تمہید آسمانی" میں آسمان کی زبان سے زمین کو جو طعنہ دیا گیا اور اس طعنہ کو سن کر جب زمین خجل ہوئی جاتی تھی تو خدا کی طرف سے تسلی کی یہ ندا آئی ؎

اے امینے از امانت بیخبر — غم مخور اندر ضمیر خود نگر
شستہ از لوحِ جاں نقشِ امید — نورِ جاں از خاکِ تو آید پدید
عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند — عشقِ او بر لا مکاں شبخوں زند

"فلک زحل" میں ایک مقام اقبال نے ان ارواح رذیلہ کے لئے وقف کر دیا ہے جنہوں نے ملک و ملت کے ساتھ غداری کی۔ اقبال نے ان کی انتہائی مذمت کی ہے۔ اقبال نے اس مقام پر جعفر بنگالی اور صادق دکنی کو رکھا ہے جن کی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکہ لگا ہوا ہے۔ یہی وہ غداران ملت ہیں جنہوں نے اپنی ناجائز خواہشات کی بر آری کے لئے سرزمین ہند میں نفاق کے بیج بوئے اور اپنی مذموم حرکات سے اپنی فطرت کے جوہر کو زنگ آلود کیا۔ اقبال نے اسی سلسلہ میں ہندوستانیوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ ایسے ننگ انسانیت انسانوں سے خبردار رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سے ظلمت و ادبار کی گھٹائیں نہیں چھٹ سکتیں جب تک کہ یہ روح ان کے جسم میں موجود ہے اس لئے لکھتے ہیں ؎

کے شبِ ہندوستاں آید بروز؟ — مُرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز
تا ز قیدِ یک بدن وامے رہد — آشیاں اندر تنِ دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا سانہ باز — گاہ پیشِ دیرباں اندر نیاز
دینِ او آئینِ او سوداگری ست — عنتری اندر لباسِ حیدری ست
ظاہرِ او از غمِ دیں درد مند — باطنش چوں دیرباں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کُش است — ایں مسلمانے کہن ملت کُش است

اقبال نے بڑے لطیف انداز میں تمام نام نہاد ملت پرستوں پر نکتہ چینی کی ہے اور انہیں ملت کے نظام میں ایک زہریلا عنصر قرار دیا ہے۔

سعید علیم پاشا کی زبان سے ترک نوجوانوں کو جو پیام دیا گیا ہے وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے جو صراط مستقیم سے ہٹ گئی ہے اور اپنے نصب العین سے ناواقف ہے۔ صحیح راہ عمل کا کام دے سکتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی کھوئی ہوئی سطوت

شوکت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں اور اس مرتبہ پر پہنچ سکتے ہیں جو ان کے شایان شان ہے ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر | در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہان تازہ در آیات اوست | عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است | گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیات خداست | ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش | می دہد قرآں جہانے دیگرش

"جاوید نامہ" کے تین سال بعد "بال جبریل" نکلی اور اس کے ایک ہی سال بعد "ضرب کلیم" نمودار ہوئی۔ "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے فلسفہ خودی کو اجاگر کیا ہے۔ اسرار مرگ و زیست کی عقدہ کشائی کی ہے۔ تہذیب حاضر کا خاکہ کھینچا ہے۔ ہندی مکتب اور ہندی طالب علم کی نبض ٹٹولی ہے۔ سیاسیات مشرق و مغرب پر گہری تنقید کی ہے اور اپنے آئیڈیل مسلمان کے کردار کے نقوش کو چمکا کر دکھایا ہے۔ "بال جبریل" میں فلسفہ زیادہ ہے مگر زبان کی سلاست، پختگی اور شیرینی نے فلسفہ کے چہرہ پر رنگین پردہ ڈال دیا ہے۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کا عنصر قطعاً مفقود ہے۔ لیکن اس کے باوجود دلکشی کے اعتبار سے یہ اپنی جگہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "ضرب کلیم" میں اقبال کا آرٹ رو بہ انحطاط ہے۔ میری رائے میں اگر "ارمغان حجاز" کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کا عنصر مفقود ہونے کے باوجود بعض جگہ سلاست اور پختگی کے اچھے نمونے موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا اشہب قلم ابھی تک اپنی تگ و تاز سے تھکا نہیں ہے اور اس میں جولانی موجود ہے۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کی کمی کی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اقبال کے کلام کو جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے پڑھنے لگے تھے۔ حالانکہ ان کا آرٹ کلیتہً زندگی کے تابع ہے۔ چنانچہ انھوں نے ضرب کلیم کے پیش لفظ میں ناظرین کو تنبیہ کی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ضرب کلیم کے اشعار میں شعریت یا موسیقیت

کے بجائے زندگی اور حقائق زیادہ ہیں۔ اپنے ان پیغاموں کو جنہیں پہلے وہ شعریت کے پردے میں سنا کر لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے اب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر انہیں سیدھا سیدھا بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اسے انحطاط نہیں کہہ سکتے بلکہ ان کے ذہنی ارتقاء کی ایک کڑی۔

"بال جبریل" میں اقبالؔ نے فلسفۂ خودی کو نئے انداز سے بیان کیا ہے اور اسے زندگی کی نشو و نما کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ اقبالؔ کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر شئے اپنے وجود کو اجاگر کرنا چاہتی ہے۔ شعورِ ذات ہی اصل حیات ہے جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے۔ اس سے انسان کی دبی ہوئی طاقتیں بروئے کار آتی ہیں اور ارتقاءِ نفس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہی زندگی کا جوہر ہے اور جب یہ انسان میں پوری طرح نشو و نما پالیتی ہے تو وہ خود اپنی تقدیر کی ہیئت کو بدل سکتا ہے اور خدا کا رازداں بن جاتا ہے۔

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی   ہر ذرہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت   تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا   مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ   کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے   خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات   خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

(بالِ جبریل)

جب انسان کا احساسِ ذات تربیت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس پر ترقی کے لازوال امکانات کھل جاتے ہیں اور وہ دونوں جہاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؎

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

اقبال نے خودی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے لئے فقر ضروری ہے جس سے اس میں اصل قوت پیدا ہوتی ہے ؎

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

اس فقر اور معمولی فقر میں امتیاز بھی اقبال کی زبان سے سنئے ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراث مسلمانی، سرمایہ شبیری

خودی کی تکمیل کے لئے نت نئی آرزوؤں کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک لازوال کھٹک اور کسک کا دل میں رہنا ناگزیر ہے۔ اقبال نے سوز ناتمام کو اپنے فلسفہ کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں جہاں خدا اور شیطان دونوں موجود ہوں ان کا نظریہ ارتقاء تضاد کا پابند ہے۔ وہ جنت کو اس لئے پسند نہیں کرتے کیونکہ وہاں یہ سوز اور دردمندی جو زندگی کی اصل روح ہے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے ایسی متاع گراں مایہ سمجھتے ہیں کہ اس کے آگے شان خداوندی کی بھی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ مقام بندگی میں انہیں یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے ؎

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی — مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

عقل و عشق اقبال کا بڑا دل پسند موضوع ہے جس پر انہوں نے متعدد مرتبہ اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال نے عشق کو ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ عقل سے مراد ظاہری علم ہے۔ جس سے خارجی اشیاء کا ادراک بالواسطہ کیا جاتا ہے۔ عشق سے مراد وہ جذب اندروں ہے۔ جس سے حقیقت کا مشاہدہ بلاواسطہ کیا جا سکتا ہے۔ تصوف میں عشق سے مراد وجدان ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہے۔

انہی دونوں اصطلاحوں یعنی عقل اور عشق کو خبر اور نظر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے ایک جگہ عقل کے متعلق کہا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ عقل کا مشاہدہ محدود ہے۔ اور حقیقت بینی اس کے بس کا کام نہیں وہ زمان و مکان کی حد بندیوں میں محصور ہے اور اس کی پرواز صرف اس عالم رنگ و بو تک محدود ہے۔ اقبال نے "بانگ درا" میں عقل و دل کے عنوان سے ایک نظم میں نہایت دلکش طریقہ سے دونوں کا فرق ظاہر کیا ہے۔ دل عقل سے کہہ رہا ہے ؎

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں

عقل کی محدود صلاحیتوں کی نسبت "بال جبرئیل" اور "ضرب کلیم" میں متعدد اشعار ملتے ہیں۔ حقیقت کے مشاہدہ کے لئے جس جرأت رندانہ کی ضرورت ہے عقل اس سے بالکل تہی دست ہے۔ زمانہ عقل و دانش کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اور اس جنون کو مضحکہ خیز ٹھیراتا ہے جس کی سرحد عقل کے بعد شروع ہوتی ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

عشق کے جرأت رندانہ کی ایک جھلک اس شعر میں دیکھ لیجئے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

اور اس کے مقابلہ میں عقل کی بے بسی اور تنگ نظری بھی ملاحظہ کیجئے ؎

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغ رہگذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے؟
(بال جبریل)

اسی لئے اقبالؔ کی تلقین یہ ہے ؎
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اقبالؔ نے جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق عشق ہی اصل چیز ہے۔ عشق ہی سے وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے راز آشکارا کرتی ہے۔ ارتقائے نفس اور معرفت الٰہی جو انسان کا انتہائی نصب العین ہے اور جسے اقبالؔ نے جگہ جگہ پیش کیا ہے عشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ راہ معرفت میں عقل کی لاچاری صاف عیاں ہے۔ اس راہ میں عشق ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق کسی احتیاط کا قائل نہیں۔ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ منطق اور فلسفہ صرف عقل کے لئے ہیں۔ عشق کا رہنما وجدان ہے جس کے سامنے یہ موشگافیاں بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ زندگی کی صحیح روح کا اندازہ صرف عشق ہی کی وساطت سے لگایا جا سکتا ہے۔ عقل اس معاملہ میں عاجز ہے ؎

عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

علم جو عقل کا نتیجہ ہے باطنی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی نظر سطحی اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔ علم ہمارے ''ذوق آگہی'' کی مکمل تسلی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی تحقیقات ادھوری ہوتی ہیں۔ ''ضرب کلیم'' میں علم اور عشق کے فرق کو یوں دکھایا ہے ؎

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حرام، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

لیکن اقبالؔ عقل کا مخالف نہیں ہے۔ اس کے نزدیک عقل و عشق میں تضاد

نہیں ہے۔ بلکہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جو لوگ اقبال کے کلام میں تضاد کا اعتراض پیش کرتے ہیں انہیں سمجھنا چاہیئے کہ اقبال عشق کو عقل کا انتہائی معراج سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کے باہمی امتزاج سے تمام اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کا حل سمجھ میں آسکتا ہے۔ جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے عشق کی منزل شروع ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں اگر کسی انسان میں ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ کمال انسانیت سے عاری ہے "نگاہ شوق" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھتے ہیں۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا — کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں — نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھکو — ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

(ضرب کلیم)

شاعر عقل سے پورے طور پر سیر ہو چکنے کے بعد خدا سے دعا کرتا ہے ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبال "ملائے حرم" سے بے حد بیزار ہے کیونکہ اس نے مذہب کی صحیح روح کو سمجھے بغیر اس کی محافظت کا دعویٰ کیا ہے اس کے گفتار و کردار میں اقبال کو جو تضاد نظر آتا ہے وہی اس کی نظروں میں سب سے زیادہ کھٹکتا ہے۔ بحث و تکرار اور بدگوئی و غیبت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ اس کے دل میں ایمان کی گرمی نہیں، گفتار میں سوز نہیں، قلب میں حرارت نہیں اور نظر میں وسعت نہیں۔ مسجدیں اس کی احمقانہ گفتگو کے لئے خاص مقام ہیں۔ اس لئے اقبال کا خیال ہے کہ جنت میں باوجود حور و شراب کے اس کے لئے کوئی دلکشی نہیں کیونکہ جنت بحث و تکرار اور لڑائی و فساد کے لئے نہیں ہے۔ "بال جبریل" میں ان ظاہر پرست ملاؤں پر بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ انداز بیان بالکل نرالا ہے ؎

حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت — عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف   خوش نہ آئینگے اسے حور و شراب و لب کشت
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقول   بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا   اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

ان ظاہر پرست ملاؤں کی روح حقیقت کے نور سے تہی ہے۔ ان کی اذان میں کوئی کشش نہیں رہی اور ان میں جذب اندروں باقی نہیں رہا۔ اُن کے دل کے سوتے صداقت سے خشک ہو چکے ہیں۔ "ضرب کلیم" میں ملائے حرم کے عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو   تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال   تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

اقبالؔ مذہب کی ظاہری نمائش سے بیزار ہے وہ گفتار اور کردار میں ہم آہنگی دیکھنا چاہتا ہے وہ فلسفی سے اس لئے نفرت کرتا ہے کیونکہ اس کا دل مردہ ہے۔ صوفی کے اس لئے خلاف ہے کیونکہ اس میں صرف مستیٔ احوال ہے۔ ملاؔ کو اس لئے برا کہتا ہے کیونکہ اس کے یہاں صرف وعظ و نصیحت کی گرما گرمی ہے اس کے یہاں خبر اور نظر میں فساد ہے۔ شاعر کی نواؤں میں صرف مستی ہے، زندگی اور چستی نہیں۔ اس کی ترنگ میں نشہ ہے جو انسان کو عالم خود فراموشی میں پہنچا دیتا ہے۔ حیات اور عمل کا پیغامبر اقبالؔ اسی لئے ان سب سے کنارہ کش ہے کہ وہ انسان کی قوت ارادی کو خواب آور نشہ کے ذریعہ سلا دیتی ہیں۔ ان میں حرکت اور اضطراب کی بجائے جمود اور تعطل ہے۔ سرگرمی کی بجائے سرمستی ہے۔ بیداری کی بجائے خواب ہے۔ اقبالؔ ان سب سے منہ موڑ کر اور ناامید ہو کر ایک مرد مجاہد کا متلاشی ہے جو ایک قلبِ تپاں ایک چشم بینا، ایک خلیلی روح، ایک کلیمی نظر رکھتا ہو۔ "ضربِ کلیم" میں اس نے خود کہا ہے ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال   ملاؔ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق   افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اقبال زندگی کو ایک مسلسل حرکت سمجھتے ہیں جس میں سکون و ثبات نہیں۔ زمانہ ایک قسم کی دائمی گردش ہے۔ موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ یہ صرف ایک منزل ہے۔ حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے اور روح کا ارتقاء برابر جاری رہتا ہے اسے ایک جوئے رواں سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ازل سے ابد تک جاری رہنے والی ہے۔ زندگی کا دھارا ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور زمانہ اس کے بہاؤ کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ تموج کی لہریں اسے ہمیشہ تازہ دم رکھتی ہیں اور اس کی رفتار بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہی ہے۔ اقبال نے اسی تسلسل کے متعلق ایک جگہ بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اس زندگی کے لئے اقبال انقلاب کو لازمی و لابدی سمجھتے ہیں ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

برگساں کا تخلیقی ارتقاء کا نظریہ اقبال کے خیالات سے بہت قریب ہے۔ اس کے نزدیک تغیر و انقلاب کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ حیات ایک مستقل اور مسلسل تخلیق ہے جو بعض مخصوص قوانین اور نوامیس کی پابند ہے۔ برگساں زمانہ کو ایک استمرار یا دوران سے تعبیر کرتا ہے جو دائمی حرکت میں ہے۔ تغیرات کی ایک لڑی ہماری زندگی میں موجود ہے۔ زندگی ایک تخلیقی تحریک ہے جو ہر چیز کو ارتقائی رنگ دے دیتی ہے اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقل سے زیادہ وجدان کی ضرورت ہے کیونکہ علم کا حقیقی سرچشمہ وہی ہے۔ اسی سے نشو و نما کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور زندگی بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ اقبال نے اسی حرکت دوام کے متعلق ایک دوسری جگہ یوں اشارہ کیا ہے ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

سخت کوشی زندگی کا اولین اصول ہے اس سے زندگی کی تزئین و آرائش ہو سکتی ہے ؎

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

"ساقی نامہ" بالِ جبریل کی بڑی مشہور نظموں میں سے ہے۔ اس میں شروع میں اقبال نے بہار کا نقشہ کھینچا ہے جو ادبی مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔ منظر کشی کا ابتدائی انداز جو "بانگِ درا" میں نظر آتا ہے اور جو "پیامِ مشرق" میں اپنے شباب کو پہنچا۔ "بالِ جبریل" میں اور زیادہ حسین اور دلکش ہو کر سامنے آگیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی!
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ڈاکٹر اقبال مغربی تہذیب کے بڑے اچھے مبصر ہیں عموماً جو لوگ اس پر تبصرہ کرتے ہیں ان کے یہاں تعصبات زیادہ کام کرتے ہیں۔ اس لئے وہ گہری تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اور اساسی حقائق تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ قیامِ یورپ کے زمانہ میں اقبال نے یورپی تہذیب کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور چونکہ انہوں نے خود اسے برتا تھا اس لئے ان کی نظر میں اس کی تمام کمزوریاں نمایاں ہو گئیں۔ انہوں نے خود کہا ہے ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

وہ اس تہذیب کی مادیت سے بیزار ہیں ان کا خیال ہے کہ جس تہذیب کی سرشت میں مادی عناصر ہوں گے وہ کبھی ہماری زندگی میں توازن اور ہم آہنگی

نہیں پیدا کر سکتی۔ انہیں مغربی تہذیب پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں صرف "عقل فسوں پیشہ" پر زور دیا گیا ہے۔ دماغی نشوونما کے پہلو بہ پہلو وہ دل کی تربیت پر بھی زور دیتے ہیں زندگی کی اعلیٰ اقدار اور مقاصد کا تعیّن صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک میں اقبالؔ کو دل کی موت کے سامان نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب نے جس معاشرتی نظام کی بنا ڈالی ہے اس میں بے ربطی، انتشار اور اضطراب کے سوا اور کچھ نہیں ؎

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے	مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا

"ضرب کلیم" میں مغربی تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں ؎

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب	کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید	ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

وہ اس تہذیب سے پیدا شدہ نظام معاشرت کی بھی دھجیاں اڑا دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اس نے انسانیت کے ارتقا میں رکاوٹیں ڈال دی ہیں۔ علم و ہنر کی روشنی کے باوجود یورپ میں زندگی کا شعلہ سرد پڑا ہوا ہے۔ دماغ روشن و براق ہیں مگر دل تیرہ و تار، زبانوں پر آزادی اور مساوات کے نغمے ہیں۔ مگر ہر طرف فرنگی مدنیت نے نظام زندگی کو درہم برہم کر رکھا ہے اس انتشار اور بدنظمی کی وجہ یہ ہے کہ اس تہذیب کے پیچھے کوئی زبردست اخلاقی و روحانی طاقت نہیں ہے جو اعتدال کا راستہ پیدا کر کے قلب و نظر میں ہم آہنگی اور مطابقت قائم کرے۔ وہاں کوئی ایک نصب العین نہیں جس سے افراد کی زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہو۔ ہر ایک کی راہ الگ ہے۔ بلند تر انسانیت کا کوئی نظریہ ان کے سامنے نہیں۔ جس کے حصول کی طرف تمام افراد کی کوششیں مرکوز ہوں۔ ان کے افعال کو پرکھنے کے لئے کوئی کسوٹی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی تمام قوتیں تعمیر کی بجائے تخریب میں مصروف ہیں اور کسی نتیجہ پر منتج ہونے کی بجائے لہو و لعب

پر صرف کی جا رہی ہیں۔ "بال جبریل" میں اقبال نے کہا ہے ؎

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

"عہد حاضر کے انسان" کے متعلق "ضرب کلیم" میں چند بہت بلند اشعار کہے ہیں ؎

"عقل ناپید و خرد می گزدش صورت مار" — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

"افرنگ زدہ" کے عنوان سے ایک نظم میں تنقید کا پیرایہ بالکل مختلف ہے ؎

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود — مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

"ضرب کلیم"

اقبال موجودہ تہذیب کے اس خیال کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ کہ مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اسلامی نظریۂ سیاست کے موید ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاست کو سیدھے راستہ پر رکھنے کیلئے مذہب کی باگ ڈور ضروری ہے۔ مذہبی اور اخلاقی قیود انسانی افعال کو انتہا پسندی اور بے جا تشدد کی طرف مائل ہونے سے بچائے رکھتی ہیں۔ سیاست قوت کے اعتدال اور تنظیم کا نام ہے لیکن اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ بازیگری ہو جاتی ہے اور اقتدار و غلبہ کی خواہش سے مجبور ہو کر انسان بہت سی ایسی حرکات کر گزرتا ہے جو کسی طرح بھی جائز و محمود نہیں کہی جا سکتیں۔ ہر نظام سیاست کو اجتماعی زندگی کی

ایک مضبوط قوت بنانے کے لئے ایسی پابندیاں ضروری ہیں۔ ورنہ یہی حالت چنگیزیت میں بدل جائے گی۔ موجودہ "لادین نظریۂ سیاست میں" اقبال مستقبل کی تاریک تصویر کو صاف دیکھ رہے ہیں اور اسی لئے انھوں نے واضح طور سے کہا ہے ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

موجودہ سیاست لادین کے متعلق کہتے ہیں ؎

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں　　کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد　　فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

"دین وسیاست" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے اسلامی اور مسیحی نظریہ سیاست پر اظہار خیال کرتے ہوئے موجودہ نظریہ پر کاری ضرب لگائی ہے اور دین وسیاست کی دوئی کو "چشم تہذیب حاضر کی نابصری" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ان دونوں عنصروں کو علیحدہ کر دیا جائے تو نتیجہ تباہی کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ اقبال تہذیب حاضر کے شیدائی کو اسلامی نظریہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس نے ان دونوں عناصر کو ملا کر ایک بہترین امتزاج پیدا کیا ہے ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی　　سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں　　کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا　　چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
دوئی ملک ودیں کے لئے نامرادی　　دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا　　بشیری ہے آئینہ دار نذیری

(بال جبریل)

اقبال مبتدی مکتب سے بہت مایوس ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم نے جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہے غیر شعوری طور سے پورے نظام زندگی کو جامد، پُرسکون اور بے روح بنا دیا ہے۔ زندگی میں کوئی وسعت نہیں

نہیں رہی۔ دماغوں سے جدت اور قوت تخلیق کا مادہ ختم ہو گیا۔ اور انفرادی زندگی کی تمام اُبھرنے والی قوتیں کمزور ہو کر رہ گئیں۔ ایسے ماحول میں مفکر اور جدت پسند شاعر اور ادیب کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ اور اقبال کا پیغام اس فضا کے لئے کیسے سازگار ہو سکتا ہے۔ اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں اور جہاں وہ دوسروں کو بھی لے جانا چاہتے ہیں اس کا ادراک ہندی مکتب کے ان اصولوں کی نظر کہاں تک کر سکتی ہے؟ وہ اس کی نواؤں کی تاب کہاں لا سکتے ہیں؟ احساس ذات اور شعور نفس کا یہاں کیا گزر؟ اور خودی کی نشو و نما کے مقالات کس طرح ایسے مکتب کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتے ہیں ؎

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

اقبال موجودہ نظام تعلیم کے خلاف اپنی زہرفشانی سے تھکتے نہیں کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے کس طرح سے پوری قوم کی زندگی کو تباہ کر دیا ہے اور ان کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو بے کار بنا دیا ہے۔ اس نوع کی تعلیم نے نوجوانوں کی شخصیت کو مسخ کر دیا ہے اور ان کی زندگی کے آئندہ تمام امکانات خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے حصول کا جذبہ جو صحیح تعلیم کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے فکر معاش نے مردہ کر دیا ہے۔ وہ اس ذہنی اُپج، تیزیٔ ادراک اور جوش وجدان سے محروم ہو گئے ہیں۔ جن کی بدولت وہ اپنی فطرت کی پوری بلندی تک پہنچ سکتے ہیں اور جس سے ان کی شخصیت کا پورا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نظام تعلیم ان کی تاریخی روایات، قومی نفسیات اور روحانی ضروریات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور ان کے نرم و نازک دماغوں کو ایک غیرمانوس اور غیرطبعی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اعتماد، یقین اور وثوق کے بلند جذبات جو کامیابی کے لئے لابدی ہیں اُن کے دماغوں سے محو ہو گئے ہیں۔ زندگی میں کوئی سوز حرارت اور گرمی نہیں اور سخت کوشی کی جگہ عیش پسندی کا

دکر دورہ ہے ؎

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھدی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ان مکتب سے نکلے ہوئے طالب علموں کی حالت یہ ہے ؎

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ!

اقبال کو ان کی حالت پر سخت افسوس ہے، ایک نوجوان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

ان کے لئے اقبال کی دعا یہ ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اور اس کا پیام یہ ہے ؎

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

"فرمان خدا" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے مزدوروں کی حمایت میں بڑے سہانے گیت گائے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر مزدور کے مستقبل کا تابناک چہرہ دکھایا ہے وہ اب "پیران کلیسا" کے استبداد کو ٹھکرا سلطانی جمہور کا جھنڈا نصب کر دینا چاہتا ہے اور قیصریت کے

اس طلسم زار میں اپنی پر شوکت آواز بلند کر کے مزدور کو دلاسا دیتا ہے۔ اسے غریبوں کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے جتنی کسی بڑے اشتراکی کو ہو سکتی ہے۔ وہ ان کے لہو میں یقین اور اعتماد کا سوز پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی ہستی کا ادراک کر سکیں اور اپنے آپ کو اونچا ہوتے دیکھیں ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

(بالِ جبریل)

اقبال کی نظم "شعاعِ امید" میں ہمیں ایک بار پھر "ترانۂ ہندی" اور "شوالہ" کے نوجوان کی تصویر نظر آتی ہے جس میں وہ جوش اور گرمی تو نہیں جو اس زمانہ شاعری کے ساتھ مخصوص ہے البتہ پختگی سلاست اور بیاض کا رنگ ٹپکتا ہے۔ جس سے ایک کہنہ مشق شاعر اور محبِ وطن کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ جس احساس نے اقبال سے "بانگِ درا" کی وہ نظمیں کہلائی تھیں وہ اب بھی باقی ہے، البتہ ذہنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تدریجی ارتقا ہوتا گیا پہلے اقبال وطن کے لئے بے تاب تھا اور وطن ہی میں اس کے لئے سب کچھ تھا۔ حبِ وطن کا جذبہ اب بھی باقی ہے بلکہ زیادہ پختہ ہو گیا ہے۔ مگر پہلے وطنیت مقصود بالذات تھی۔ اب بین الاقوامیت کعبۂ مقصود ہے جس میں حبِ وطن منطقی طور سے شامل ہے کیونکہ کُل میں جزو ہمیشہ شامل ہوتا ہے پہلے وہ وطن کی محبت میں سرشار تھا اور اسے تمام فضا میں یہی سرزمین نظر آتی تھی۔ اب بھی اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اب اس کی نگاہ زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ پہلے اس

نے جغرافیائی حد بندیوں میں اسے محصور کر دیا تھا۔ مگر اب اس نے خود یہ خبریں مٹا ڈالی ہیں اور ان کی بنیاد تاریخی واقعات اور طبعی حالات پر رکھی ہے لیکن اس کے بین الاقوامی نغموں پر کسی محدود ذہنیت کا پابند ہونے کا الزام لگانا سراسر ظلم ہے۔ جس کے لئے کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا۔ بھارت ماتا کے وسیع میدانوں، لمبے لمبے دریاؤں، زرخیز وادیوں، سورج کی تابناک شعاعوں، اونچے پہاڑوں اور حسین منظروں کو دیکھ کر اس کے دل میں اب بھی کیف و سرور کی موجیں اٹھتی ہیں۔ اس کی تاریخی روایات پر اب بھی فدا ہے۔ اس خاک سے جو سپوت اُٹھے ہیں اور جن کے علم و فضل کے کارناموں نے شہرت دوام حاصل کی ہے ان کے لئے اس کے دل میں اوروں سے زیادہ احترام اور عظمت موجود ہے اس کا سینہ اب بھی اپنے وطن کا نام سن کر پھول جاتا ہے اور وہ اُس کی سر بلندی، یکجہتی اور قوت کا دل سے متمنی ہے۔

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور — آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہانتاب
چھوڑوں گی نہیں ہند کی تاریک فضا کو — جبتک نہ اُٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی — جن کیلئے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اس پُر شوکت نظم کا ہر شعر اقبال کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ جس سے اس کے قلب کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نام نہاد قوم پرستوں کی نگاہ میں اقبال کے حجازی نغموں میں ہندی کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اس کا دل حب وطن کے جذبات سے خالی ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور اقبال کے جذبات میں خلوص کی تابناکی کہاں تک نمایاں ہے۔

— اقبال نے اپنے آئیڈیل مسلمان کا جو تصور پیش کیا ہے، اس سے ان کی تعلیمات

کا خاکہ ذہن میں آجاتا ہے وہ عام انسانوں سے بلند ضرور ہے مگر مافوق الفطرت نہیں۔ اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں پائی جائیں گی جو زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ وہ اپنی سرشت میں یگانہ ہوگا اور اس کا کردار تمام انسانوں کے لئے نمونہ کا کام دے گا۔ ایمان، خودی، عمل و سخت کوشی اور عالمگیر اخوت کے اصول پر اس کی تمام زندگی کا دارومدار ہوگا۔ اقبال کا یہ مردِ مومن نطشے کے "فوق البشر" سے مختلف ہوگا۔ نطشے نے اپنے "فوق البشر" کا ان الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے:-

"زمانہ آئندہ کا یہ مردِ میدان جو مستقبل بعید میں ظاہر ہوگا اور زندگی کا کامل منظہر ہوگا۔ ہمیں موجودہ نصب العین اور اس کے نتائج سے آزادی دلائے گا اور ان قوتوں کو فنا کرنے والا ہوگا جو زندگی کے خلاف مصروفِ عمل ہیں وہ اپنے ساتھ ایک انقلاب عظیم لائے گا۔ جس کی بدولت دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوں گی جو ہماری قوت ارادی کو آزادی عطا کرے گا اور کائنات کو اس کے صحیح مقام پر قائم کرے گا۔ بنی نوع آدم کے اندر بہتر ین تمنائیں پیدا کرے گا۔ وہ مسیحیت کا مخالف اور تباہ کرنے والا ہوگا اور کائنات کی حقیقت کو ظاہر کرے گا۔

اقبال اور نطشے دونوں کے نزدیک یہ مادی دنیا خودی کی جدوجہد کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ وہ دونوں مسیحی فلسفہ اخلاق کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ فلسفہ خودی کو کمزور کر دیتا ہے اور رہبانیت کی تعلیم دے کر تمام خداداد صلاحیتوں کو برباد کر دیتا ہے۔ اقبال بھی نطشے کی طرح منظہر قوت کا دلدادہ ہے اس کے نزدیک کمزوروں کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ جب کبھی اور جہاں کہیں قوت دیکھتا ہے اس کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ "خواہش اقتدار" کو کائنات کی بنیادی حقیقت سمجھتا ہے۔ اور اسی لئے اس کا پیام زندگی اور قوت کا حامل ہے۔

اقبال کے "مردِ مومن" کے مزاج میں سختی اور نرمی دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ اس کے ہاں جلال بھی ہے جمال بھی، توانائی بھی اور حسن بھی، لیکن نطشے کا "فوق البشر" اگر

وہ کبھی پردۂ کائنات پر ظاہر ہو گیا تو یقیناً ظالم اور سنگدل ہو گا۔ اقبال کے "انسان کامل" کے سامنے خدا کی ذات موجود ہے اور چونکہ وہ غیر محدود ہے اس لئے اس کی ترقی کے امکانات بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ نطشے کا "فوق البشر" اپنی ذات میں محدود ہے۔ اس کے سامنے کوئی مطمح نظر نہیں چونکہ وہ خدا کے وجود کا قائل نہیں، اس لئے اس کی کوششوں کا میدان بہت تنگ ہے۔ اقبال کے مردِ مومن کے تصور میں عبدالکریم جیلی کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے "ضرب کلیم" میں انہوں نے مردِ مومن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امین بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا، صفت سورۂ رحمان

"مدنیت اسلام" کے عنوان سے ایک نظم میں اس نقش کو یوں پیش کیا ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے ؎ — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب — یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال — عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

"ضرب کلیم" میں اقبال نے آرٹ کے نظریہ کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ آرٹ برائے آرٹ کے نظریہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ جو ادب محض جمالیاتی ذوق کی تسکین کرے۔ وہ ہماری زندگی کی قوت محرکہ نہیں بن سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب دماغی کیف کے لئے ضروری ہے۔ اور اس میں اس ضرورت کو پورا کرنے

کا سامان موجود ہونا چاہیئے - لیکن جو ادب محض رنگ و بو کا مجموعہ ہو اور محض دماغی تعیش کا سامان مہیا کرے وہ ہمیں "ذوقِ عمل" اور "ذوقِ تپش" سے محروم کر دیتا ہے جو اصل روحِ حیات ہیں - جن نغموں میں مستی کے ساتھ چستی نہ ہو وہ ہماری زندگی کو تقویت پہنچانے کی بجائے اسے کمزور کر دیتے ہیں - اقبال اسی لئے حافظ کے مخالف ہیں - کیونکہ حافظ کی غزلیں پڑھ کر عموماً نوجوان کاہلی عیش اور بے راہ روی کے شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت کی شاہراہ سے ہٹ کر مجاز کی گلی میں ہو لیتے ہیں - جس سے ان کی زندگی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں "دیوانِ حافظ" کے مطالعہ کی ممانعت کر دی گئی تھی اقبال ایسا ادب چاہتے ہیں جو نوجوانوں میں تازگی اور تنومندی پیدا کرے انہیں زندگی اور عمل کے لئے اکسائے اور ان کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے - انکے نزدیک آرٹ میں جمال اور جلال دونوں کا امتزاج موجود ہونا چاہیئے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی کمی ہمارے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے -

دلبری بے قاہری جادوگری است　　　دلبری با قاہری پیغمبری است

انہوں نے ایک جگہ نہایت صاف الفاظ میں اپنے مفہوم کو واضح کیا ہے لکھتے ہیں -

بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر قوت ارادی کو بیدار کر دے - تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں - وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں - جو ہمیں ان حقائق گرد و پیش سے غافل کر دیں - جن کے حصول پر زندگی کا انحصار ہے - وہ دراصل بربادی اور موت کا پیغام ہیں - آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی قوت پھونکے نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکر طاری کر دے - جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے وہ نادانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں - ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں -

خودفروزی کہ فرنگ داد مارا　　ہمہ آفتاب لیکن اثر ضیا نہ دارد

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے ؎

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے　　یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں　　جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

"ضرب کلیم"

اقبال آرٹ کے حیاتیاتی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ اور "آرٹ برائے زندگی" کے نظریہ کے قائل ہیں مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود ان کے آرٹ میں حیاتیاتی اور جمالیاتی دونوں عنصر ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور اور موثر ہیں۔

"ارمغان حجاز" اقبال کی آخری تصنیف ہے۔ جس میں شاعر نے دریائے خیال کو بڑے سلیقہ کے ساتھ شعر کی لڑیوں میں پرو دیا ہے مگر یہ ایک چابکدست مصور کی موقلم کے آخری نقش ہیں جن میں پختگی زیادہ اور تابناکی کم ہے۔ اس مجموعہ میں اقبال کا آرٹ ایک حد تک زوال پذیر ہو گیا ہے اور قلم کی ہر جنبش میں تھکن اور بے کیفی کے آثار نمایاں ہیں۔ ہر شاعر اور ادیب کا اشہب قلم ایک خاص بلندی تک پرواز کرتا ہے جس کے بعد اس میں وہ ندرت اور تازگی نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح اقبال کے ہاں جو تازگی تخیل "جاوید نامہ" اور "بال جبرئیل" میں ہے وہ "ارمغان حجاز" میں بالکل نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی یہ تصنیف شعر و سخن اور خیالات کا کوئی کم وقعت مجموعہ ہے بلکہ کہنا صرف اس قدر ہے کہ آرٹ کی وہ بلندی جو "بال جبرئیل" میں ہے "ارمغان حجاز" میں دب کر رہ گئی ہے جہاں تک زندگی کے حقائق کا تعلق ہے اقبال کا ہر شعر اپنی جگہ مستقل چیز ہے اور اس کی اہمیت لازوال ہے" ارمغان حجاز" میں کم و بیش انہیں مضامین کو دہرایا گیا ہے۔ جو ہمیں "بال جبرئیل" اور "ضرب کلیم" کے صفحات میں نظر آتے ہیں۔ خودی، فقر و عشق، ملائے حرم، تہذیب حاضر، مکتب، زمانہ حاضر کا مسلمان اور اشتراکیت پر بڑے اچھے خیالات ملتے ہیں

اور حالات حاضرہ پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔جن سے اقبال کی بالغ نظری ، عمق فکر اور وسعت مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے ۔

"ارمغان حجاز" میں ہمیں اس بڑے مفکر کے آخری پیغام کے نمونے ملتے ہیں اور اس میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی، شخصی اور ملی زندگی کے لئے ایک ایسا نصب العین اور لائحہ عمل موجود ہے جو اُن کی پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے ۔اقبال کا سب سے اہم پیام جسے انہوں نے شروع سے آخر تک مسلمانوں کے سامنے پیش کیا وہ یہی تھا کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کریں تاکہ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کر سکیں اُن کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سبب یہی ہے ۔کہ وہ خود اپنی ہستی سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ ممکنات زندگی کی کس قدر قوتیں ان کے اندر پوشیدہ ہیں ۔انہیں اگر شعور ذات کا احساس ہو جائے تو وہ روحانی اور اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے جد و جہد میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔چنانچہ کتاب کے شروع میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

دل تو داغِ پنہانے نہ دارد — تب و تاب مسلمانے نہ دارد
خیابانِ خودی را دادہ آب — ازاں دریا کہ طوفانے نہ دارد

آگے چل کر مسلمانوں کی حالت زار پر یوں اظہار خیال کیا ہے ؎

آتی ہے دم صبح صدا عرش بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک ؟
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک ؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار — کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک ؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک ؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں — نے گرمی افکار ، نہ اندیشۂ بیباک ؟
روشن تو وہ ہوتی ہے ، جہاں بیں نہیں ہوتی — جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگۂ پاک ؟
باقی نہ رہی تیری آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری ؟

مسلمان کی شان تو یہ تھی ؎

حدیث بندہ مومن دل آویز　　جگر پر خوں، نفس روشن، نگہ تیز!
میسر ہو کسے دیدار اُس کا　　کہ ہے وہ رونق محفل کم آمیز!

مگر ملائے حرم نے اسے موجودہ حالت تک پہنچا دیا۔ اسی "ملائے حرم" کے متعلق اقبال کا خیال ہے۔

ز من بر صوفی و ملّا سلامے　　کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت　　خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

عقل کی ناتوانی اور عشق کی پختہ کاری کے متعلق ایک رباعی میں کہا ہے ؎

خرد، عقل و خرد کی ناتوانی　　نظر دل کی حیات جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز　　سزاوار حدیث لن ترانی

"عصر حاضر" کے کمالات ذہنی اور مدارج ترقی کے متعلق بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد　　ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصر حاضر　　کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

اور مغربی تعلیم اور مکتب کی کور ذوقی، تنگ نظری اور محدود مشاہدہ کے متعلق اپنے حکیمانہ انداز بیان میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے ؎

تب و تابے کہ باشد جاودانہ　　سمند زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب　　کتاب و مکتب افسون و فسانہ!

اشتراکیت اور اسلام کے موضوع پر بھی بڑے دلپذیر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر اسلامی معیشت کے اصول آشکارا ہو گئے تو پھر اشتراکیت کا چراغ بہت جلد گل ہو جائے گا۔ مگر مسلمان ابھی تک الٰہیات کی گتھیاں سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے زمانہ کی روش کو ابھی نہیں پہچانا ہے۔ اقبال اسلامی اصول میں موجودہ دنیا کی اقتصادی اور سیاسی پریشانیوں کا علاج دیکھتے ہیں۔

"دختران ملت" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے مسلمان لڑکیوں کو جن پر مغربی سحر

کا اثر آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔ بڑا روح پرور پیام دیا ہے۔ جس پر عمل کر کے وہ زندگی میں بہت اہم ذمہ داریوں کو پورا کر سکتی ہیں۔ اور ملت اسلامیہ کی دا ماندہ رگوں میں خون حیات دوڑا سکتی ہیں۔ انہیں مغربی تمدن سے تابانی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے ان کے سامنے ایک مکمل پروگرام پیش کر دیا ہے۔ جو ان کی زندگی کے دھارے کو صحیح راہ پر لگا سکتا ہے۔

ضمیر عصر حاضر بے نقاب است — کشاوش در نمود رنگ و آب است
جہاں تابی ز نور حق بیاموز — کہ او با صد تجلی در حجاب است
ز شام ما بروں آور سحر را — بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو میدانی کہ سوز قرأت تو — دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اسی میں آئندہ نسلوں کی صحیح تربیت کا طریقہ ہے۔ اسی میں ملت کی سربلندی کا راز مضمر ہے!

اقبال کی تصانیف پر جو اظہار خیال ہم نے صفحات ماقبل میں کیا ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کا تخیل کس طرح مختلف وادیوں میں سے ہوتا ہوا اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ شروع میں جس افتاد طبیعت کے نقش "بانگ درا" میں نظر آتے ہیں، وہی جلد اُجاگر ہو کر دوسری تصانیف میں زیادہ رعنائی و زیبائی کے ساتھ نمایاں ہو گئے ہیں۔ خیالات کے مختلف دھارے جو شاعر کے ذہنی نشوونما اور مختلف معاشرتی، سیاسی اور تمدنی تحریکوں سے اثر پذیر ہوئے، ہم آہنگی، ہمواری اور تسلسل کے ساتھ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تخیل کی گہرائی اور پختگی اور انداز بیان کی جدت ہر آنے والی تصنیف میں پہلی تصنیف سے زیادہ قوت کے ساتھ نمایاں ہے مگر زبان کا حسن ہر جگہ اپنی جلوہ ریزی کر رہا ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے فلسفہ اور شعر کو اس طرح سمویا کہ ان کے امتزاج سے ایک ایسی بلند چیز پیدا ہو گئی۔ جو فلسفہ اور شعر دونوں سے فزوں تر ہے۔ خودی۔ فقر اور عمل اقبال کے پیام کا نچوڑ ہے۔ انہی تینوں چیزوں کو انہوں نے رنگا رنگ انداز میں پیش کیا ہے جس

سے ہر مرتبہ ایک نئی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال نے رومی، نطشے اور برگسان کے خیالات پر اپنے فلسفہ کی بنیادیں اٹھائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ان تینوں فلسفیوں کے خیالات سے بے انتہا متاثر ہوا ہے۔ مگر اس کے فلسفہ کی حسین وادیاں سرزمین حجاز کے دریاؤں کی آبیاری کی ممنون احسان ہیں اور اس کے کشت زار شاعری کی بہار انہی کے فیض سے وابستہ ہے اس کے مضراب کے تاروں میں سے وہی حجازی نغمے نکل رہے ہیں۔ ساغر عجمی ہی مگر بادہ کہن وہی ہے جس میں کھجور کا افشردہ ملا ہوا ہے۔

بحیثیت ایک آرٹسٹ کے بھی اقبال کا پایہ بہت بلند ہے۔ آرٹ کے بعض بہترین نمونے "بانگ درا" کی نظموں میں ملتے ہیں۔ "اسرار و رموز" اور "پیام مشرق" اور "بال جبرئیل" میں وہ اور زیادہ جاذب توجہ ہو گئے ہیں۔ شاعر کی قوت فکریہ اور جوش بیان جو اس کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہیں اشعار میں صاف نظر آتے ہیں۔ کارلائل کے نظریہ کے مطابق اگر یہ کہنا درست ہے کہ "ہر شخص کی تحریر میں اس کی شخصیت کا رنگ جھلکنا چاہیئے"، تو اقبال اپنی نظموں میں آسانی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر انہیں پہچاننے اور سمجھنے کے لئے خیال اور نظر کے درمیان سے تمام رنگین پردوں کو اٹھا دینا ہوگا اور اس کے لئے گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ ان کے قلم کی ہر جنبش میں لطیف ترنم اور دقیق نکتہ سنجی کے متضاد عناصر کے ساتھ حیات نو کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس میں حرکت اور زندگی ہے۔ تعطل اور سکر نہیں۔ اقبال نے فلسفہ اور شاعری میں خیالات کی جو طرحیں ڈالی ہیں اور اپنی غیر معمولی فنکارانہ قوت سے کام لے کر جو گلکاریاں کی ہیں انہوں نے شاعر کی شخصیت کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ (۱۹۴۱ء)

بشیر احمد

اقبال اور فلسفۂ خودی

خویش را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
(اقبال)

علامہ اقبال کی وفات حسرت آیات سے دنیائے ادب کو بالعموم اور ہندوستان کو بالخصوص جو صدمہ اٹھانا پڑا۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ مغرب کے مادیات کے مقابلہ میں آپ مشرق کے تصوف و روحانیت کے علمبردار تھے۔

حقیقت میں ان کا کلام تمام نوع بشر کے لئے ہے۔ لیکن انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ مغلوب قوم یا فرد سے ہمیشہ اسے ایک گونہ ہمدردی سی ہو ہوجاتی ہے۔ ان ایام میں مشرقی اقوام عام طور پر رو بہ تنزل ہی رہیں۔ مشرق کے اس سیاسی۔ روحانی اور اقتصادی انحطاط کو دیکھ کر اقبال نے اپنے کلام میں مشرقی اقوام ہی کو مخاطب کیا۔

علامہ اقبال کے کلام کا ایک مستقل موضوع ان کا فلسفۂ خودی ہے۔ دورانِ گفتگو میں اپنے احباب کے سامنے انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اسلامی فلسفہ میں اگر کچھ میں نے اضافہ کیا ہے تو وہ انسانی خودی کے تکمیل وارتقا پر زور دینا ہے۔ علامہ اقبال کا خیال تھا۔ کہ یہ خودی کا نظریہ کوئی نیا نہیں۔ کیونکہ قرآن پاک میں بھی انسانی خودی کے عنصر کو بیان کیا گیا ہے۔

خودی عبارت ہے۔ انسان کے روحانی عروج ذاتی ارتقا اور نفس کی خودداری سے۔ درحقیقت علامہ کی تمام شاعری اسی ایک لفظ کی توضیح و تعبیر ہے۔ وہ بار بار اسی تار کو چھیڑتے نظر آتے ہیں۔ گویا کوئی دوسرا نغمہ ان کے

لئے کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتا ۔ وجہ شاید اس کی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے مشرق کو اس نکبت و پستی سے ابھارنے کے لئے یہی پیغام موزوں ہو سکتا ہے ۔ جس کا زیادہ مقصد دعوتِ عمل اور تزکیۂ نفس ہے ۔

انسان کی خودی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے ۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اس کی تکمیل میں جدو جہد کرے ۔ کیونکہ اس کی تکمیل سے ہی انسان اپنی ممکنات اور صلاحیتوں کو معرضِ ظہور میں لا سکتا ہے ۔ اور اس کائنات کے تعمیری کام میں ہاتھ بٹا سکتا ہے ۔ اس کائنات کے ارتقا کا سلسلہ جاری رہے گا ۔ اور کسی حد تک ہر انسان کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط پیدا کر سکتا ہے ۔ لہذا ہر انسان میں قوتِ تخلیق ہونی چاہئے ۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
(اقبال)

اقبال کا خیال ہے کہ خودی ہی سے نظامِ عالم جاری ہے اور صحیح تکمیل خودی کے مستحکم کرنے سے ہی ہوگی ۔

خودی کے استحکام کے لئے اوّل تو ہمارے دل میں بلند مقاصد اور رفیع نصب العین ہونے چاہئیں ۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

خودی کی تکمیل کے سلسلہ میں علامہ اقبال عقلِ انسانی کے مقابلہ میں عشق کو رہبر اختیار کرنے کا درس دیتے ہیں ۔ عقل ایک شے کی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے سکتی ہے ۔ لیکن عشق با وجدان کلی حقیقت کو یکجا دیکھ لیتا ہے اور جس طرح مولانا رومیؒ عشق کی بابت لکھتے ہیں

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما | اے دوائے جملہ علتہائے ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما | اے طبیبِ نخوت و ناموسِ ما

علامہ اقبال بھی عشق کو ہی تکمیل خودی کی اہم ترین شاہ راہ بتاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار سے یہ خیال کافی طور پر واضح ہو جائے گا ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است | زیر خاکِ ما شرار زندگی است
از محبت می شود پاینده تر | زنده تر سوزنده تر تابنده تر
زندگی را شرع و آئین است عشق | اصل تہذیب است دیں دین است عشق
کوہ پیشِ عشق چو کاہے بود | دل سریع السیر چوں ماہے بود

لیکن آخر عقل اور اس کے نتائج کو اس طرح رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فرانس کے مشہور فلسفی برگساں نے عقل اور عشق میں جو بے نظیر امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال بھی ایک حد تک اُس کے پیرو نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ عقل اور عشق کے اس فلسفیانہ مسئلہ کی مزید توضیح اس جگہ ممکن نہیں۔ قارئین کرام کو علامہ کی انگریزی کتاب ”چھ لکچر“ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ عقل انسانی عشق یا وجدان کے مقابلہ میں ایک کم درجہ کی چیز ہے۔

عشق سے مراد کسی کامل ہستی کی پوری پوری تقلید سے ہے۔ عاشق کو اپنے اندر وہ تمام اوصاف جمع کر لینے چاہئیں جو کہ اُس کامل ہستی میں پائے جاتے ہیں۔ یوں بھی کسی حقیقت تک پہنچنے کے لئے صوفیۂ کرام نے یہی طریقہ بتایا ہے کہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کرنی چاہئیں۔ چنانچہ مولینا رومی فرماتے ہیں۔ ؎

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

اس وقت کہ ہمارے دل میں بلند مقاصد موجود ہیں تو ہمیں عشق کی رہبری میں اُن مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر وہ مقاصد یوں ہی رہے تو عبث ہیں۔ جب تک ہمارے بلند نصب العین عملی صورت اختیار نہ کریں وہ بالکل بے سود ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

زندگی نام ہے دائمی جد وجہد کا۔ ہم کبھی بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب مقام یا منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ اب ہم کو زندگی کی کشاکش سے کچھ دیر آرام کر لینا چاہیئے۔ علامہ کے نقطۂ نظر سے تو منزل کوئی بھی نہیں ؎

ز جوے کہکشاں بگذر ز نیل آسماں بگذر
ز منزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

اور جو شخص حیاتِ انسانی کی جد وجہد سے گریز کر کے راہبانہ زندگی اختیار کرتے ہیں اقبال ان کے سخت مخالف ہیں ؎

بچشمِ مردہ دلاں کائنات زندانے است
دو جام بادہ کشیدند و از جہاں رستند

حیاتِ انسانی کا کمال یہی ہے کہ ہم تند بادِ حوادث کے مقابلہ میں نہ گھبرائیں اقبال ایسی زندگی کو جس کا مدار عیش پسندی اور تن آسانی پر ہو بہت برا خیال کرتے ہیں۔ مشکل پسندی ان کی تعلیم کا ایک خاصہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

جہاں تک ممکن ہو ہر انسان کو خود کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ کسی دوسرے کے زیر بار احسان نہ ہو۔ اقبال کا خیال ہے۔ کہ سوال کرنے سے خودی کو ضعف پہنچتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب
مے نخواہد از خضر یک جام آب

اقبال نے "اسرار خودی" میں خودی کے تین مراحل بیان کئے ہیں۔ اول اطاعت یا پابندیٔ فرائض ہے۔ اسی سے سچی حریت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
مے شود از جبر پیدا اختیار

دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے یعنی انسان اپنے اندر قربانی کا مادہ پیدا کرے۔ اُسے اپنے نفس پر پورا پورا قابو ہونا چاہئے تاکہ کوئی بُرا فعل اس سے سرزد نہ ہو۔ اسی ضمن میں علامہ فرائض دینیہ کی پابندی کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی کامل پابندی سے انسان کو بہترین سعادت حاصل ہوتی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج اور زکوٰۃ کوئی بے معنی چیزیں نہیں بلکہ ان میں اہل بشر کا سیاسی ملی اور طبعی مفاد بھی بدرجہ اتم زیر نظر رکھا گیا ہے خودی کی تکمیل میں تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی کا ہے۔ علامہ کا قول ہے کہ خدا کا نائب ہی ہمیں صحیح راستہ پر لگا سکتا ہے۔ کیونکہ وہی کُلی حقیقت سے آشنا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ اس نائب خدا میں اور جرمنی کے مشہور فلسفی نطشہ کے فوق البشر میں تھوڑی بہت مماثلت ضرور ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ اس نائب خدا کی رہنمائی کے بغیر ہماری خودی کی بیداری محال ہے کیونکہ اسی خدا رسیدہ بزرگ کی چشم جہاں بیں ظاہریت سے گزر کر عالم کی گہرائیوں تک نظر ڈال سکتی ہے۔ وہی حیاتِ انسانی کا کامل ترین شارح ہو سکتا ہے وہ اپنے فعل و قول سے عمل کی اہمیت کو واضح کرتا ہے ؎

زندگی را می کند تفسیر نو
می دہد ایں خواب را تعبیر نو

اقبال خودی کی تکمیل کو حیاتِ انسانی کا بزرگ ترین مقصد سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر علم فن۔ مذہب۔ سیاست خودی کے ہی تابع ہونے چاہئیں۔ اور اگر یہ چیزیں خودی کی تکمیل میں کچھ مدد نہیں دیتیں۔ تو بالکل عبث ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

خودی کے مکمل استحکام سے انسان وہ مقام حاصل کر لیتا ہے۔ جہاں وہ اپنی تقدیر کا خود مالک بن جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ

یا مثلاً یہ شعر جو زباں زدِ خلائق ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی تکمیل کو اقبال ایک قوم کی ترقی کے لئے بالکل ناگزیر خیال کرتے تھے۔ اور قوم کی آزادی اور ترقی ہمیشہ اُن کا مطمح نظر رہا ہے اس لئے فرماتے ہیں ؎

قدسیاں را روزِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشم ملتے

(۱۹۳۸ء)

مولانا سرور ہاشمی

حضرت علامہ اقبال کا فکری جہاد

انسان کی عام سرگرمیوں کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ انسان کی حرکت دو اہم قوتوں کے تابع ہے۔ ایک تو فطری محرکات جو اس کو "ورا ثتہً" بنی نوع انسان کے فرد کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ دوسرے وہ افکار جو اُسے مختلف قسم کے ماحول میں پرورش پانے سے حاصل ہوتے ہیں۔

محرکاتِ ذہنی قریب قریب عقل و دانش کی قید سے بری ہوتے ہیں۔ مگر افکار مختلف حالات میں مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت یوں واضح کی جاسکتی ہے۔ کہ انسان بحیثیت انسان روئے زمین پر انسانیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس سے ہماری مراد انسانی فطرت کی وہ خصوصیات ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہم آہنگ بناتی ہیں۔ مگر افکار انسانی مختلف حالات اور مختلف خطہ ہائے زمین میں انسانی ذہنیات میں تغیر و تبدل پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً مشرق و مغرب کے مختلف ممالک میں مختلف قسم کے مذاہب، علوم و فنون انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ ایک ہندو اور بدھ میں محرکات فطری کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، ہنسنا، کھیلنا ایسے افعال ہیں جن سے ہر دو کس ایک ہی وقت میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر دونوں کے لئے معاشرت ایک ہی قسم کی دلچسپی رکھتی ہے۔ لیکن تربیت فکر کے بیش نظر جو بہت حد تک حالات پر منحصر ہے۔ ہر شخص اپنے مذہب کو دنیا کا سب سے سچا مذہب جانتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بنی نوع انسان کا مذہب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے لئے خطّہ ہائے زمین کی قید کچھ معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ محرکات فطری ہر انسان میں یکساں ہیں۔ اور ماحول کا اثر

حقائق محض کو نہیں بدل سکتا۔ البتہ فروعات میں حسب ضرورت اعتدال قائم کیا جاسکتا ہے۔

محرکات فطری اندھی قوتیں ہیں۔ مگر انسانی افعال قوت فکر سے بہت حد تک متاثر ہوتے ہیں اور اسی قوت فکر کی تربیت پر انسانی سرگرمیوں کے عملی نتائج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اپنے ماحول میں کامیاب زندگی بسر کرنا ذہنی نجات اور تسخیر عالم پر مبنی ہے۔ کسی مجلس کی ترقی کے لئے تشکیل فکر اوّلین اقدام ہے۔ علامہ مرحوم نے فکری جہاد سے عالم انسانی کی جو خدمت کی ہے وہ گزشتہ چند صدیوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان حالات میں جب کہ دنیا ایک خاص دَور سے گذر رہی ہے۔ بالخصوص ملّت اسلامیہ مغربی تہذیب کے تصادم سے عجیب و غریب مسائل سے دوچار ہو رہی ہے۔ اقبال جیسی شخصیت کا ظہور خدائے برتر کا احسان عظیم ہے۔

دیوار کہنہ کی طرح گرتی ہوئی قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے علامہ مرحوم کو حفظِ ذات کی سوجھی۔ ان کے نزدیک کسی مجلس کا قیام فرد کی تربیت اور تحفظ ذات کی کوشش پر مبنی ہے۔ چنانچہ ان کے ابتدائی کلام سے قطع نظر کرتے ہوئے انکی مشہور مثنوی "اسرار و رموز" اور بعد کی تصنیفات میں اسی خیال کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ جہاں وہ فرد کی خودی کی حفاظت چاہتے ہیں۔ وہاں قومی خودی (قومی انا) کا قیام اسی قدر ضروری جانتے ہیں۔ کیونکہ فرد کی تمام سرگرمیاں اجتماعی نتائج میں مدد دیتی ہیں۔ غرض یہ کہ فرد ایک خشت کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سے افراد جمع ہو کر دیوار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اگر ایک اینٹ کچی ہے اور یہی حالت تمام اینٹوں کی ہے تو دیوار کی پختگی کے جو امکانات ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ کئی صدیوں کے مسلسل اخلاقی اور ذہنی زوال نے ملّتِ اسلامیہ کو مضمحل کر رکھا تھا۔ انقلاب زمانہ کے ساتھ قومی صحت قائم رکھنے کی کوشش ایک خیال موہوم بن چکی تھی۔ اقبال دنیائے فکر کے مجاہد تھے۔ وہ حالی

کی طرح اسلام کی شوکت پارینہ کی مرثیہ خوانی قوم کو بلند تر منازل کی راہ دکھانے کے لئے افکار اسلامیہ کو دورِ حاضر کے مسائل کے پیش نظر ایک خاص قسم کی تشکیل دینے کی کوشش کی جو خالصتاً اسلامیت کی آئینہ دار تھی۔

چنانچہ ان کی مشہور کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (Reconstruction of Religious Thought in Islam) دنیائے اسلام میں اپنی وضع کی ایک کتاب ہے۔ جس کی قدر و قیمت ابھی اندازہ سے بالاتر ہے۔ جوں جوں ملت اسلامیہ اس کتاب کی روشنی میں راہ دیکھنے کی کوشش کرے گی۔ احیائے اسلام کا مسئلہ آسان تر ہوتا جائے گا۔ آخری دَور کے صوفیوں اور عام مفکرین نے اسلامی تخیل کو مجروح کر دیا۔ اور حالات کی مجبوریوں کے درمیان اس کی شکل کو بگاڑتے رہے۔ اس کا اثر عام اسلامی مجلس پر خوفناک صورت میں ظاہر ہوا۔ علماء اس کے سدباب سے غافل رہے یہ سعادت سر اقبالؒ کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے اسلامی تاریخ اور علوم و فنون کے گہرے مطالعہ سے دنیائے اسلام کو دورِ آخری کے تخیل سے متنبہ کیا۔ نیز مغربی تخیل کی شوخیوں کا جواب بوجہ احسن دیا۔

حضرت علامہ اقبالؒ مذہب کو ہر شے پر مقدم جانتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کی بنیاد ذاتی احساس یا مشاہدہ پر ہے۔ یہ احساس حقیقت کے قریب تر پہنچتا ہے۔ اور اس تقارب سے ایک ایسا علم حاصل ہوتا ہے۔ جو ہر طرح قابل اعتبار ہے۔ فکر محض سے علامہ متنفر نہ تھے۔ لیکن اس کے محدود ہونے میں کچھ شک نہ رکھتے تھے چنانچہ وجدان کے مقابلہ میں فکر ان کے نزدیک مرغِ بے پر ہے۔ موجودہ دَور میں جبکہ سائنس ہر شئے کو محسوسات کی روشنی میں دیکھنے کی متمنی ہے مذہب کے لئے کوئی وسعت نہیں ہے۔ سائنس مذہب سے اس لئے دست و گریبان ہے۔ کہ بیچاری آخر الذکر کی بصیرت سے محروم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور مذہب دو مختلف دائروں میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ مذہب کا دائرہ وسیع تر ہے۔ جس میں وجدان ذریعہ علم ہے۔ سائنس

مادی اشیار میں تفحص کی خوگر ہے۔ اس کے مشاہدات آب و باد و آتش و خاک سے آگے نہیں نکلتے۔ فلسفہ اور سائنس آپس میں بھائی بہن ہیں۔ نظری اعتبار سے فلسفہ سائنس سے کہیں آگے اقدام کرتا ہے۔ لیکن چونکہ فلسفہ کو قید منطق، اسباب و علل کے محسوسات سے نجات نہیں مل سکتی۔ اس لئے فلسفہ مذہب سے کہیں دور پیچھے رہتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حقیقت عالم کو فلسفہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ذہنی اعتبار سے ہر معاملہ میں غور و فکر کیا جائے۔ انسانی فطرت کے اس ابتدائی حق کو چھیننا نہ صرف غیر صحیح نہیں بلکہ مہلک ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر حضرت علامہ مرحوم نے اپنے خطبات میں یہ اقتضائے فطری کی تسکین کی کوشش کی ہے۔

مذہب کی گہری بحث کے دوران میں علامہ فرماتے ہیں۔ کہ فکر و وجدان ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔ ان کی اصل ایک ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ ایک حیثیت کو جزوی حقیقت سے دیکھتا ہے۔ دوسرا بحیثیت کل، بقول برگسان "وجدان ایک اعلیٰ قسم کا ذہن ہے۔"

قرآنی تعلیم انسان کو مشاہدۂ فطرت سے تسخیر عالم کا سبق دیتی ہے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مفکرین اسلام پر یونانی فلسفہ کا اثر پڑا اور وہ لوگ اسلام کی دل افروز تعلیم سے کماحقہٗ فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ چنانچہ ذہنی اعتبار سے مسلمان دنیا و مافیہا کے مسائل سے کنارہ کش ہونے شروع ہوئے۔ جس کا نتیجہ کئی صدیوں کے بعد مادی پریشانی اور ذہنی تسفّل کی شکل میں رونما ہوا۔ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات میں اس امر پر زور دیا ہے کہ قرآن انسان کو اس دنیا کے مسائل پر کماحقہٗ، غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ اور اس دنیا سے روگردانی کو جرم عظیم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ انسان کو اس دنیا سے علیحدہ تصور کرتے ہوئے آخرت کی تیاری کرنا لاحاصل ہے۔ اس دنیا میں ہماری سرگرمیاں آیندہ دنیا میں ایک خاص نتیجہ رکھتی ہیں اور یہاں کے ماحول سے قطع تعلق کرنا اور مشکلات سے استخلاص ڈھونڈنا نہ صرف

آیندہ دنیا میں خوشگوار نتائج پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ بلکہ اس دنیا میں ہماری مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔

ذاتِ انسانی کی بقا اور آزادی کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال "انا عرضنا الامانۃ" الخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسان کی انفرادی ذمہ داری کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے انسان خدا کا منتخب ہے۔ روئے زمین پر خدا کا نائب ہے۔ اور اس نے ایک ایسے بار امانت کو اٹھایا ہے جس کی رو سے وہ ایک آزاد شخصیت کا امین ہے۔ انسان کا اندرونی احساس انسانی ذات کے اشتغال کو ظاہر کرتا ہے۔ نیز ذاتِ انسانی کو ادراک، محاکمہ اور ارادہ کے فعل میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس کی زندگی ایک قسم کی کشمکش ہے جو ذات اور ماحول کے باہمی تقابل سے پیدا ہوتی ہے۔ ذات باہمی تقابل کے میدان سے باہر نہیں رہتی۔ وہ اس میں آمرانہ قوت کی حیثیت سے موجود رہتی ہے۔ اور وہ اپنے احساس یا تجربہ سے تشکیل و تنظیم اختیار کرتی ہے۔ قرآن ذاتِ انسانی یا خودی کے آمرانہ فعل کے متعلق یوں توضیح کرتا ہے۔

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی

اقبالؒ تہذیب اسلامی کی روح کو حرکت سے نسبت دیتے ہیں۔ اور اسلامی تعلیم انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کی راہ دکھائی ہے۔ یونانی فکر نے مسلمانوں کے قرآنی نظریات کو دھندلا کر دیا تھا۔ قریباً دو صدیوں تک عربوں کے عملی ذوق کو صحیح اظہار سے روکے رکھا۔ آخر اسلامی ذہنیت نے غلبہ حاصل کیا تو یونانی تراجم کے ذریعے سے حاصل کردہ علوم میں تدبر و تفکر سے (جس کی اصل قرآن پر تھی) ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی۔ جس نے تجربہ اور مشاہدہ کی مدد سے سائنس کو فروغ دیا اور طبعی اور کیمیائی علوم میں گراں مایہ تحقیق و اکتشاف کے فرائض سرانجام دیئے۔ حقیقت میں دورِ جدید کے بانی یہی لوگ تھے۔ یورپ ان کے احسانات سے قیامت تک سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

اسلام ارتقائے عالم کا قائل ہے۔ اور اسلامی تخیّل کے تمام خطوط عالم کے حرکی نظریہ میں مرکوز ہوجاتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ کو ابن مسکویہ کے نظریۂ حیات سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ جو اُسے ایک ارتقائی حرکت قرار دیتا ہے۔ اسلام ایک تہذیبی تحریک ہونے کی حیثیت سے پرانے نظریۂ عدمِ حرکت کی تردید کرتا ہے۔ وحدتِ نظام کی رُو سے فرد کی قیمت کو تسلیم کرتا ہے۔ رشتۂ خون بحیثیت بنیادِ وحدتِ انسانی رد کرتا ہے۔

انسانی زندگی کی وحدت روحِ انسانی میں ہے اور خدا تمام حیات کا مبداءِ اولی ہے۔ اسلام نے زندگی کی آخری روحانی بنیاد ابدی قرار دی ہے جو اپنے آپ کو تغیر و انقلاب میں ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ حرکت کو دائرہ زندگی سے خارج کرنا پیغامِ موت ہے گذشتہ پانچ صدیوں کے جمود فکر نے دنیائے اسلام کو مفلوج کردیا ہے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لئے ساختِ اسلام میں ایک خاص اصول تحریک اجتہاد کے نام سے موجود ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے مخالف قوتوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ بقول ہالبس ایک ہی قسم کے خیالات وجذبات کے تسلسل کے معنی کوئی خیالات یا جذبات کے تسلسل کے معنی کوئی خیالات یا جذبات کا نہ پیدا ہونا ہے۔" مشرقِ قریب میں ترکوں کا مغربی تہذیب سے تصادم ایک مصیبت عظمٰی تھی۔ جو صحیح معنوں میں اسلام اور تہذیب مغرب کا مقابلہ تھا۔ ترک اجتہاد ہی سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اور دنیائے اسلام آیندہ جب بھی کبھی اس قسم کے مصائب سے دوچار ہوگی تو اس کو ایک ہی اصول کار محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور وہ اجتہاد ہے۔

علامہ اقبالؔ نے دورِ جدید کی ذہنی بے مرکزی کے پیش نظر فکری دنیا میں ایک خاص قسم کی روشنی مہیا کی مغرب کی روزافزوں مادہ پرستی کو غیر صحیح قرار دیا اور مشرق کی جمود و خمود کی زندگی کو مہلک بتایا ہے۔ مرحوم دنیائے اسلام کے بہت بڑے محسن تھے اور ان کا احسان جہاد فکر کی شکل میں ظاہر ہوا ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغان نیز کنند
(۱۹۳۸ء)

رفعت

علامہ اقبالؒ اور فلسفۂ خودی

خودی علامہ مرحوم کا ایک مستقل موضوع ہے جو انسان کے ذاتی حقائق و معارف جسمانی ضوابط و عوامل اور روحانی عروج و کمال سے عبارت ہے۔ خودی سے ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر ایک چیز میں ایک حقیقت نہاں ہے اور جب انسان اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو لازمی طور پر اُسے اپنے مقام سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ انسان میں انتہائی کمالات کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ جس قدر اس کو اس چیز کا احساس ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی اس کی زندگی استوار اور محکم تر ہوتی چلی جائے گی۔

تربیت خودی کے تین مدارج ہیں۔

(۱) دستور الٰہیہ کی اطاعت

(۲) ضبط نفس

(۳) نیابت الٰہی

(۱) قوانین خداوندی کی اطاعت سے دل میں سچی حریت پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کے روحانی ارتقا کے لئے شاہراہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار

می شود از جبر پیدا اختیار

(۲) انسان صحیح معنوں میں اس وقت انسان کہلانے کا حقدار ہوتا ہے جب اُسے اپنے نفس پر پورا قابو اور ضبط ہو۔ ضبط نفس سے انسان اپنی خواہشات نفس پر تصرف حاصل کر سکتا ہے اور قربانی کے موقعہ پر ہر ممکن قربانی کے لئے

تیار رہتا ہے۔

(۳) نیابت الٰہی۔ دنیا میں انسانی ارتقا کی تیسری اور آخری منزل۔ ایسے مقام پر انسان اس وقت پہنچتا ہے جب وہ کامل خودی کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنے منتہائے مقصود پر پہنچ گیا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی تمام درمیانی کڑیاں طے کر کے مرتبہ کمال کو پہنچ چکی ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر تقدیر اس کے بس میں ہوتی ہے۔ جو چاہے خدائے عز وجل کے حکم سے ضرور ہوتا ہے۔ اور یہی درجہ حاصل کرنے کے لئے علامہ مرحوم نے زور دیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

قوم افراد کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی فتح و شکست۔ ترقی و تنزل اور سعادت و نامرادی کا انحصار کلی طور پر ان افراد پر ہی ہے جو کچھ ہوتا ہے افراد کی جبلی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے جس قدر ہر ایک فرد خودی کے لوازمات وصفات سے متصف ہوگا اسی قدر وہ قوم کے لئے کار آمد اور مفید ثابت ہوگا۔

علامہ مرحوم کے نزدیک خود شعوری و انفرادیت ہی اصل اصول ہے۔ وہ ایسی زندگی پر یقین نہیں رکھتے جو تمام کائنات میں جاری وساری ہو۔ ان کے لئے حیات تمام و کمال انفرادی ہے وہ فرماتے ہیں۔ خدا بھی ایک فرد ہے اور وہ فرد یکتا ہے اور اعلیٰ ترین اوصاف کا حامل ہے۔

"چونکہ کائنات ابھی تک مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچی اور تکمیل کے مراتب طے کر رہی ہے اور فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اس لئے جس حد تک انسان اس کے غیر مربوط و غیر مرتب اجزا میں ربط و ترتیب پیدا کر دے گا اسی حد تک اس کو بھی فعل تخلیق میں ممد و معاون قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ خالق کہلانے کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے فتبارك الله احسن الخالقين۔"

اور وہ فرد کامل چاہتا ہے کہ اپنی تخلیقی قوتوں کو اپنی مخلوق میں ودیعت کر دے تاکہ اپنی طرح اُن میں بھی یکتائی پیدا کر دے ۔ چنانچہ حدیث شریف میں اسی کی طرف اشارہ ہے ۔ تخلقوا باخلاق اللہ

اس لئے ظاہر ہے کہ وہ تمام انسان جن کا نظریہ اور منتہائے مقصود یہ ہے کہ انسان حیات کلی میں جذب ہو کر رہ جائے اور اپنی انفرادیت یا خودی کو ضائع کر دے غلطی پر ہیں ۔

خودی کے متعلق فرماتے ہیں :-

تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ
خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اب انسان کو اپنی حقیقت سے آگاہی ہو گئی ۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس کو اپنی بے حسی ۔ جمود و سکوت ۔ اضمحلال و سکون ۔ پستی و ذلت ۔ انحطاط و انہباط کا احساس ہو ۔ جب دیکھا کہ اس کے یخ بستہ جذبات میں حرکت شروع ہو گئی ہے ۔ اور اس کے عروق مردہ میں خون زندگی کی لہر دوڑنے لگی ہے تو تخلیق آرزو کی ضرورت پڑی ۔ اور فرمادیا کہ جس انسان کے دل میں حصول مدعا کے لئے آرزوئیں بیتاب تمنائیں مضطرب نہ ہوں ۔ اس کا وجود ایک مشت خاک سے زیادہ نہیں ۔ انسانی قلب میں آرزوؤں کی یہی تڑپ اُسے سرگرم عمل رکھتی ہے ۔ یہ انہیں پیہم آرزوؤں اور خواہشوں کی تخلیق کا ماحصل ہے کہ انسان نے زمینوں پر قبضہ کیا ۔ پہاڑوں کے اندر راستے پیدا کئے ۔ سمندر کی قہاریت کو مغلوب کیا اسی لئے اس کی اہمیت کو مختلف پیراؤں میں واضح کر دیا ۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو ہنگامہ آرائے خودی | موج بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صید مقاصد را کمند | دفتر افعال را شیرازہ بند
آرزو جان جہان رنگ و بوست | فطرت ہر شئے امین آرزوست

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

دل اسی سے ہنگامہ آرا اور روح اسی سے بیدار و بے تاب رہتی ہے۔
آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

اگر رمز حیات آگہ مجوے و مگیر
دلے کہ از خلش خار آرزو پاک است
زندگی مضمون تسخیر است و بس
آرزو افسون تسخیر است و بس
از تمنائے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات

از تمنا رقص دل در سینہ ہا | سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
طاقت پرواز بخشد خاک را | خضر باشد موسیٰ ادراک را

چونکہ دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے اس لئے یاس و قنوط ۔ حزن و خوف، ناامیدی و افسردگی اور حیرت و افسوس کو قاطع حیات بتایا ہے۔

نا امید از آرزوے پیہم است
ناامیدی زندگی را سم است

فرماتے ہیں جب انسان کے اندر جوان خون آرزو اور تمنا لئے گردش کرتا ہے۔ تو جوشِ حیات اور ولولۂ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام دنیا اس کے لئے بہشت بن جاتی ہے وہ دل کے اندر دیکھتا ہے تو دل کا ہر گوشہ امیدوں

اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے ۔ جب باہر دیکھتا ہے ۔ تو دنیا کا کوئی حصّہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا ۔ وہ فرماتے ہیں کہ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کامیوں سے ہیں اور جس وقت یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے ۔ تو دنیا کی تمام کامرانیاں اور فیروز مندیاں اس کے قدموں میں آن گرتی ہیں ۔ علامہ مرحوم ہر وقت اس چیز کا درس دیتے ہیں ۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللّٰہ ولا تایسو من روح اللّٰہ ۔ اور آگاہ کرتے ہیں کہ مایوسی سے بڑھ کر کوئی شئے انسانیت کے لئے قاتل نہیں فرماتے ہیں :۔

مرگ را سامان ز قطع آرزوست
زندگی محکم از لاتقنطوا است
زندگی را یاس خواب آور بود
ایں دلیل سستی عنصر بود

فرماتے ہیں جب انسان کے آسمان مستقبل پر ناامیدی ۔ حسرت و یاس کے بادل چھا جاتے ہیں ۔ جب ظاہری حالات ناموافق ہوتے ہیں زمانہ منہ پھیر لیتا ہے اور جب زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے جو مسکراتا ہوا آتا ہے اپنے پَروں کو کھولتا ہے اور اُسے دلاسا دیتا ہے ۔ اس میں قوت و طاقت ۔ ہمت ، چستی ۔ کی روح پھونک دیتا اور یاس و قنوط کی تیرہ و تاریک گھٹاؤں کو آن واحد میں منتشر کر دیتا ہے ۔

یاس و ناامیدی فی الحقیقت ان کے پاس تک نہیں پھٹکتی ۔ سخت سے سخت مصیبت میں بھی سر رشتہ امید ہاتھ سے نہیں دیتے ۔ فرماتے ہیں کہ قوموں کی زندگی کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ اُن کا دل اُمید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے ۔ خواہ کتنے ہی کہنہ مشق صیاد اپنے جال پھیلائے چارسو گھات میں بیٹھے ہوں اُن کے دل امید کا طائر مقدس کبھی بھی ان کے پھندے میں نہیں پھنستا ۔

فرماتے ہیں :-

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

خواہ ناکامی و مصائب کا بے پناہ ہجوم ہو۔ غم و اندوہ کے سیلاب رواں ہوں - یاس و اضطراب کا لشکرِ بے پایاں بڑھ بڑھ کر حملہ کرے مگر دامن امید کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو۔

در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

مثنوی میں فرماتے ہیں :-

برگ سبزے کز نہال خویش ریخت | از بہاراں تار امیدش گسیخت
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار | از شجر مگسل بامید بہار

امید اور ہر حالت میں امید - کبھی افسردہ نہیں کبھی مایوس نہیں، کبھی ملول نہیں،

معلوم ہُوا ہے حیات خودی، تخلیق و تولید مقاصد سے وابستہ ہے، یعنی انسان کے مقاصد بلند اور آرزوئیں پیہم ہوں - لیکن شرط یہ ہے کہ مقصد بلند اور آرزو ارفع و اعلیٰ کے ساتھ، وہ ایک نصب العین کا پرستار ہو کر رہ جائے اور اس کے حصول کے لئے اپنی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لائے. علامہ مرحوم کے نزدیک یہ نصب العین عشق الٰہی ہے اور اس کے حصول کا بہترین طریق خودشناسی ہے۔ جیسا کہ سرورِ کائنات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ مُحِبّ اور مُحبّ دونوں میں شانِ انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر فرد یکتا کے حصول کی کوشش طالب کے اندر بھی یکتائی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ اب اس عشق کو اختیار کرنے کے لئے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا پڑتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دل میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بحرِ ذخار موجزن پاتا ہے۔

ہر کہ عشق مصطفےٰ سامان اوست

بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

یہی سوز ہے جس میں علامہ مرحوم خود جلتے رہتے ہیں۔ یہی شرابِ عشق انہیں مست رکھتی ہے اور اس کی جستجو انہیں سرگرم عمل۔

فرماتے ہیں کہ اس عشق سے دل توانا و مضبوط و بے باک ہوتے ہیں۔ اور روحانی ارتقا حاصل کرتے ہیں۔

دل ز عشق او توانا مے شود — خاک ہمدوش ثریا مے شود

از محبت مے شود پائندہ تر — زندہ تر۔ سوزندہ تر، تابندہ تر

عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشم نوحے قلب ایوبے طلب

کیمیا پیدا کن از مشت گلے — بوسہ زن بر آستان کاملے

فرماتے ہیں:-

جوہر زندگی ہے عشق — اور جوہر عشق ہے خودی

اب جب کہ آرزوئیں پیدا ہو گئیں۔ امیدیں وابستہ ہو گئیں۔ یاس و قنوط کے خوفناک بادل چھٹ گئے زندگی کا نصب العین حسین و جمیل جلوے دکھائی دینے لگا تو فطرتی طور پر اس کے حصول کے لئے دل میں اضطراب و ولولہ پیدا ہوا۔ اس مقام پر پہنچ کر اعلان کر دیا کہ سعادت و فیروزمندی۔ کامیابی و کامرانی۔ فتح و نصرت کا راز عمل قوت اور جستجو میں پنہاں ہے۔ اور آرزو بغیر کسی نصب العین کے

عمل چیز ہے اور بیانگ دہل کہ دیا۔

در عمل پوشیدہ مضمون حیات　　　　لذت تخلیق قانونِ حیات

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ان کے نزدیک سکون کا نام موت ہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ محو جستجو رہے وہ حریت فکر و فعل کے حامی ہیں ۔ انہوں نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرأت سے سرفراز کیا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسلسل جد و جہد اور پیکار میں تصادم کو سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں ۔ کیونکہ میرے نزدیک اس سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے " جس نے شب غم کی تاریکیوں کو آنسوؤں سے دھوکر صبح مسرت کا درخشاں چہرہ نہیں دیکھا " وہ دنیا کی آسائشوں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوا ۔ اور وہ قدرت کی ودیعت کی ہوئی لازوال نعمتوں سے پورے طور پر بہرہ ور نہیں ہو سکتا ۔

وہ فرماتے ہیں کہ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں کا ایک ایک ذرہ بھی قوانین فطریہ اور سلسلہ علل و اسباب کی ماتحتی سے باہر نہیں ۔ اگر آج ہم پر رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بہار گذشتہ پر ماتم کریں اور خزاں کے جھونکوں سے اپنی پت جھڑ دیکھ دیکھ کر آنسو بہائیں ۔ یہ تمام انقلابات قدرتی ہیں ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے زور بازو سے تمام مصیبتوں پر قابو پائیں ۔

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے　　　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ان کے نزدیک مصیبتوں میں الجھنا ہی زندگی ہے ۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں　　　　وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں　　　　تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بے باک است

فرماتے ہیں یہی چیزیں ہیں جو انسان کی تکمیل و بقائے دوام کا باعث ہیں ۔

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز غمکدہ نمود میں شرط دوام اور ہے

علامہ مرحوم ایسے راہ پر چلنا پسند فرماتے ہیں جو دشوار گذار اور پُر از خار ہو۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ پروانہ اپنے تئیں ایک دفعہ شمع پر نثار ہو زندگی کی رستخیز و پیہم کشاکش سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ مگر میری نظروں میں اس کی اس قربانی کی کوئی زیادہ وقعت نہیں۔ میں تو اس پروانہ کو حقیقی عاشق سمجھتا ہوں جس کی جان سخت کوش و شعلہ نوش ہو۔

بہل افسانہ آں پا چراغے حدیث سوز او آزار گوش است

من آں پروانہ را پروانہ دارم کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

تنعم و عیش و عشرت کی زندگی کو ملت کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بتاتے ہیں۔ کیونکہ ایسی تن آسانی ملت کے قوائے حیات میں اضمحلال و سکون پیدا کر دیتی ہے اور انہیں بےکار و مفلوج کر دیتی ہے۔ اگر انسان حیات جاوداں کا متلاشی اور نام و نمود کا بھوکا ہے تو اُسے اپنے تئیں محنت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کا عادی بنانا چاہیئے۔ اور جو مصائب و آلام اس کی ترقی میں سدِ راہ ہوں اُن کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کرنا چاہیئے۔

زندگی کی تعریف ملاحظہ ہو:۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است

گفتم کہ کرمک است و ز گِل سر بروں زند گفتا کہ شعلہ زاد مثال سمندر است

گفتم کہ شر بفطرت خامے نہادہ اند گفتا کہ خیر او نشناسی ہمیں شر است

گفتم کہ شوق سیر نہ بروشس بمنزلے

گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

پوچھا گیا راز حیات کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

رفیقش گفت لے یار خردمند　　اگر خواہی حیات اندر خطر زی

خطر تاب و تواں را امتحاں است　　عیار ممکنات جسم و جاں است

ایک جگہ پیام مشرق میں فرمایا ہے کہ جس طرح موج میں جب تک پیچ و تاب ہے وہ موج ہے اسی طرح انسان کی حیات اس کے تگ و تاز اور سکون نا آشنا رہنے میں ہے۔

اسی مضمون کو کسی بلیغ و فصیح انداز میں مندرجہ ذیل دو شعروں میں بیان کیا ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بے زیستم　　ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم

موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت　　ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

غرض وہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں رہ کر مشکلات کا مقابلہ کرنے سے ہی خودی میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنے انتہائی مقام تک پہنچتا ہے۔

جب اپنی حقیقت سے آگہی دل میں آرزو اور جوشِ عمل اور بازو میں قوت پیدا ہو گئی تو کہہ دیا کر بڑھے چلو۔ کسی حالت میں قرار نہیں۔ ہر لحظہ بڑھنے کی خواہش۔ ہر لمحہ ترقی کی تمنا۔

فرماتے ہیں :-

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

وسعت داماں ذرا ملاحظہ ہو۔

گو مشت خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کو زمین سے آسماں تک ہے

یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر　　زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

فضا تیری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

کسی حالت میں قرار نہیں ـــــ ایک ہی حکم ہے اور وہ بڑھے چلو:

جستجو را محکم از تدبیر کن　　انفس و آفاق را تسخیر کن
غنچۂ از خود چمن تعمیر کن　　شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام　　یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

اللہ اللہ کسقدر زندگی ہے اس پیغام میں۔ جب قوم کی زندگی اس قلب میں ڈھل جائے تو پھر انسان کیوں نیابت الٰہی کا دعویٰ نہ کرے۔

پھر بتاتے ہیں کہ بعض چیزوں سے خودی میں ضعف آتا ہے۔ ان میں سے ایک دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا ہے۔ خودی ہرگز اس چیز کی اجازت نہیں دیتی کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائے جائیں وہ فرماتے ہیں کہ انسان کو خوددار ہونا چاہیئے۔ اس کا فرض عین ہے کہ اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے اور دنیا میں اپنے شایان شان جگہ منتخب کرے۔ خود اعتمادی ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے پائے استقلال کو سخت سے سخت شدائد و مصائب میں بھی ڈگمگانے نہیں دیتی۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم　　اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کر
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اسی پیغام کو کس قدر خوبصورتی سے "پروانہ اور جگنو" میں بیان ہے۔

پروانہ:- پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو:- اللہ کا سو شکر ہے پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ اب "خودی" کی اس حالت جد و جہد کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم قید زماں پر قابو پائیں یا یہ کہ موت اس پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو۔ جب انسان کسی نصب العین کے حصول کے لئے تندہی سے پیہم کوشش کرتا ہے تو اکثر اوقات اُسے آرام وسکون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح جب انسان دنیا میں نیابت الٰہی کا شاندار رتبہ پالیتا ہے تو پھر پیشتر اس کے کہ وہ مستقبل کا اہم سفر اختیار کرے۔ اُسے اپنی تکان و تردد کے دور کرنے کے لئے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ موت بھی اسی آرام وسکون کا سامان پیدا کرتی ہے۔ اور قرآن کریم میں اسی توقف کو عالم برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ مرحوم کے نزدیک موت زندگی ہی کے ایک لمحہ توقف کر لینے کا نام ہے۔

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں ہزار

وہ خودی کی حیات جاودان کو زندگی کی سوز محدود تک محصور نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ہے

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو وہ یہ گوہر نہیں

وہ فرماتے ہیں کہ جب انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتا ہے کہ ہر شام تاریک کے بعد صبح اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ آموجود ہوتی ہے۔ اور ہر کلفت راحت پر دال ہوتی ہے تو یقینی امر ہے کہ انسان کے لئے ایک درخشاں و تاباں مستقبل موجود ہے جو اُسے موت کے بعد حاصل ہوگا۔ اُن کے نزدیک موت انسان پر حیاتِ ابدی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی ۔ صبحِ دوامِ زندگی
موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

ان کے لئے تربیت خودی کی غایت حیات بعد الممات ہے۔ موت خودی پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اسی حیات بعد الممات کی راہ ہے۔ زندگی ایک غیر فانی چیز ہے اور بندِ زمان و مکان سے بالکل آزاد۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

بایں ہمہ زندگی کو کسی دائرہ تک محدود کر لینا حقیقت ناشناسی کے مترادف ہے اور خداوند عز و جل کی غیر مترقبہ نعم کا کفرانِ بیّن ہے۔ (۱۹۳۸ء)

م۔م۔ جوہر صدیقی

اقبال اور مارکس کے زاویہ ہائے نگاہ

یہ خیالی مکالمہ اقبال اور کارل مارکس کے فلسفہ کا موازنہ ہے۔ جہاں تک اقبال کے فلسفہ کا تعلق ہے میرا منبع علم بال جبریل، ضرب کلیم، سیدین صاحب کی کتاب "اقبال اور تعلیم" اور علامہ اقبال کے لکچر ہیں۔ اور جہاں تک کارل مارکس کا تعلق ہے وہ اس کی مشہور تصنیف "سرمایہ" اور دو چار اقتصادی کتب اور پروفیسر کول صاحب اور اسٹریچی صاحب کی تصانیف ہیں اور نیز فلسفہ کارل مارکس جو لینن گراڈ ادارہ فلسفہ نے شائع کی ہے۔ ان سب کتابوں کے مطالعہ سے میں نے ان دونوں بزرگوں کے زاویہ نگاہ میں جو فرق سمجھا وہ اس مکالمہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشتراکی کتب میں کہیں میری نظر سے ایسی چیز نہیں گذری جس سے مارکس کے خاص اسلام کی بابت خیالات معلوم ہوتے لیکن مذہب کی بابت ضرور ہیں۔ اس کے نزدیک ایک مذہب اتنا ہی اچھا یا بُرا ہے جتنا کہ دوسرا۔ اب سنئے کہ اس کے خیالات مذہب کے متعلق کیا ہیں؟

"انسان جو خطرات کی دنیا میں رہتا ہے۔ مجبور ہے کہ حفظ و امان کی جگہ تلاش کرتا رہے یہ وہ کس طرح کرتا ہے؟ قدرت کی تسخیر سے گورنمنٹیں بنا کر، بجلی پیدا کر کے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح وہ سماجی زندگی کے پُرپیچ بندھن پیدا کر لیتا ہے۔ دنیا کو عمل سے بدلنے کا یہی طریقہ ہے لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی خود کے جذبات اور تفکرات کو بدلنے کا جب دنیا کو بدلنا نہایت مشکل ہو جائے۔ یہ اولاً مذہب اور بعدہٗ فلسفہ کا طریقہ ہے اس میں پہلے دنیا کو سازگار بنانے کی کوشش ہوتی ہے اور جب نہیں ہو پاتی تو خود کو اس سے ساز باز کرنا

پڑتا ہے، یعنی اگر زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز، اور اس طرح انسان فنا ہو جانے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔"

مسلمانوں کا فلسفہ اس معنی میں مسخ ہو گیا کہ بقول علامہ اقبال کے مسلمان تقدیر کا راکب ہونے کی بجائے مرکب ہو گیا۔ اسی امر کی طرف میں نے کارل مارکس سے اشارہ کروایا ہے کہ شروع میں مسلمان میں ماحول سے تجربہ کرنے کا شوق تھا لیکن وقت گذرنے پر وہ یونانیوں کے فلسفہ کے زیر اثر آگیا جو تخئیلیت ہے۔

اب یہ سنئے کہ تخئیلیت کیا ہے ؟

"علم و عمل کی کشمکش سے فلسفہ کا مسئلہ اور تخئیلیت (مذہب) اور مادیت کے تنازعات پیدا ہوتے ہیں" ...... "تخئیلین کے نزدیک یہ دنیا ایک کمتر درجہ کی دنیا ہے جس میں اشیا تغیر پذیر رہتی ہیں استحکام نہیں یہ دنیا بالکل فریب اور دھوکا ہے جس میں بجائے وحدت کے کثرت بہت زیادہ ہے لیکن بد قسمتی سے یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ اس لئے عمل ہمیشہ خیال سے کم اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ مایا کی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ تخئیلین کے نزدیک علم کا کام یہ ہے کہ حقیقت کے رموز کھولے بجائے اس کے کہ اس قسم کی واقفیت حاصل کرتا رہے جس کی ضرورت معمولی روزمرہ کی زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس مارکسی فلسفہ میں سے پیش کیا گیا ہے۔ فی زمانہ مسلمانوں کا بھی یہی تخئیلی (صوفیانہ زاویہ نگاہ رہ گیا ہے) بسیط اقتباسات بخوف طوالت نظر انداز کئے گئے۔

غرض یہ عرض ہے کہ مکالمہ کا ہر خیال اقبال اور کارل مارکس کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہے اور یہ خیالی مکالمہ محض دو مفکروں کے فلسفوں کے فرق کی سعی سمجھی جائے۔ اور اگر میں نے علامہ اقبال کے سمجھنے میں کچھ غلطی کی ہو تو ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کر دیں۔ (م۔م۔ جوہر)

مارکس۔ اس وقت آپ کچھ سوچ رہے ہیں کیا مسئلہ زیر غور ہے ؟

اقبال ۔ مسلمانانِ عالم کے مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ ان میں جذبۂ عمل، خود اعتمادی اور بے خوفی کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے ۔

مارکس ۔ میرے خیال میں مسلمانوں کا زوال اس لئے ہُوا کہ ان کا فلسفہ زندگی مسخ ہو گیا۔

اقبال ۔ درست فرمایا مسلمانوں کے فلسفۂ زندگی کی داستان بھی عجیب ہے ۔ شاید آپ کو علم ہوگا کہ مسلمانوں میں صوفیوں کے دو گروہ ہیں جس میں ایک کے بموجب زندگی کا مقصد ہستی کو اُبھارنا ۔ شخصیت کو جِلا دینا اور انفرادیت کو مستحکم کرنا ہے ۔ ان تینوں خصوصیات کو وہ گروہ 'خودی' کے نام سے پکارتا ہے اور اُسی شخص کو صاحب کمال یعنی قلندر سمجھتا ہے۔ جو اپنی خودی کو اتنا ہمہ گیر بنا لے کہ خدا کو اپنے آغوش میں لے لے ۔ دوسرے گروہ کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے ۔ اس کے مطابق وہ شخص قلندر ہے جو اپنی شخصیت اور انفرادیت کو مستحکم کرتا ہے ۔

مارکس ۔ درست ۔ یہ نظریے ایک دوسرے کی تکرار ہیں آپ کس نظریہ کے قائل ہیں؟

اقبال ۔ میں نے صاف طور پر کہہ دیا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے ۔۔۔۔ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

میرے نزدیک ہر شے کا مقصد اپنی ہستی اور انفرادیت کو جِلا دینا ہے ۔ میں اپنی ہستی کو کسی دوسری ہستی میں ضم کرنے کا قائل نہیں ہوں بلکہ دوسری ہستی کو اپنی آغوش محبت میں لینے کا قائل ہوں اگرچہ قطرہ سہی لیکن سمندر میں ملنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے اندر سمندر کی سی وسعت و طغیانی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہستی اپنی انفرادیت قائم رکھنا چاہتی ہے اور انسان اسی لئے اشرف المخلوقات ہے کہ اس میں اپنی خودی مستحکم کرنے کا جذبہ اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے میں نے کہا ہے ؎

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است ۔۔۔۔ پس بقدرِ استواری زندگی است

چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است ۔۔۔۔ ماہ پابندِ طوافِ پیہم است

ہستی مہر از زمیں محکم تر است　　پس زمیں مسحور چشم خاور است

خودی کو مستحکم بنانے کے لئے عمل ضروری ہے۔ انسان کا طرۂ امتیاز تخلیقی عمل ہے۔ وہ دوسری مخلوق کی طرح کسی خاص راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں بلکہ انسان کو صحیح و غلط راستہ منتخب کرنے کا اختیار ہے۔ اس آزادی و اختیار سے غلطی کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ یہ غلطی کرنے کا امکان انسان کو تجسس و فکر اور اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

زندگی ہم فانی و ہم باقی است　　ایں ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندۂ! خلاق شو مشتاق شو　　ہم چو ماگیرندۂ آفاق شو
در شکن آنرا کہ ناید ساز گار　　از ضمیر خود دگر عالم بیار
ہر کہ او را قوت تخلیق نیست　　پیش ما جز کافر و زندیق نیست
بندۂ آزاد را آید گراں　　زیستن اندر جہان دیگراں

بندۂ آزاد قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول پر تخلیقی عمل کر کے خود اپنا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس میں رہتا ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ میں بھی تخلیقی عمل کا قائل ہوں لیکن کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ نے اپنے لکچروں میں یہ کہا ہے "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی ہمارے سامنے یہ حقیقت بے نقاب کر رہی ہے کہ اسلام کا بنیادی تخیل نہ قومیت ہے نہ سامراج بلکہ جمعیت الاقوام ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ جمعیت الاقوام کا تخیل ترقی یافتہ ماحول ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ مختلف اقوام کے نمائندے ٹیلیفون تار اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سے اپنی اپنی حکومتوں سے برابر تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ آج سے تیرہ سو سال قبل جمعیت الاقوام کا تخیل پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں نہ جمعیت الاقوام بنانے کی ضرورت تھی اور نہ وہ حالات موجود تھے جو ایسی جمعیت

کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام کا تخیل بین الاقوامی ہے غلط ہے۔

اقبال۔ آپ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیال و عمل کسی خاص ضرورت کے تابع ہوتے ہیں اور وہ ضرورت ماحول کے تابع ہوتی ہے اس لئے کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

مارکس۔ جی ہاں! خیال و عمل کی نوعیت کا دارومدار انفرادی یا اجتماعی ضرورت پر ہے اور ضرورت کا انحصار ماحول پر ہوتا ہے۔ ماحول سے میری مراد نہ صرف قدرت کے عطیات ہیں بلکہ وہ تمام اشیا بھی ہیں جو انسان کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہیں لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ ضرورت سے متاثر ہو کر انسان کے دماغ میں ماحول کے امکانات کی بموجب چند خیالات پیدا ہوتے ہیں پھر ان خیالات کی بموجب انسان عمل کرتا ہے۔ اس عمل سے انسان کے ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے پھر یہ بدلا ہوا ماحول انسان کی ضرورتوں اور نتیجۃً خیالات کو بدلتا ہے اور پھر ان خیالات کی بموجب انسان اپنے ماحول کو بدلتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'سرمایہ' کے صفحہ اول پر یہ کہہ دیا تھا کہ انسان قدرت پر عمل کر کے اس کو بدلتا ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ میں مذہب کو بھی ماحول کا پابند سمجھتا ہوں۔ کسی زمانہ کے مذہبی اصول میں زمانہ کے ماحول اور ضرورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور چونکہ ماحول اور ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے مذہب کو بھی بدلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے زاویہ نگاہ کے مطابق مذہب کی تفسیر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور اسی لئے آپ کو مذہب میں اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہر وہ شئے جو انسان اور ماحول کی پیدا کردہ ہو اس کو بھی بدلنا چاہیئے۔ مذہب کو بھی آپ انسان اور

ماحول کی پیداوار خیال کرتے ہیں ؟

مارکس۔ قطعی

اقبال۔ لیکن مذہب کا معاملہ دوسرا ہے وہ عشق و نظر کا معاملہ ہے۔ اس میں استحکام بھی ہے اور تبدیلی بھی۔ مذہب ارتقا کے خلاف نہیں ہے لیکن دنیا جہاں ادلتی بدلتی بنتی بگڑتی رہتی ہے وہاں اس میں ایک اٹل اور لافانی عنصر بھی ہے۔

اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا　　نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام

جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

تفسیر لکھنے اور اجتہاد کرنے کا میں قائل ضرور ہوں لیکن میں مذہب کو ماحول کے مطابق بدلنا نہیں چاہتا۔ بلکہ مذہب کے اصولوں کو ماحول کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔

مارکس۔ اقبال صاحب! اصول واضح کرنے ہی میں تو ساری تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ کسی اصول کے الفاظ تو وہی رکھے جاتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بالکل بدل دیا جاتا ہے عورت کی آزادی کا مسئلہ لیجئے جس معاملہ میں آپ بہت رجعت پسند معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک جزدی بات عرض کرتا ہوں فرض کیجئے کہ یہ اصول قائم کیا جائے کہ عورت کو زینت و زیبائش نمایاں نہیں کرنی چاہئے۔ بظاہر بہت معصوم اصول معلوم ہوتا ہے اور یکبارگی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صرف زیبائش ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عورت کی غلامی اور آزادی کا مسئلہ ہے۔ آپ یہ غور فرمائیں کہ لفظ زینت و زیبائش کی کئی طریقہ پر تفسیر کی جا سکتی ہے اور اس لفظ کو کئی مفہوم دئے جا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں ماحول کی ضرورت سے متاثر ہو کر عورت کی زیبائش سے مراد اس کی آواز، چال، ڈھال رنگ روپ چہرہ مہرہ لیا جاتا تھا اور زینت نمایاں نہ کرنے کے اصول کی اس طرح تفسیر کی جاتی تھی کہ عورت مقید ہو کر رہ جاتی تھی اب جبکہ سماجی زندگی میں عورت کے حصّہ

لینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور ماحول بدل رہا ہے تو زینت و زیبائش سے صرف بُندے، چوڑیاں، زیور مراد لی جانے لگی ہے اور عورت کو چہرہ بے نقاب کرنے اور وقت ضرورت نامحرم سے گفتگو کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ زینت کے لفظ کا مفہوم بدل دینے سے عورت مقید سے آزاد ہو گئی۔
اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ زندگی اپنے ساتھ لفظ کا مفہوم بھی بدل ڈالتی ہے۔ جب آپ کسی مذہبی اصول کو مندرجہ بالا طریق پر واضح کرتے ہیں تو گویا آپ الفاظ تو وہی رکھتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بدل ڈالتے ہیں مجھے یہ باور کرنے میں تامل ہے کہ ایک ہی دائرے میں رہ کر اصول اس قدر بدلا جاسکتا ہے کہ اس کے بالکل برعکس نتیجے برآمد ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر آپ الفاظ کا مفہوم بدل کر اصول بدل ڈالتے ہیں اور کہتے یہ رہتے ہیں کہ اصول اپنی جگہ قائم ہے۔ نفس اصول الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کا مفہوم ہوتا ہے۔

اقبال۔ لیکن عورت کی زینت کا مسئلہ تو کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے اگر جزوی باتوں کو ماحول کے اثر سے بدل بھی دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

مارکس۔ چلئے آپ نے یہ تو مانا کہ جزوی امور ماحول کے پابند ہوتے ہیں۔

اقبال۔ اس امر کو مان لینے میں کیا مضائقہ ہے لیکن اصول کو نہیں بدل سکتے۔ مساوات کا اصول لیجئے جب ہم نے یہ اصول مان لیا کہ بنی نوع انسان میں مساوات ہونی چاہئے تو سماجی اور انفرادی زندگی کی تشکیل اس طریقہ پر کرنی ہو گی کہ یہ اصول نہ ٹوٹے لیکن طریقہ کار بدل سکتے ہیں۔

مارکس۔ لیکن دیگر اصولوں کی طرح مساوات کے اصول کا مفہوم بھی ہر زمانہ میں اس زمانے کے ماحول کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ آج سے چند صدی پیشتر جب اجناس تجارت کے لئے بننی شروع ہوئیں اور خرید و فروخت کا سلسلہ اتنا ترقی کر گیا کہ بازار اور منڈیاں پیدا ہو گئیں اور اس امر کا امکان پیدا ہو گیا

کہ غریب انسان بلا غلامی قبول کئے بھی پیٹ بھرے تو اس وقت مذاہب
نے مساوات کو اپنا بنیادی اصول بنایا۔ لیکن غلام رکھنے کی اجازت دینا اصول
کو ماحول کے مطابق لانا تھا۔ مذاہب نے مساوات کا اصول بھی قائم کیا لیکن
غلام، بیگاری اور مزدور کے وجود کی بھی حمایت کی۔ امیر اور غریب کے فرق کو
کو بھی مستقل طور پر سماجی زندگی کا جز بنایا لیکن اس ماحول میں وہی ہو سکتا تھا جو
کچھ کیا گیا لیکن آج کل کے ماحول نے مساوات کے لفظ کو نیا مفہوم دیا ہے۔
آج کل دنیا مساوات قائم کرنے کے یہ معنی سمجھتی ہے کہ سماج کو انفرادی ملکیت سے
نجات دلائی جائے اور اقتصادی مساوات قائم کی جائے۔ میں بھی مساوات کا
قائل ہوں لیکن میرے اور آپ کے مساوات کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ دیکھو مارکس بھی ہمارے مساوات کے اصول کا قائل
ہے تو یہ کہنا غلطی ہوگی کیونکہ اگرچہ میں بھی اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے
مساوات ہی کا لفظ استعمال کرتا ہوں لیکن اس لفظ سے میرا مفہوم مساوات
کے اسلامی مفہوم سے بہت جدا ہوتا ہے۔ کسی زمانہ میں انسان کا ماحول
قدرت کا عطا کردہ تھا لیکن اب انسان نے اپنے عمل سے ایک نیا ماحول
پیدا کیا ہے۔
دریا، پہاڑ، میدان نہیں ہیں بلکہ انجن، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو وغیرہ ہیں۔
یہ نیا ماحول نئے امکانات اور نئی ضرورتیں پیدا کر کے ہمارے دماغ میں
نئے خیالات پیدا کر رہا ہے اور ہم کو نئے طریقہ پر عمل کرنے پر مجبور کر
رہا ہے۔ اس وقت یہ تلقین کرنا کہ پرانے تخیلات کو از سر نو زندہ کیا جائے
رجعت پسندی ہے۔

اقبال۔ تو یوں فرمایئے کہ انسان اپنے کردار کے ماحول میں رہتا ہے۔ انجن وغیرہ کیا
ہیں یہ لوہے کی شکل میں انسان کا صدیوں کا تفکر و عمل ہی تو ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ انجن صدیوں کے انسانی تفکر و عمل کی داستان ہے۔ انجن لوہے

کی شکل میں انسانی ذہن ہے۔ انسان جب تک اپنے تخیل کو مادی شکل نہ دے اس وقت تک اپنی خودی کو نمایاں نہیں کرتا۔

اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فکر سے اپنے آپ کو بدلتا ہے۔

مارکس۔ جی ہاں۔ اس خیال کو میں اس طرح بیان کرتا ہوں کہ طریقہ پیداوار، سماجی تخیل اور عمل کی تشکیل کرتا ہے۔ طریقہ پیداوار مادی شکل میں کسی سماج کا صدیوں کا فکر و عمل ہوتا ہے۔ سماج اپنے فکر سے اپنے فکر کو بدلتی ہے یا یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ انسان اپنے عمل سے اپنے عمل کو بدلتا ہے۔

اقبال۔ درست، آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں۔

مارکس۔ ہمارا خیال ہمارے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہمارا ماحول ہمارے خیال و عمل کا لیکن میں ماحول کو مقدم اور خیال کو مؤخر سمجھتا ہوں۔ یعنی پہلے وجود بعد میں شعور، شعور وجود کا محتاج ہے لیکن جہاں تک خودی کو مستحکم کرنے کا تعلق ہے مجھے آپ سے قطعی اتفاق ہے۔ خودی صرف عمل سے مستحکم ہو سکتی ہے۔

اقبال۔ لیکن ایشیا والوں کی بدقسمتی دیکھئے وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ صرف مراقبہ ہی سے انفرادیت یا خودی مستحکم ہوتی ہے حالانکہ خودی اس وقت جلا پاتی ہے جبکہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ تجربہ کرتا ہے اور بہت غور و فکر کے بعد، بہت سی غلطیاں کرنے کے بعد وہ ایک راہِ راست تلاش کرتا ہے۔ جب انسان وہ کام کرتا ہے جو خدا کرتا ہے اس وقت انسان کی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ خدا بھی مادہ کی شکل بدلتا ہے اور انسان بھی۔ خدا لوہا پیدا کرتا ہے تو انسان بھاڑ وک میں سے نرم لوہا نکال کر اس کا فولاد بناتا ہے۔ میں نے اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیا بان و کوہسار و راغ آفریدی — خیا باں و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

جب تک عمل فکر کا ساتھی نہ ہو اس وقت تک خودی مستحکم نہیں ہو سکتی ۔

خیز و خلاق جہان تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
دم بدم مشکل گرد آسان گزار — دم بدم نو آفریں و تازہ کار

انسان خود مختار پیدا ہوا ہے اور خیر و شر کرنے پر قادر ہے ۔ وہ سورج کی طرح ایک راستہ چلنے پر مجبور نہیں ۔ عمل کی آزادی ہی خودی کو مستحکم کرتی ہے اور یہ معاملہ صرف افراد کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ قوموں کی خودی بھی آزادئ عمل سے مستحکم ہوتی ہے ۔ میں انسان کو جنت سے نکالے جانے کے قصہ کو بھی اسی زاویہ سے دیکھتا ہوں ۔ جنت میں انسان سورج کی طرح ایک قانون میں جکڑا ہوا تھا ۔ وہ خیر ہی خیر کر سکتا تھا اور اس پابندی کی وجہ سے وہ اپنی انفرادیت کو مستحکم نہیں کر سکتا تھا ۔ جنت سے نکالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے آزادئ عمل حاصل کی اور خیر و شر کا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا اور یہی ایک راستہ خودی کو مستحکم کرنے کا ہے کہ انسان اپنے عمل کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر ترقی کی راہیں ڈھونڈے ۔

از گِل خود آدمی تعمیر کن — آدمی را عالمے تعمیر کن

مارکس ۔ مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے ۔ انسان اور اس کا ماحول آپس میں ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں ۔ انسان اسی وقت مہذب کہلاتا ہے جبکہ وہ فکر و عمل سے قدرت کی طاقتوں پر قابو پا لیتا ہے اور اپنے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتا ہے جس میں رہ کر وہ بہتر انسان بن سکے ۔

اقبال ۔ لیکن ، میں خودی کی ترقی کے لئے ایک اور امر بھی اہم خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی دوسرے کے افکار و عمل کی کہانی سے خودی طاقتور نہیں ہوتی بلکہ کمزور ہوتی ہے ۔ فرد کی خودی اس کی اپنی سماج کی کلچر ، اپنی تہذیب و تمدن میں

رہ کر ترقی کر سکتی ہے کسی دوسری قوم کی کلچر اور تہذیب کی تقلید سے خودی کمزور ہوتی ہے ۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش ۔ براہ دیگراں رفتن عذاب است

مارکس ۔ اب تو دنیا کی مختلف قوموں کی کلچر ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک نئی کلچر پیدا ہو رہی ہے جو تمام دنیا کی مشترکہ کلچر ہوگی ۔ یہ کلچر تمام دنیا کے مزدوروں کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوگی ۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک و قوم کی خاص کلچر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص دور میں کسی خاص طبقہ کی خاص کلچر ہوتی ہے مثلاً اگر یورپ کے جاگیردار دور کے جاگیردار طبقہ کی کلچر کا مقابلہ ہندوستان کے جاگیردارانہ دور کے جاگیردار طبقہ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کے جاگیردار اور ہندوستان کے جاگیردار میں کوئی فرق نہیں اسی طرح یورپ کے بیگاری اور ہندوستان کی بیگاری کی کلچر ایک تھی ۔ اس وقت جو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ مشرق یورپ کی کلچر اختیار کرتی جا رہی ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ یورپ میں سرمایہ دارانہ دور شروع ہوئے مدت ہوئی اور اس دور نے یورپ کو ایک خاص کلچر دی اب چونکہ ایشیا میں بھی وہی سرمایہ دارانہ دور حاوی ہوتا جا رہا ہے ۔ اس لئے ایشیا میں سرمایہ دارانہ دور کی کلچر رواج پاتی جا رہی ہے لیکن جیسا کہ ہر عبوری زمانہ میں ہوتا ہے یہ تبدیلی بہت خرابی کے بعد اپنی اصلی شکل اختیار کرے گی ۔ کلچر بھی ارتقائی شے ہے ۔ ایک ہی ملک میں مختلف طبقوں کی مختلف کلچر ہوتی ہے ۔ جیسے جیسے ماحول بدلتا جاتا ہے کلچر بدلتی جاتی ہے ۔ مختلف طبقوں کی محبت، مروت، وفاداری، خودداری، حیا و شرم ۔ سچ جھوٹ کے معیار مختلف ہوتے ہیں ۔

اقبال ۔ یہ تو درست ہے کہ دنیا میں ایک مشترکہ کلچر نمودار ہو رہی ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اپنی ہی کلچر کو ضرورت کے مطابق بدلنا چاہیئے ۔ میں کسی دوسرے

کا بچہ خواہ وہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اپنی بغل میں نہیں لے سکتا
میں اپنا ہی بچہ پیدا کرنے اور پرورش کرنے کا قائل ہوں ؎

در ہوائے چمن آزاد پریدن آموز	تا کجا در تہ بال دگراں می باشی

مارکس ۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ جس طرح ایک عورت جوانی کو کار آمد نہ بنائے تو ۵۰ برس کے بعد اگر چاہے بھی تو اولاد پیدا نہیں کر سکتی اور کسی دوسرے کا بچہ گود لینے پر مجبور ہوتی ہے اسی طرح اگر ایک قوم مدت تک بے عمل رہے تو وہ اپنی تخلیقی قوت کھو دیتی ہے اور پھر اگر ترقی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی بلکہ اس کو ترقی یافتہ قوم کا طریقہ کار اور تہذیب و تمدن اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ ایشیا کی اقوام ترقی کی دوڑ میں اس درجہ پیچھے رہ گئی ہیں کہ اب ان کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ نہ صرف مغرب کا آلاتی طریقہ پیداوار اختیار کریں بلکہ جو اشتراکی کلچر اس وقت یورپ میں پیدا ہو رہی ہے اس کی تعمیر میں پورا حصہ لیں ۔

اقبال ۔ دلا نارائی پروانہ تا کے	نگیری شیوہ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز	طواف آتش بیگانہ تا کے

مارکس ۔ لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ ایشیا کا اپنا سوز تو ختم ہو گیا ۔ اب تو ایشیا میں تخلیقی شعلہ اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب سے تفکر و تدبر صنعت و حرفت کی چنگاری مستعار لے ۔

اقبال ۔ از سوال آشفتہ اجزائے خودی	بے تجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر	از گدائی گدیہ گر نادار تر

مارکس ۔ میں کب کہتا ہوں کہ آپ گداین کر سوال کریں یورپ کی تہذیب و تمدن صنعت و حرفت قرض لیجئے اور یہ قرض معہ سود کے ادا کر دیجئے گا ۔ یورپ نے بھی تو ایشیا سے علم و فضل لیا مغرب کو مشرق ہی نے مذہب دیا یہ یورپ کی قابلیت ہے کہ انہوں نے ایشیا سے قرض لے کر کام شروع کیا

اور اس کو اتنا بڑھایا کہ اب وہ اس قابل ہیں کہ ایشیا کو قرض دیں۔ آخر ایشیا یورپ سے قرض لینا کیوں کسرِ شان سمجھتا ہے۔

اقبال۔
ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلی دگرے درخورِ تقاضا نیست

مارکس۔ لیکن یورپ نے بھی تو ایشیا کے شعلہ سے اپنی آگ روشن کی تھی۔ اب ایشیا کو یورپ کی چنگاری سے اپنی شمع روشن کرنے میں کیوں عار معلوم ہوتی ہے۔

اقبال۔
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

مارکس۔ لیکن ہندوستان کی قوتِ عمل تو شل ہو چکی ہے اب وہاں مینا و جام کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

اقبال۔ لیکن قوتِ عمل کسی زمانہ میں تو جدت طراز تھی۔ اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ کسی زمانہ میں ایشیا یورپ کا استاد تھا آخروہ تخیلات اور جدتِ عمل ایشیا ہی میں پیدا ہوئے تھے جن کی بدولت وہ یورپ کا استاد بنا وہ تخیلات آج بھی ہماری روایات اور کتابوں میں موجود ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے۔ میرا مقصدِ حیات صرف یہ رہا ہے کہ ان پرانے تخیلات کو از سرِ نو جگا دیا جائے۔ میں مغربی فکر و عمل کا مخالف نہیں ہوں میں نے تو خود کہا ہے ؎

علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ ‏ ‏ ‏ مغربی باید نہ ملبوس فرنگ
قوتِ افرنگ از علم و فن است ‏ ‏ ‏ از ہمیں آتش چراغش روشن است

لیکن مغربی تہذیب و تمدن کے جو خراب پہلو ہیں میں ان کا مخالف ہوں یورپ کی عریانی مجھے نہیں بھاتی اور جس درندگی کا ثبوت یورپ آج دے رہا ہے وہ اس کی کلچر کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔

مارکس۔ خراب پہلو۔ خوب اور ناخوب کی تکرار ہی تو ارتقائی حرکت پیدا کرتی ہے۔ شیطان کی کارفرمائی ہی سے تو مشت خاک میں ذوق نمو ہے۔ اگر رزم خیر و شر نہ جاری رہے تو ارتقا ہی بند ہو جائے۔ یورپ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ درندگی کا مظاہرہ نہیں ہے۔ بلکہ جیسا آپ نے کہا ہے ؎

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جب بچہ ہوتا ہے تو ماں کو درد و تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کوئی شے بلا درد و کرب کے پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب ایک سماج کے بطن سے دوسری سماج نکلتی ہے تو تمام درد و کرب محسوس کرتی ہے۔ یورپ میں جہان نو پیدا ہو رہا ہے لیکن ایشیا والے آج کل مغربی تہذیب کے متعلق آپ کا یہ شعر بہت پڑھتے ہیں ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کا ہنگامہ خودکشی نہیں بلکہ جراحی ہے۔ بنی نوع انسان کے جسم پر سرمایہ داری کا جو پھوڑا نکل آیا تھا اس میں شگاف دیا جا رہا ہے رہا یہ امر کہ ایشیائی قوت تخلیق کو پرانی روایات و تخیلات کے ذریعہ سے از سر نو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ آپ نے خود ایک جگہ اس قول کی تائید کی ہے کہ تاریخ عالم کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ جن روایات و اقوال کو کسی قوم نے مردہ ہوتے دیا ہو ان خیالات و اقوال کے ذریعہ سے اس قوم میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکتی' میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ پرانی روایات کو زندہ کر کے قوم کو زندہ نہیں کر سکتے۔ جس طرح پرانی دوا اثر کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اسی طرح پرانی روایات اور کہنہ اصطلاحات و تخیلات بھی انسانوں پر اثر کرنا چھوڑ دیتے ہیں یا یوں کہیئے

کہ جس طرح مدت تک شراب پیتے پیتے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے کہ پھر پرانی خوراک اس پر اثر نہیں کرتی اسی طرح پُرانی روایات سنتے سنتے مسلمان ان کے سننے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب وہ ان پر اثر نہیں کرتیں ؎

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

(۱۹۴۱ء)

مرزا صفدر بیگ

اقبال اور اشتراکیت

ایک صدی ہوئی کہ جرمنی کی سرزمین میں ایک محسنِ خلق نے جنم لیا۔ چنانچہ اُسی کے فیضان کا اثر ہے۔ کہ آج غریبوں کی تاریک دنیا میں امید کی کرن نمودار ہو رہی ہے۔ اس نے دنیا کے مزدوروں کو ایک حیات افروز پیغام دیا تھا۔ اور انکی تکالیف کا نقشہ ایسے پُر درد الفاظ میں کھینچا کہ اگر پتھر سے پتھر دل بھی پڑھے تو پسیج کے رہ جائے۔ اُس نے غریبوں کو اُبھارا تھا۔ کہ اُٹھو اب دنیا میں تمہاری حکمرانی ہو گی۔ اور اس نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ نظام سرمایہ داری میں اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتا دیکھوں گا۔ گو اسے یہ دیکھنا تو نصیب نہ ہُوا۔ لیکن اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس کی پیش گوئی اس کی موت کے بتیس سال بعد حرف بحرف پوری ہوئی۔ اس کی ابتدا روس سے ہوئی۔ اور آج یہ حالت ہے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہے۔ چنانچہ اٹلی جو فسطائیت کا مرکز ہے۔ وہاں بھی اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی لہر نے مسولینی کو ہراساں کر رکھا ہے اسی طرح انگلستان بھی جو کہ ہر ایک قسم کی آزادی کا دعویدار ہے فسطائی "مداریوں" کے ساتھ مل کر اشتراکیت کے سیلِ رواں کو روکنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے ان خداوندوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ سوشلزم کا آنا لابدی ہے۔ دنیا کی کوئی قوت اس کی آمد کو روک نہیں سکتی۔

اقبال اس حقیقت کو اس وقت سمجھ گیا تھا۔ جب کہ ہندوستان کی سرزمین سوشلزم کے نام سے آشنا نہ ہوئی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ مزدور اور غریب سوشلزم کا خیر مقدم بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ اقبال کا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے۔ جو غربت

اور افلاس کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے ۔ وہ قوم جو کل حکمران تھی ۔ اور آج محکوم ہے ۔ وہ قوم جو کل اشرفیوں کے انبار میں کھیلتی تھی ۔ آج کوڑی کوڑی کی محتاج ہے ۔ نیز اقبال خود بھی سرمایہ دار نہ تھا ۔ یہ دو قومی اور ذاتی وجوہ تھیں ۔ جن کی بنا پر اقبال نے اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ۔

دَورِ جدید کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے آخر سے ہوتا ہے ۔ مشین کی ایجاد نے پرانے سوشل نظام کو درہم برہم کر دیا تھا ۔ پرانے فیوڈل نظام کی جگہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری نے لے لی ۔ فیوڈل نظام کی تباہ کاریوں کی حقیقت ہر ایک پر ظاہر ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام تھا ۔ جس میں بیچارے کسان کی کوئی بھی قدر و قیمت نہ تھی ۔ اس پر یہ "خدائی" فرض عائد تھا ۔ کہ سرمایہ دار کی بھٹی کا ایندھن بنا رہے ۔ آپ خواہ بھوکا ہی مرے لیکن فیوڈل لارڈ کے آرام و آسائش میں فرق نہ آنے دے ۔ قصہ کوتاہ حیوان اور انسان میں کوئی تمیز نہ تھی ۔ دو مشہور علمی اور مذہبی تحریکوں نے بھی نئے مسائل سامنے لا کھڑے کئے تھے ۔ پرانے رومن کیتھولک مذہب کا مقصدِ وحید صرف غریبوں کی اسامی بازی (EX-PLOITATION) رہ گیا تھا ۔ پوپ تمام عیسائی دنیا کا روحانی اور دنیاوی پیشوا سمجھا جاتا تھا ۔ پوپ کی من مانی کاروائیوں کے خلاف پندرھویں صدی عیسوی میں ایک ایسی جماعت اٹھی جس نے مذہب کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔ بہت سی تکالیف اٹھانے کے بعد ان کو کامیابی نصیب ہوئی ۔ چونکہ یہ تحریک پوپ کے خلاف تھی ۔ اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ عیسائی دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ۔ اور تمام پروٹیسٹنٹ بادشاہوں نے پوپ کا جوا اتار پھینکا ۔ اس وقت وطنیت کے تصور نے جنم لیا ۔ اس کے بعد "تحریک احیائے علوم" نے اس تصور کو اور تقویت دی ۔ اب لوگ ہر چیز کو عقل پر پرکھنے لگے ۔ سائنس کا دور دورہ شروع ہوا ۔ مذہب اور سائنس دو متضاد چیزیں ہیں ۔ مذہب کا کام بغیر سوچے سمجھے یقین لانا ہے ۔ اور سائنس کا مقصد

تحقیق کرنا اور کھرے کھوٹے کی تمیز کرنا ہے۔ چنانچہ مذہب اور سائنس کی جنگ میں جیت سائنس کی ہوئی۔ روحانیت کی جگہ مادیت نے لے لی۔ اور مذہب کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔ اور تصور وطنیت دن بدن تقویت پکڑنے لگا۔ اس کے بعد مشین کی بنی ہوئی اشیاء کی کھپت کے لئے منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اور اسی وطنیت کے نام پر کمزور قوموں کو کچل دیا گیا۔ اور یورپ کی طاقتور اقوام ایشیا اور امریکہ کے حصے بخرے کرنے کے لئے آپس میں دست و گریباں ہو گئیں۔ اور یورپ بہت سی آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور اب یہ قومیت ہی ہے۔ کہ جس کے نام پر بیشمار خونریز جنگیں لڑی گئیں۔ اور اس کی بھینٹ لاکھوں انسان اور کروڑوں من سونا اور چاندی، چڑھایا گیا۔ وطن کو ایک قسم کا دیوتا سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ اقبال بھی اوائل میں وطنیت کے راگ الاپتا نظر آتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ۔ ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

لیکن اقبال کی حساس طبیعت فوراً سمجھ گئی۔ اور اس نے ایک تنگ دائرہ کو خیر باد کہہ کر ایک وسیع مملکت میں قدم رکھا۔ اس نے دیکھا کہ یہی وطنیت ہے۔ جو تمام جبر و تشدد کا منبع ہے۔ اور جب دنیا کے تمام مزدوروں اور غریبوں کے مسائل ایک ہی ہیں۔ تو بے اختیار وطنیت کی ہجو میں اس کے منہ سے نکل گیا۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

دنیا کا پرولتاری (PROLETARIAT) مصیبت کے بحرِ بیکراں میں غوطے کھا رہا ہے۔ اگر وہ سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو دنیا کی تمام سرمایہ پرست

قوتیں اس کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہیں۔ نظام اشتراکیت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ تمام دنیا میں یہ نظام رائج نہ ہو۔ نیز تمام دنیائے پرولتاری کا مقصد صرف ایک ہی ہے۔ کہ ہوس کا جو کہ اس نظام سرمایہ داری اور جذبۂ وطنیت کی پیداوار ہے۔ خاتمہ کیا جائے۔ اقبال نے اس کا اظہار یوں کیا ہے۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

اسلام کا نظریہ بھی وطنیت کے متعلق یہی ہے۔ اسلام اور سوشلزم کے بہت سے اصول آپس میں ملتے جلتے ہیں اور اقبال کا سوشلزم اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اس لئے ہم اقبال کو اگر "اسلامی سوشلسٹ" کہیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ وہ "ترانہ ملی" میں اسلام کے نظریۂ وطنیت کی یوں تشریح کرتا ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

سوشلزم کے حامیوں کے نزدیک اس بوسیدہ سوشل نظام کی ہر ایک چیز قابلِ نفرین ہے۔ وہ ایک مکمل تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ ایک ایسے انقلاب کے متمنی ہیں۔ جس کے بعد مزدور کو عزت اور آزادی کی روٹی میسّر ہو گی۔ نظام سرمایہ داری کی ہر ایک چیز ان کے ارادوں کی تکمیل میں مزاحم ہوتی ہے۔ چنانچہ "قومیت کا نظریہ" سرمایہ داروں کی ایجاد ہے۔ اور وطنیت بھی مزدوروں کے خلاف ایک حربہ ہے۔ سرمایہ دار کے قانون کا مقصد غریبوں کو دبانا ہے۔ اسکول ایک ایسا ادارہ ہے۔ جہاں غلامی کا سبق دیا جاتا ہے۔ مذہب لوگوں کے لئے افیون کا کام دیتا ہے۔ غرضیکہ موجودہ نظام کے تمام اداروں کا مقصد سرمایہ پرستوں کے اصولوں کی نشر و اشاعت کرنا ہے۔ اور سرمایہ دارانہ اخلاق ایک مکر اور فریب

ہے ۔ ایک جال ہے جو غریب کو پھانسنے کے لئے بچھایا گیا ہے ۔ مذہب ایک ایسی صنعت ہے ۔ جس کی بنا غریبوں کی اسامی بازی ہے ۔ اقبال نے اس راز کو اس طرح طشت از بام کیا ہے ۔

جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمایش

مذہب ایک آخری ہتھیار ہے ۔ جس کو سرمایہ دار اپنے قیام کے لئے استعمال کر رہا ہے ۔ تاریخ کا ایک ایک حرف شاہد ہے ۔ کہ مذہب نے ہمیشہ سرمایہ داروں کو اپنے دامن میں پناہ دی ہے ۔ مذہب کے تمام دعویٰ ہائے غریب نوازی باطل ثابت ہو چکے ہیں ۔ لیکن پھر بھی مذہب ایک ایسی چیز ہے ۔ جس نے غریب کو مدت سے دھوکا دے رکھا ہے ۔ مذہب اگر اپنے عمل سے غریب کی مدد ثابت کرے ۔ تو اشتراکیت کے حامیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ۔ لیکن وائے ناکامی حقیقت ہے تو یہ ہے ۔ کہ مذہب اپنے دعوئ غریب نوازی کو عملی طور پر ثابت نہیں کر سکا ۔ اقبال جو "اسلامی سوشلزم" کا حامی ہے ۔ اس نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے لیکن کلیسا کی خوب مذمت کی ہے ۔ مذہبی اور مادی دونوں قوتوں نے مل کر سامراج کی بنیاد رکھی ہے ۔ چنانچہ تاریخ کے ہزاروں اوراق ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں ۔ کہ مذہب اور دوسری مادی اغراض کے لئے ہزاروں ہولناک جنگ لڑے گئے ۔ غرضیکہ اس موجودہ نظام کی ہر ایک چیز مزدور اور غریب کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے ۔ اقبال نے ان تمام چیزوں کی ایک ہی شعر میں وضاحت کر دی ہے ۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

خدا کی تشریح لینن نے ان الفاظ میں کی ہے ۔ "توہمات کا ایک ایسا نظام ہے جو خود ہی انسان پر زبردستی نازل ہوا ہے ۔ اور انسان ان "قدرتی قوتوں" اور

اجتماعی جبر و تشدد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس لئے خدا کا تصور جماعتی جدوجہد کو دباتا ہے۔ روز آفرینش سے اس تصور نے غلامی اور ظلم و تشدد کی پرورش کی ہے۔ مذہب یا کسی قسم کا دیوتا ایک ایسا زہر ہے جو خودی عقل اور مادہ تحقیق کو فنا کر دیتا ہے۔ اس لئے ان سب کے خلاف ایک زبردست جنگ کی ضرورت ہے۔ خدا کے نام پر ہزاروں جنگ لڑے گئے۔ صلیبی لڑائیوں میں لاکھوں انسانوں کا خون صرف خدا کی خوشنودی خاطر کے لئے بہایا گیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی جنگوں کا مقصد بھی یہی تھا۔ بہت سے پرانے مذہب ایسے ہیں کہ دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لئے انسانی قربانی کی جاتی ہے۔ خانقاہوں میں مجاوروں کے پیٹ بھرنے کے لئے چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ خدا کو خوش رکھنے کے لئے پیروں اور فقیروں کو نذر نیاز دی جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ مذہب کی تعلیم خواہ کچھ ہو۔ زبانی جمع خرچ کی بجائے ہم عمل چاہتے ہیں۔ قصہ کوتاہ ایک غریب آدمی کے لئے مذہب بجائے نجات کے اس کا خون چوسنے کا ذریعہ ہے۔ اقبال کا نظریہ اس کے متعلق یہ ہے۔

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

لیکن یہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ کہ اقبال کے سوشلزم کے دو پہلو ہیں۔ پہلے اگر وہ سائنٹیفک سوشلزم کی تشریح کرتا ہے۔ تو بعد میں "اسلامی سوشلزم" کا حامی نظر آتا ہے۔ سرمایہ دارانہ پروپیگنڈا کے طفیل یہ بات مشہور ہو گئی تھی۔ کہ مرنے سے کچھ مہینے پہلے لنن نے توبہ کر لی تھی۔ اور خدا کا اقرار کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک اسلامی سوشلسٹ لنن کی زبان سے اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

اقبال کا خیال ہے۔ خدا کے تصور کے ساتھ ہی غریبوں کی تکالیف

کا حل ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ خدا غریبوں کی حکمرانی چاہتی ہے۔ چنانچہ "فرمانِ خدا" میں خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے۔ کہ

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

پھر ارشاد ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

موجودہ اقتصادی نظام کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ یہ انصاف کا کتنا خون ہے۔ کہ وہ دولت جو مزدور اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے۔ ایک نہایت ہی قلیل اقلیت کے ہاتھ چلی جاتی ہے۔ "دکھ بھرے بی فاختہ کوّا انڈے کھائے"۔ عجیب نظام ہے کہ ایک کو تو شراب انگور اور مٹن چائے کھانے کے لئے ملتا ہے۔ تو دوسرے کو نانِ شبینہ بھی میسّر نہیں۔ ایک فلک بوس محلوں کا باسی ہے۔ تو دوسرے کو ٹوٹی پھوٹی کٹیا بھی نصیب نہیں ہے۔ الغرض اس نظام کا مقصد جبر اور تشدد کے سوا اور کچھ نہیں۔ دنیا کے اس مظلوم طبقے کے لئے ضروری ہے۔ کہ یہ اپنی قوم کے ظالم طبقہ کے لئے سامانِ عیش بنے۔ لیکن جب مظلوم طبقہ اپنی حالت درست کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ تو جواب ملتا ہے۔ کہ اس کو اس کا حق نہیں۔ انسانوں کا نوّے فیصدی طبقہ مزدور پیشہ ہے۔ اور یہ بے انصافی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ دس فیصدی انسان صرف اپنے سرمایہ کے بَل بوتے پر دنیا پر حکمراں ہیں۔ اور موجودہ تمام جنگوں کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ بیچارے مزدور کے پاس صرف ایک ہی دولت ہے۔ اور وہ "محنت" ہے۔ جس کو وہ اپنی سادگی سے لٹا رہا ہے۔ اور جس کو سرمایہ دار آسانی کے ساتھ خرید لیتا ہے۔ یہ سادہ لوح انسان خود اپنے ہی خون سے سرمایہ داری کے کھیت کو سیراب کر رہا ہے۔ چنانچہ مزدوروں کے ترجمان نے اس حقیقت کو اس طرح آشکار کیا ہے۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار   انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

سٹالن نے کہا ہے۔ ”تمام حقوق مزدور کی ملکیت ہیں۔ اور کوئی دوسرا کسی قسم کا حق نہیں رکھتا۔“ اس کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ ایک نکھٹو سرمایہ دار کا کیا حق ہے۔ کہ چوبیس گھنٹے بیٹھے رہ کر غریب مزدور کا خون چوسے۔ اُس کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ پودا جس کو مزدور خود اپنے ہی ہاتھ سے لگاتا ہے۔ اور اپنے ہی خون سے سیراب کرتا ہے۔ اس کا پھل بھی مزدور ہی کا حصّہ ہے۔ پھسڈی سرمایہ دار کا اس پر کوئی حق نہیں۔ چنانچہ اقبال مزدور کو اس حقیقت سے اس طرح روشناس کرتا ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تُو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تُو

اقبال مزدور کا حامی ہے۔ اس کے خیال میں سرمایہ دار کو مزدور کی محنت کا پھل حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اور سوشلزم کا مقصد بھی یہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اُسے ناسازگار
حکم حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اقبال کو مزدور کی سادگی اور بے سمجھی کا افسوس ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے۔ یہ دنیا کا محسنِ محترم ہوتے پر بھی سرمایہ داروں کی غلامی میں مبتلا ہے۔ تو اقبال کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔

وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تُو، مینا بھی تُو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اقبال غریب کو امیر کے خلاف صف آرا دیکھنا چاہتا ہے۔ اور یقیناً سوشلزم کا سب سے بڑا مقصد اس وقت یہی ہے۔ چنانچہ ”فرمانِ خدا“ میں فرشتوں

کو حکم ہوتا ہے۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ایک جگہ ارشاد ہے۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اقبال کا مذہب سجدو سجود کی بجائے خدمتِ خلق ہے۔ اور اشتراکیت کا مقصدِ وحید بھی یہی ہے۔ اقبال اس چیز کو اس طرح واضح کرتا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

سُود کا لین دین دنیا پر ایک لعنت عظیم ہے۔ سود خور انسان میں عزتِ نفس کا مادہ بالکل نہیں رہتا اس کا دل رحم اور مروّت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس کی ہوس کاری انتہا سے بڑھ جاتی ہے۔ غریب کا خون چوسنا اس کے لئے بالکل معمولی بات ہے۔ اور وہ سود در سود کی لعنتوں میں غریبوں کی پُشت در پُشت کو مبتلا رکھتا ہے۔ بیچارہ غریب اُس کے خون آشام پنجے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ سود غریبوں کو غلامی اور منت و سماجت پر مجبور کرتا ہے۔ اور ان میں احساسِ خودی کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی لئے سوشلسٹ اور اسلامی نظام میں سود کا لین دین بند ہے۔ لازمی طور پر اقبال کا نظریہ سود کے متعلق یہ ہے۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

موجودہ نظام سرمایہ داری میں آزادی اور جمہوریت ایک فضول چیز ہے۔ جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں موجودہ جمہوری نظام میں حکومت کی باگ ڈور بڑے بڑے ساہوکاروں، بسوہ داروں، بنکوں کے مالکوں، جہازوں اور کانوں کے مالکوں کے ہاتھ میں ہے۔ بورژوا جمہوریت ایک ایسا طرزِ حکومت ہے۔ جس سے کام کرنے والی جماعت کے مطالبات کو اصل سے بے اصل کر دیا جاتا ہے۔

اور ان کو اعتدال کے رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے ۔ انقلابی پرولتاری اور پونجی پرست کے درمیان موجودہ جمہوری نظام ایک فصیل ہے ۔ جو اُن کی آویزش کو کچھ عرصے کے لئے روکے رکھتا ہے ۔ چنانچہ بورژوا جمہوریت تھی ۔ جس کے نام پر اور جس کی حفاظت کے لئے پچھلی جنگ عظیم لڑی گئی ۔ ایسی جمہوریت شاید سرمایہ داروں کے لئے تو باعث تسکین ہو ۔ لیکن غریبوں کے پھانسنے کے لئے یہ ایک ایسا جال ہے ۔ جس سے چھٹکارا آسان نہیں ۔ اسی لئے اقبال کئی بار اس بورژوا جمہوریت کے خلاف اظہار نفرت کرتا ہے ۔ مثلاً

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبال اس موجودہ جمہوری نظام کا خاتمہ چاہتا ہے ۔ اس کا مقصد پونجی داروں کی گرفت کو مضبوط کرنے کے سوا کچھ نہیں ۔

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

کارل مارکس کی پیشگوئی جس کی ابتدا روس سے ہوئی تھی ۔ اب تمام دنیا میں پوری ہوتی نظر آتی ہے ۔ سوشلزم آ رہا ہے ۔ دنیا کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی ۔ پرانا نظام سرمایہ داری اب بالکل بوسیدہ ہو چکا ہے ۔ اسکی وقعت اب بالکل خس و خاشاک کی سی ہے ۔ جس کو ایک ہی ہوا کا تند جھونکا اُڑا کر لے جائے گا ۔ اقبال اس حقیقت کو اچھی طرح جانچ گیا ہے ۔ وہ اس نظام کا سخت دشمن ہے ۔ اس کا یقین ہے ۔ کہ یہ نظام عنقریب فنا ہونے والا ہے ۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک ایسے دَور کا آغاز دیکھ رہا ہے ۔ جس میں مزدور کو چین کی زندگی کرنی نصیب ہو گی چنانچہ کیا خوب اس حقیقت کا اظہار کیا ہے ۔

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دَور سرمایہ داری گیا　　تماشا دیکھ کر مداری گیا

اقبال مزدور کو اس کی طاقت کا احساس دلاتا ہے۔ اور اُسے ایک ایسے دَور کی سیر کراتا ہے۔ جس میں اس کی تمام تکالیف کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بعد میں اسے دعوتِ عمل دیتا ہے۔ اور سوئے ہوئے شیر کو اس طرح جگاتا ہے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

موجودہ حالت میں کسان اور مزدور کی فرسودہ حالت ناقابلِ بیان ہے۔ اس کی کہانی دُکھ اور درد کی کہانی ہے۔ جس کو سنانے سے دل کڑھتا ہے۔ اقبال اس تکلیف کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہُوا مُردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

گو مزدور اور کسان مصیبت کے چنگل میں پھنسا ہُوا ہے۔ اور ظاہرہ اس کی نجات بڑی مشکل ہے۔ لیکن اقبال ظلمتِ شب میں کرنِ امید کو دیکھ رہا ہے۔ وہ دیکھتا اور سوچتا ہے۔ کہ

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خُوں

پھر خود ہی فرمانِ خدا کو پیشِ نظر رکھ کر پیشین گوئی کرتا ہے۔ کہ

حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہٖ تستعجلون"

اقبال کارل مارکس کی زبان سے اس چیز کا اعلان بیانگ دُہل کرتا ہے۔ کہ

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش

لینن جب خدا کے حضور میں دعا کرتا ہے۔ تو وہ مزدوروں سے بے انصافی کا گلہ کرتا ہے۔ اور ان کی تکالیف کے حل کے لئے سخت بے چین ہے۔ اس لئے وہ خدا سے دست بدعا ہے۔ کہ اس نظام سرمایہ داری کو فوراً تباہ کیا جائے چنانچہ کہتا ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

ہمارے نام نہاد سیاسی لیڈر جن کو غریب نوازی کا بڑا دعوٰے ہے۔ پرولتاری کے بڑھتے ہوئے جوش کو روکنے کے لئے موجودہ نظام میں تھوڑی بہت اصلاح کر دیتے ہیں۔ تاکہ یہ نظام جو اپنے آخری دموں پر ہے۔ کچھ دن اور بچ جائے۔ چنانچہ یہ مصلح قوم (REFORMIST) حکمران جماعت کے ہاتھ میں پرولتاری کی بیداری اور جد و جہد کے خلاف حربہ ہیں۔ دنیا کی موجودہ تکالیف کا حل معمولی اصلاح سے ناممکن ہے۔ اس کے لئے ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہے۔ اگر غریب اور مزدور ذرا بیدار ہوتا ہے۔ تو اصلاح (REFORMISM) ایک ایسا حربہ ہے۔ جس سے اُسے پھر کچھ عرصہ کے لیے سُلا دیا جاتا ہے۔ اقبال اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ اس چیز کا متمنی ہے۔ کہ بُرائی کے درخت کی شاخوں کو کاٹنے کی بجائے اس کو جڑ سے ہی اکھیڑ دینا چاہیئے۔ تاکہ اس کے دوبارہ ہرا ہونے کی امید باقی نہ رہے۔ اس کے نزدیک جب بہار کی آمد آمد ہو تو زخم گل کے واسطے مرہم کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دار بڑا ہی زیرک اور چالاک آدمی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ "سارا دھن جاتا دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ" چنانچہ وہ اپنی تباہی کو دیکھ چکا ہے۔ اب وہ یقیناً ایسی تدابیر سوچے گا۔ جس سے وہ مکمل تباہی سے بچ جائے گا۔ اس لئے وہ مزدور کے چند معمولی مطالبات تسلیم کر لیتا ہے تاکہ انقلاب کی بڑھتی ہوئی آگ اُسے جلا کر راکھ نہ کر دے۔ اقبال نے اس چالاکی

کار از گذشت از بام کرتے کے بعد اس "اصلاح" کے خلاف یوں اظہار نفرت کیا ہے۔ کہ

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

اقبال طوفان اور انقلاب کا حامی ہے۔ کہ جس کے بعد اس دنیا میں مزدور اور کسان کی حکمرانی ہوگی چنانچہ وہ ان کو یوں پیام بیداری دیتا ہے۔

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو

آج ہم ہندوستان میں سوشلزم کا بہت شور و غوغا سنتے ہیں۔ لیکن شاید ہمارے بہت سے سوشلسٹ بھائی اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ کہ اقبال نے سوشلزم کا پرچم اس وقت بلند کیا تھا۔ جب ہندوستان کے سیاسی مطلع پر تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور سوشلزم کا نام لینے کی سزا زنداں کی تاریک کوٹھری تھی۔ اقبال کی شاعری سوشلزم کی تقویت کے لئے وہ کچھ کر رہی ہے۔ جو شاید ہمارے دھواں دھار مقرر سوشلسٹوں سے بھی نہ ہوسکا۔ یقیناً شاعر کا پیام جانی قربانی سے بھی گراں قدر ہے۔ اور یہ اقبال کے فیضان کا ہی اثر ہے۔ کہ آج ہندوستان کے چپے چپے میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہے۔ اور غریب قوم کے غریب شاعر کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت قریب آپہنچا ہے۔

(۱۹۳۸ء)

شاعرِ بے مثل:

- بشیر احمد ۔ "اقبال"
- مخدوم محی الدین "مجاہد اقبال"
- لطیف النساء بیگم ۔ "اقبال اور اس کی شاعری"
- شجاع الدین "ترجمانِ حقیقت کی ایک فلکی سیر"
- اکرام قمر ہوشیار پوری "علامہ اقبال کی شاعری"۔
- محمد احمد سبزواری "علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال"
- میر سراج الدین علی خان ۔ "اقبال کی شاعری کا اہم پہلو"
- میاں ارشد محمود۔ "اقبال اور جدید اردو شاعری"۔
- خواجہ حمید الدین شاہد ۔ کلامِ اقبال کی بعض خصوصیتیں
- سید احمد جعفری ۔ "اقبال کی حب الوطنی"
- محمد اسماعیل مسلم "اقبال کی تعلیم جوانمردی و زندہ دلی
- جہاں بانو ۔ "نذر اقبال"
- زکیہ احمد "ہمارا قومی شاعر: اقبال"

بشیر احمد

اقبال

یہ لاہور ہے، لاہور جہاں اُردو کا شہرہ آفاق شاعر اقبال رہتا ہے۔ جہاں میں بول رہا ہوں وہاں سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر وہ شخص اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے جس پر آج ایک دنیا کی نظریں جمی ہیں۔ وہ پلنگ پر لیٹا یا بیٹھا ہوا ہے وہ عام طور پر اپنے گھر کے اندر ہی رہتا ہے صحت کی کمزوری نے اُسے اس خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ وہاں وہ تنہا ہے۔ لوگ جب موقع پاتے ہیں وقتاً فوقتاً اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُسے ان کی ملاقات سے عار نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں ایک بڑا انسان ہے جو عموماً اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے ہم جنس سے بھی ملنے سے انکار نہیں کرتا، وہ ایک آزاد خیال شخص ہے جس پر حکومت کے زور یا دولت کی شیخی کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اُس کے لئے بڑے چھوٹے سب برابر ہیں کیونکہ وہ ایک بڑا اور سچا انسان ہے!

اقبال کی صحت اور جسم کمزور ہو لیکن اُس کے دل و دماغ ابھی خوب مضبوط ہیں اور جب وہ باتیں کر رہا ہو، زندگی کے مسائل پر اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہا ہو، موجودہ حالات پر تبصرہ کر رہا ہو یا مغربی حکمت یا سیاست کی بعض تازہ ترین کتابوں پر تنقید کر رہا ہو تو اُس کی وسیع نظری اور جوش اور انہماک اور معلومات کو دیکھ کر اس بات کا گمان بھی نہیں گزرتا کہ اُس پُر زور شخصیت کی جسمانی صحت کسی طرح کمزور ہے۔

اس عظیم الشان انسان کی صحبت یا اُس سے ملاقات ایک ایسی نعمت ہے جس سے صرف بڑے اور سمجھدار آدمی ہی نہیں بلکہ معمولی آدمی بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُٹھاتے ہیں۔ کئی دفعہ شہر کے بعض آدمی حاضر ہوتے ہیں اور صرف یہ سعادت حاصل

کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قومی شاعر کی چند منٹ کے لئے مٹھی چاپی کریں۔ خوش قسمتی سے قومی شاعر باوجودیکہ وہ ایک بنگلے میں رہتا ہے سرمایہ داروں یا امیروں کا سا مزاج نہیں رکھتا کہ صرف صاحبِ حیثیت آدمیوں سے ملنا گوارا کرے۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانے کا یہ شاعر موجودہ اور گزرے ہوئے وقتوں کے علم و اخلاق کا آئینہ ہے۔

اقبال کی عمر اس وقت ۶۱ سال ہے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ وہاں ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے اُنہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے پاس کیا اور وہیں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری بھی چمکنے لگی۔ اسی زمانے کا وہ مشہور شعر ہے جسے سُن کر مرزا ارشد نے اس نوجوان کے حقیقی شاعر ہونے کا اعلان کیا تھا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اُن کا پہلا دَور ۱۹۰۵ء تک تھا۔ اس زمانے میں اُنہوں نے اِدھر شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور رسالے مخزن میں لکھنا شروع کیا اور اُدھر انجمنِ حمایت اسلام لاہور میں اپنی دردناک نظمیں سنانی شروع کیں۔ حب الوطنی کی نظمیں بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ دوسرا انگلستان کا دَور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک تھا جب وہ یورپ میں تعلیم کی غرض سے مقیم رہے۔ اس دَور میں مغربی تہذیب سے اُن کی مٹھ بھیڑ ہوئی جس سے اُن کے کلام پر خاصا اثر ہوا اور وہ مغربی تمدن کے ایک زبردست نقاد بن گئے۔ تیسرا دَور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک تھا جب وہ اپنی قومی و اسلامی نظموں سے قوم کے ایک سرگرم رہنما بن گئے۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام یہ سب اسی عہد کی نظمیں ہیں۔ لیکن اِسی دَور میں اقبال فارسی کی طرف کھنچنے چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں اُنہوں نے "اسرارِ خودی" شائع کی۔ اس کے بعد پے در پے "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق" شائع ہوئیں۔ چوتھا دَور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک تھا جب ایک طویل عرصے کے لئے اُنہوں نے اُردو سے مُنہ پھیر لیا۔ "زبورِ عجم"، "جاوید نامہ"

"مسافر" اور اسلام پر انگریزی میں چھ لیکچر اس زمانہ میں لکھے گئے۔ ۱۹۳۵ء سے پھر اُردو کی باری آئی اور پہلے "بالِ جبریل" اور پھر "ضربِ کلیم" شائع ہوئی۔

اقبال محض ایک شاعر نہیں وہ ایک زبردست قومی رہنما ہے، وہ ایک مخلص قومی پیغامبر ہے وہ ایک فلسفی شاعر ہے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے لئے اور ساری نوعِ انسانی کے لئے ایک پیغام لے کر آیا ہے۔ ایک دفعہ نہیں کئی بار میں نے ۱۹۳۵ء سے پہلے اُن سے شکایت کے طور پر عرض کی کہ آپ نے اُردو کو چھوڑ دیا ہے اور اُردو کا آپ پر خاص حق تھا اور ہے۔ فارسی والے فارسی میں لکھیں، اُردو کو اُردو والوں کی ضرورت ہے اور بہت سخت ضرورت۔ وہ یہ سُن کر مسکرا دیتے تھے۔ بہت اصرار پر انھوں نے کہا تو یہ کہا کہ اول تو میری اُردو بھی فارسی نما ہوتی ہے، دوسرے شاعر مصلحتوں کو مدِّ نظر نہیں رکھتا، اُسے تو ایک پیغام دینا ہے جس زبان میں بھی موزوں ہو جائے اور جہاں تک بھی پہنچ سکے!

اقبال کا فلسفہ جد و جہد کا فلسفہ ہے۔ زندگی انفرادی چیز ہے، خدا سب سے عظیم الشان فرد ہے، کائنات ایک عجیب و غریب کارنامہ ہے وہ مکمل نہیں اُس کا کام برابر جاری رہتا ہے اور ہر فرد اس میں اپنے انوکھے پن کے ساتھ حصّہ لیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو فروغ دے، اُسے چمکائے اُسے بڑھائے اور اُسے جماعت اور نوعِ انسان کی خدمت میں صَرف کرے۔ زندگی ایک تحریک ہے اپنے میں سب کچھ جذب کرنے والی اور عشق اس تحریک کا سب سے زبردست جذبہ ہے زندگی ہمیشہ آگے کو بڑھتی ہے: ؎

چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

زندگی آزادی کے لئے ایک مسلسل کوشش ہے اور صحیح زندگی صرف وہی ہے جو بے جھجک ہو کر خطروں میں سے ہو کر گزرے اور اَور زیادہ زندہ و تابندہ ہو جائے۔

اقبال کے کلام پر ایک سرسری سی نظر ڈالو تو جا بجا مناظرِ قدرت، حبِ وطن، رموزِ فطرت، موجودہ تمدّن اور قومی عروج و زوال کی بولتی چالتی تصویریں نظر آئیں گی۔ حُسن و خوبی کے

نظارے، جدّوجہد کے نعرے، عشق وایماں کے شعلے جابجا یہ جلوے ہیں!

سب سے پہلے مجموعے بانگِ درا کا آغاز یوں ہوتا ہے: ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

گویا اپنے ملک کی محبت کو معرفت کا درجہ دے دیا ہے!

"پرندے کی فریاد" بچوں کے لئے ہے، ہم میں سے اکثر نے اسے سکول میں پڑھا ہے: ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

لیکن جیسی بچوں کے لئے ہے ویسی ہی بڑوں کے لئے بھی ہے، صرف اُن کے لئے اس کے معنی کچھ ہیں اور اِن کے لئے کچھ اور۔ یہی ایک بڑے شاعر کی خوبی ہے کہ ایسی بات کہے جو سب کے لئے موزوں اور سب کی دل پسند ہو۔ ایسی ہی نظم "ایک آرزو" ہے: ؎

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب! — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

یہ اور اور اشعار جو یہاں درج کئے جاتے ہیں اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اُن کا دہرانا لاحاصل معلوم ہوگا لیکن یہی ہمارے شاعر کی عظمت ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک فلسفی شاعر ہے۔ اُس کے ہزاروں شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ چکے ہیں اور بعضوں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔

وطن کے درد سے شاعر کا دل معمور ہے: ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

اور وہ بے اختیار کہتا ہے : ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

قوم و وطن کی بیماری کے لئے شاعر کے پاس علاج بھی ہے : ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

ترانۂ ہندی کو کون نہیں جانتا ؟ اُسے کون نہیں سمجھتا، اُسے کون نہیں گنگناتا اور گاتا ؟ : ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

بلا شبہ یہی اس وقت ہندوستان کا قومی ترانہ ہے !

عشق و معرفت اور عقل و دل پر کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں : ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال مسلسل کوشش اور مسلسل زندگی اور مسلسل تغیّر کا قائل ہے : ؎

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

میرے والدِ محترم جسٹس شاہ دین ہمایوں (مرحوم) سے جن سے اقبال کو خاص تعلق تھا خطاب کرتے ہوئے اُن کی وفات کے بعد لکھتے ہیں : ؎

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی — تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

اس نظم کا آخری شعر ہے کہ ؎

مَوت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

مغرب کی تہذیب پر کیا کھری باتیں کہی ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

وطنیت اور مغرب پرستی کی غلامانہ روش سے بیزار ہو کر اقبال ایک زیادہ ہمہ گیر معاشرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس میں صحیح آزادی اور مساوات اور محبت اور عدل و ہمدردی کے عناصر ہوں اور یہ محض ایسے افراد کے ایثار اور کوششوں سے وجود میں آسکتی ہے جو اپنی خودی سے بخوبی آگاہ ہوں : ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اشتراکیت کی جھلکیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں :

"ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو"

اور "قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے۔"

بالِ جبریل میں شاعر مصر و حجاز اور پارس و شام یعنی ہر قسم کی قیدِ مقام سے بہت بلند پرواز کرنے لگتا ہے۔ اس زمین پر رہنے والے کی آواز سے آسمان بھی گونج اُٹھتے ہیں : ؎

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اسلامی نصب العین سامنے ہے ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الّا اللہ — خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الّا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الّا اللہ

لیکن اس میں بھی آزادگی کا رنگ صاف جھلکتا ہے ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الّا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری — نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الّا اللہ
اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں — مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الّا اللہ

اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے۔ لیکن اقبال کے لئے مسلمان وہ نہیں جیسا کہ آج کل کا مسلمان ہے بلکہ وہ جیسا کہ مسلمان کو ہونا چاہیے کیا اس تعریف کے تحت میں بعض غیر مسلم بھی شامل نہ ہونا چاہیں گے : ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اُس کا غروب — یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں

کہا جاتا ہے کہ ضربِ کلیم میں شاعری نہیں محض وہی فلسفہ سا ہے دہرایا ہوا۔ اُوپر کے ساتوں اشعار اسی دیوان سے ہیں۔ ان سے زیادہ زندگی بخش شعر اور کون سے ہوں گے ؟

غرض اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے لیکن یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ اس نصب العین کی تلاش میں اقبال اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ وہ مسلم و غیر مسلم سب کے لئے زندگی کا ایک فلسفی رہنما بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر بالِ جبریل اور ضربِ کلیم سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

خدا سے گلہ ہوتا ہے :-

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

فلک کی گردش اور زمانے کا انداز اب نرالا ہے اور ہونا چاہیئے : ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

حدیث بے خبراں ہے "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

یعنی زمانہ اگر راست نہیں تو اسے راست بنانا انسان کا کام ہے۔

انسان کی حیرت انگیز قوت و ہمت کا جا بجا نعرہ بلند کیا ہے ؎

چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ آزادی و بیک رنگی لے ہمتِ مردانہ

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
کب تک یہ ہے محکومیٔ انجم میں مری خاک — یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

سب سے بڑھ کر یہ کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کیا یہ آج کل کے ایک عام مسلمان کی سی محدود کمزور مسلمانی ہے؟ نہیں یہ وہ زندگی پیدا کرنے والا رگوں میں خون دوڑانے والا ہمہ گیر بلند نظر مذہب ہے جس کے آگے شاید انتہا پسند اشتراکی بھی فخر کے ساتھ اپنا سر جھکا دیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کو محض ایک فرقے کا شاعر کہنا پرلے درجے کی غلطی ہے وہ نوعِ انسان کا پیغام اور نوعِ انسان کا بے بدل شاعر ہے۔

پنجاب کے دہقان سے یوں خطاب کرتا ہے کہ ؎

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز؟ — ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز!
اسی خاک میں دب گئی تیری خاک — سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ!

لینن خدا کے حضور جاتا ہے اور شکایت کرتا ہے تو فرشتے بھی نئے انداز میں گیت گاتے ہیں اور اس شکایت کی حمایت کرتے ہیں۔ اُدھر خدا کہ اسی حسنِ طلب کا منتظر تھا فرشتوں کے نام اب اپنا انقلابی فرمان جاری کرتا ہے کہ: ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہ سب اس لئے کہ اقبال جمود و سکون و سکوت کا قائل نہیں۔ مسلسل تغیّر کا علمبردار ہے: ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!

ضربِ کلیم کا سر نامہ ہے ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یعنی اب ہر انسان کو کلیم بننا اور کلیم بن کر دکھا دینا ہے: ؎

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

یہ مُردنی کیوں چھائی ہوئی ہے اِس لئے کہ ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

اس زنداں سے نکلنا ہے لیکن اپنے آپ کو بھول نہیں جانا کہ خود آگاہی ہی انسانیت کی ضامن ہے۔ اپنے چہیتے بیٹے جاوید سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

شاخِ گل پہ چہک ولیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ

رسمی مسلمانی درکار نہیں۔ ''دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!''
اقبال کے نزدیک صرف جرأت اور طلب اور ہمت ہی صحیح زندگی کی رہنما ہے: ؎

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا!

اقبال کا فلسفہ ہے کہ انسان اپنے سیاہ وسفید کا مالک ہے، وہ فنا کو بقا میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ زمانے کی رَو کو جدھر چاہے موڑ سکتا ہے اور اس سے زیادہ کسی انسان نے کیا کہا ہوگا کہ ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!

ارادہ نہ تھا کہ اقبال کے فارسی کلام پر کچھ لکھا جائے۔ راقم نے مدّتوں کوششیں بھی کی کہ اُس سے رُو گردانی کی جائے لیکن سر ذوالفقار علی خان کے مختصر انگریزی تبصرے "مشرق سے ایک آواز" کے سرورق پر مرقومہ بالا شعر پڑھ کر نہ رہا گیا اور "اسرارِ خودی" کو پہلے فارسی اور پھر انگریزی میں بھی پڑھا اور بعد میں دوسری فارسی مثنویوں سے بھی فیض یاب ہُوا۔ "من صدائے شاعرِ فردا ستم" کی کہانی اور پھر فارسی کی زبانی! سچ یہ ہے کہ زبان کے جھگڑے کو بالکل بھول گیا اور زندگی سے دوچار ہُوا۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالمِ پندار کرد
سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہا شمع عذرِ محنتِ پروانہ ہا
خامۂ او نقشِ صد امروز بست تا بیارد صبحِ فردائے بدست
شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت
خیزد انگیزد پرد تابد رمد سوزد افروزد کشد میرد دمد

نقطۂ نورے کہ نامِ اُو خودی ست زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست
از محبت می شود پائندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
در جہاں ہم صلح و ہم پیکارِ عشق آبِ حیواں تیغِ جوہر دارِ عشق
از نگاہِ عشق خارا شق شود عشقِ حق آخر سراپا حق شود
خاک گشتن مذہبِ پروانگی ست خاک را اب شو کہ ایں مردانگی ست

از گلِ خود آدمے تعمیر کُن — آدمے را عالمے تعمیر کُن
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نَو ذرّات را
گردشِ ایّام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
آز ما باید صاحبِ قلبِ سلیم — زورِ خود را از مہماتِ عظیم

لیکن زندگی اضداد کا مرکب ہے۔ "خودی" کا زور دکھا کر شاعر "بے خودی" کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں وہ برسوں پہلے کہہ چکا ہے کہ ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب "رموزِ بیخودی" میں ربط فرد و ملّت کے معنی بیان کرتا ہے: ؎

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملّت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملّت احترام — ملّت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اُن اسباب کا ذکر کرتا ہے جن سے افراد اور قومیں تباہ ہوئیں: ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست — زندگانی محکم از لَا تَقْنَطُوا ست
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبیؐ تعلیمِ لَا تَحْزَن بگیر
گر خدا داری ز غم آزاد شو — از خیالِ بیش و کم آزاد شو

نظامِ ملّت کے لیے آئین کی ضرورت ہے: ؎

ملّتے را رفت چوں آئیں ز دست — مثلِ خاک اجزائے اُو از ہم شکست
برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد — گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستے   ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے

اور جمعیتِ حقیقی صرف اسی نصب العین سے ممکن ہے ؎

مدعا گردد اگر مہمیزِ ما   ہمچو صرصر می رود شبدیزِ ما

اور وہ مدّعا یہ ہے کہ ؎

تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے   گر مسلمانی نیاسائی دمے

لیکن اس مسلمانی کے صحیح معنی یہ ہیں کہ ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

مشرق کے لئے اُس کا "پیام" تجدیدِ حیات ہے لیکن عشق و محبت کے ساتھ :؎

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما   بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں   دگر آدم بنا کن از دلِ ما

جو نقاد اس بات کے شاکی ہیں کہ اقبال کے کلام میں نغمے کی کمی ہے وہ "پیام مشرق" پر ایک نظر ڈالیں :۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہِ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن

فصلِ بہار کی آمد دیکھو ؎

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنم ہزار
طوطی و درّاج و سار
برطرفِ جوئبار
کشتِ گُل و لالہ زار

چشمِ تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گُل رسید
بادِ بہاراں وزید
مرغِ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حُسنِ گلِ تازہ چید
عشق غمِ نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گُل رسید

کشمیرِ جنّت نظیر کی تصویر یوں کھینچی ہے:

رخت بہ کاشمر گشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج
صُلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

ستاروں کا گیت کس قدر دلکش ہے:

ہستی ما نظامِ ما	مستیٔ ما خرامِ ما	گردشِ بے مقامِ ما	زندگیٔ دوامِ ما

دورِ فلک بکامِ ما می نگریم و می رویم

گرمیٔ کارزارہا	خامیٔ پختہ کارہا	تاج و سریر و دارہا	خواریٔ شہریارہا

بازیٔ روزگارہا می نگریم و می رویم

خواجیٔ زمرودی گزشت	بندہ نِچاکری گزشت	زاری و قیصری گزشت	دورِ سکندری گزشت

شیوۂ بُت گری گزشت می نگریم و می رویم

بیشِ تو نزدِ ما کے	سالِ تو نزدِ ما دمے	اے بکنارِ تو یمے	ساختۂ بہ شبنمے

ما بہ تلاشِ عالمے می نگریم و می رویم

"زبورِ عجم" میں شاعر بیداری کا پیام دیتا ہے ؎

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگسِ نگراں خیز | کاشانۂ ما رفت بہ تاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز | از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ | فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ | معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز
از خوابِ گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

اور پھر انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے: ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب | از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام | آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!

"جاوید نامہ" میں ہمارا شاعر عالمِ فلکی کی سیر کرتا ہے اور روحوں سے قمر اور عطارد اور زہرہ اور مریخ اور مشتری اور زحل میں اور "آنسوئے افلاک" میں ملاقات کرتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ یہ ہے: ؎

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بودا ست | بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بوداست
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست | کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بوداست

زحل کی منحوس فضا میں شاعر روحِ ہندوستان کو نالہ و فریاد کرتے سنتا ہے: ؎

شمعِ جاں افسردہ در فانوسِ ہند ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش زخمہ خود کم زند بر تارِ خویش

بر زمانِ رفتہ می بندد نظر ز آتشِ افسردہ می سوزد جگر
اور اُس سے کہتا ہے کہ

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد
الحذر از جبر و ہم از خوئے صبر جابر و مجبور را زہر است جبر
ایں بہ صبرِ پیہمے خُوگر شود آں بہ جبرِ پیہمے خُوگر شود

ہر دو را ذوقِ ستم گردد فزوں
وردِ من یَا لَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

آخری فارسی نظم "مسافر" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) سیاحتِ چند روزہ افغانستان کا ثمر ہے۔ اقوامِ سرحد سے خطاب کرتے ہوئے شاعر پھر اپنے سازِ خودی کو چھیڑتا ہے۔

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

آخری دیوان "ضربِ کلیم" کی آخری غزل کا مطلع ہے:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اور آخری شعر یعنی اقبال کا تازہ ترین کلام یہ ہے:

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اُس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی!

(۱۹۳۸ء)

مخدوم محی الدین

مجاہد اقبال

(بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی روشنی میں)

اقبال کے کلام کے کئی پہلو ہیں، اسی مناسبت سے ان پر بحث کی جاتی ہے۔ ان ہی پہلوؤں میں سے ایک پہلو جہاد کا ہے اور غالباً غالب پہلو بھی یہی ہے۔ اقبال کے پیش نظر انفرادی اور اجتماعی سیرت کا ایک خاکہ ہے جس کسی کو وہ اپنے نصب العین سے ہٹا ہوا پاتا ہے اس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ جس کسی کردار یا ارادہ میں اپنے خیال کی جھلک بھی دیکھتا ہے تو اس سے متاثر ہوتا ہے مجاہد کی خود اقبال نے تعریف کی ہے۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق آگاہ
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

یہی ہے مجاہد کی تعریف یہی بندۂ گستاخ کہیں اقبال، کہیں مومن، کہیں قلندر، کہیں درویش اور کہیں مردِ کامل کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ مرد مجاہد ہر عہد کے سماجی حالات کے مطابق کبھی مصلح، کبھی مدبر، کبھی شاعر اور کبھی

پیغمبر کے پیکروں میں نمودار ہوا ہے۔ اس کا کام کلیسا اور حرم کے چراغ گل کرنا ہے تاکہ خدا اور انسان میں کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ اس کا کام میری و قیصری کے ایوانوں کو ڈھانا ہے۔ خونخواری نہیں بلکہ محبت کرنا سیکھے وہ حق پرست اور باطل شکن ہے۔ اس کی بجلیاں اپنوں اور بیگانوں کا امتیاز نہیں کرتیں۔ وہ فرعون کے لیے موسیٰ اور لات وہبل کے لیے محمدؐ ہے۔ لات وہبل چاہے حرم کے ہوں یا سومنات کے، عرب کے ہوں یا عجم کے، فرعون چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے، مدرسہ کے ہوں یا خانقاہ کے،

اقبال کے کلام کا مرکزی جذبہ عشق ہے۔ اس کی ساری تعلیمات اس کے سارے شاعرانہ تخیلات اسی جذبے کا طواف کرتے ہیں وہ عشق ہی کے بازوؤں پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کرتا ہے۔ فضا میں اڑنا اس کا محبوب مشغلہ ہے، گنبد نیلوفری میں اپنا نشیمن بنانا چاہتا ہے، اس کے کلام کے ہر ورق سے عالم بالا کی بو آتی ہے۔ مگر چونکہ فلسفیانہ تجسس کا نقطہ پرواز دنیادی حقائق ہی میں ہے اس لیے آسمانوں کی سیر میں بھی اقبال کا دامن زمین ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ وہ نیستند میں بھی زندگی کو نہیں بھولتا۔ ہر چند وہ عملی دنیا کی کشمکش سے منہ چھپا کر داخلیت میں بند ہو جانا چاہتا ہے۔ باوجود خاکی ہونے کے خاک سے پیوند نہیں رکھنا چاہتا۔ مگر اس کی ذات میں صرف عشق ہی نہیں اس میں عقل کا عنصر بھی شامل ہے اور بام حرم کا یہ کبوتر زندگی اور اس کی تلخیوں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انسان کے پیش نظر جب کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ اپنی آواز سے بولتا ہے۔ مگر جب کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے تو وہ گایا کرتا ہے۔ جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ مصوری کرتا ہے۔ انسان کی جب کوئی منزل ہوتی ہے تو وہ اپنے پاؤں سے چلتا ہے جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ رقص کرتا ہے اقبال کی زندگی کا سارا انحصار اسی زندگی کے لیے ہے۔ اسی سرمدی دنیا میں وہ گاتا، مصوری کرتا اور رقص کرنا چاہتا ہے۔

خویشتن را وانمودن زندگی است
ضرب خود را وانمودن زندگی است

لطیف النساء بیگم

اقبال اور اس کی شاعری

دنیائے ادب میں اقبال کی شخصیت ممتاز ہی نہیں عدیم النظیر بھی ہے اور اس کی شاعری بہ لحاظ ادبیت وخیالات اردو فارسی کا وہ نایاب خزانہ ہے جس پر مشرق صدیوں تک ناز کرتا رہے گا۔

اقبال نے غالب کو جائز طور پر یوں سراہا ہے ؎

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر　　محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے تیرے انداز پر　　خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں　　ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں　　آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزئ پروانہ ہے

اور غالباً غالب کے بعد ہی اقبال کو گیسوئے اردو کو سنوارنے کا خیال خاص طور پر پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے خیال کو اس کمال سے عمل کا جامہ پہنایا کہ نقل کو اصل سے بھی بڑھا دیا۔ خدا جانے ہندوستانیوں کی کون سی نیکی خدا کو بھائی اور اس طرح آڑے وقتوں میں کام آئی کہ جب غالب نے بزم شاعری کو الوداع کہا اور دنیائے ادب اس

مہرِ درخشاں کی ضوفشانیوں سے محروم ہو کر شبِ تار بن گئی تو عین اس وقت افقِ شاعری پر ایک اور درخشاں ستارہ نمودار ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے ماہتاب اور پھر آفتابِ عالم تاب کی صورت اختیار کی اور اپنی ضیا باریوں سے دوبارہ دنیائے شاعری کے ذرے ذرے کو جگمگا دیا۔

سر عبدالقادر اقبال کے متعلق لکھتے ہیں۔

"غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

روحِ غالب نے جسدِ اقبال میں جنم لیا ہو یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب و اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ غالب اور اقبال نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ غالب نے اپنی غزلیات کا بہت سا حصہ حذف کر دیا اور ظن غالب ہے کہ اقبال کی غزلوں کی بھی ایک خاص تعداد منظرِ عام پر نہ آسکی۔ شکوہِ الفاظ، فارسی بندشیں، دلکش ترکیبیں، عمیق خیال اور پرواز تخیل ان دونوں کا سرمایہ امتیاز ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی اس جستجو کی ایک جھلک موجود ہے جس کی تپش سے کلام غالب سراپا سوز ہے اور جس کی توضیح اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

"دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے ۔۔۔ بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے"

پہلے پہل اقبال کی شاعری کی ابتداء غزلوں سے ہوئی۔ جس میں کیفِ عشق بھی تھا اور ثنائے حسن بھی۔ جن میں اول اول داغ کا رنگ نمایاں تھا جیسے:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں ۔۔۔ یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں ۔۔۔ جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا ۔۔۔ جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

(بطرز سہل الممتنع)

لیکن یہ رنگ داغ کی استادی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور اب اقبال کے کلام پر غالب کا رنگ غالب تھا جیسے :

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہدی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

یا

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوش نوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی سو میرے آشیاں تک ہے

جرس ہوں نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

سکونِ دل سے سامان کشودِ کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے

اقبال کی اس تقلیدی شاعری میں بھی ان کا کمالِ فن نظر آتا ہے۔ طرزِ نگارش اور اسلوب بیان سے قطع نظر اقبال کی شاعری نے خیالات اور رجحانات کے لحاظ سے بھی کئی پلٹے کھائے ہیں۔ دنیائے رنگ و بو اور عالمِ حسن و عشق سے باہر بھی کچھ ایسے اسباب دلکشی موجود تھے جنہوں نے بہت جلد نوجوان شاعر کے فلک پیما تخیل کو مسحور کر لیا اور اب اقبال نے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھنی شروع کیں جن میں کبھی حالی کا رنگ جھلکتا ہے تو کبھی اکبر الہ آبادی کا۔

حالی کا رنگ

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی — تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی — منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے — تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا — گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا — تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اسکی زبانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی — ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھکو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھکو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یا

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونیوالا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اکبر کا رنگ

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اس قبیل کی اصلاحی نظموں کے علاوہ اقبال کی شاعری کے اس دور میں فطری اور وطنی نظمیں بھی بکثرت ہیں جن میں ہمالہ۔ گل رنگیں۔ جگنو۔ کنارِ راوی، صبح کا ستارہ چاند، ابر کہسار، پرندہ اور جگنو۔ بچہ اور شمع، نیا شوالہ، آفتاب صبح خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک حصہ موضوعی نظموں کا بھی ہے جو مغربی شعراء سے ماخوذ ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ بھی اتنا مکمل اور پاکیزہ ہے اور مغربی خیالات مشرقی انداز میں اس حسن سے ادا ہوتے ہیں کہ وہ حقیقت آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان نظموں میں بھی اکثر نظمیں جیسے پہاڑ اور گلہری، ہمدردی، بچے کی دعا، پرندے کی فریاد وغیرہ صرف مشہور

ہی نہیں بلکہ زبان زدِ خاص و عام ہو چکی ہیں۔

اقبال کی شاعری قصیدہ اور ہجو دونوں سے پاک ہے۔ اقبال نے کبھی صاحبانِ زر و ارباب اثر کی مدح سرائی نہیں کی نہ کبھی ہجو گوئی سے۔ اپنے کلکِ اعجاز رقم کے وقار کو گھٹایا۔ ہاں اس کی شاعری کا پہلا دور بارگاہ خداوندی کی ایک برگزیدہ ہستی حضرت نظام الدینؒ کی عقیدت مندانہ منقبت پر ختم ہوتا ہے جو نہ صرف جذباتِ عقیدت اور تاثراتِ مودت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس میں اقبال کا کردار ان اشعار میں بے نقاب ہوتا ہے ؎

نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھکو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھکو

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور پیامِ محبت سناتا ہے۔ قیامِ یورپ میں اقبال نے فارسی پر بہت توجہ صرف کی تھی اور شاعری کے لیے فارسی کے میدان کو بہ نسبت اردو کے کہیں زیادہ وسیع پایا۔ اس کے علاوہ ہزارہا بنی بنائی دلکش ترکیبیں اور صدہا خوبصورت جملے ایسے ملے جو اردو میں عنقا تھے۔ اور چونکہ اسے اپنی قوتِ فارسی گوئی کے امتحان کا موقع بھی یہیں ملا تھا وہ اب ہمہ تن فارسی گوئی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں علمی سند کے حصول کے لیے اس نے فلسفۂ ایران کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور یقیناً اسی ضمن میں وہ فلسفۂ تصوف سے بھی روشناس ہو چکا تھا یہی سبب ہے کہ اس دور کے کلام میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور شاعر متصوفین کی طرح ذرہ ذرہ میں حسنِ حقیقی کا جلوہ ڈھونڈتا نظر آتا ہے اور دنیا کو رازِ محبت اور حقیقتِ جستجو سے آگاہ کرنا چاہتا ہے ؎

انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا

جرأت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب — پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب

آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں — خاتمِ دہر میں یا رب وہ نگیں ہے کہ نہیں

کبھی شاعر جستجوئے حقیقت میں مطمئن بھی نظر آتا ہے سے

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا — بزم کو مثلِ شمع، بزم حاصلِ سوز و ساز دے

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ — چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

فلسفۂ مغرب و علوم جدیدہ میں متلاشی حقیقت شاعر کو تسکینِ قلب حاصل نہیں ہوتی اور وہ اپنی بے اعتقادی کو اسی دور سے ظاہر کرنا شروع کرتا ہے جو آج تک اس کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ سے

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا، بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

مارچ ۱۹۰۷ء کی غزل میں اقبال کے خیالات قابل غور ہیں۔ یہ چند اشعار اس کے مطمعِ نظر کے انقلاب کو ظاہر کرتے ہیں۔ سے

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اقبال کی قومی شاعری کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے۔ چنانچہ قومی نظموں میں اقبال کی اکثر نظمیں بلحاظ سوز و گداز۔ درد و اثر اور جذبۂ قومی اتنی بلند و بالا اور عظیم المرتبت ہیں

کرالہامی معلوم ہوتی ہیں۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام۔ اقبال کی معرکتہ آلارا نظمیں ہیں جو درحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ان کے علاوہ مسلم، وطنیت، ترانہ ملی وغیرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جو بجا طور پر اقبال کے قلم کا اعجاز ہیں۔ اقبال کی ہر قومی نظم جذبۂ قومی میں ڈوبی ہوئی اور تاثراتِ قلبی سے مملو نظر آتی ہے۔

اسی دورِ شاعری یا قیامِ مغرب کے زمانے میں اقبال نے یورپ کے اکثر علماء، حکماء اور شعراء کے خیال، پیام، اور فلسفہ کا بغور مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے بعد اس کی طبیعت پر بہت اچھے اثرات مترتب ہوئے اور خود اس کی شاعری میں ایک خاص پیام اور فلسفہ نظر آنے لگا۔

اقبال کی شاعری اب ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے جو تقریباً ۱۹۰۷ء سے لے کر آج تک کم وبیش اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ جدید رنگ اس کو ایک خاص امتیاز بخشتا ہے جس کے بغیر اس کے حقیقی جوہر نہ کھل سکتے اور اس کے شدید جذبات کی حقیقی نمائندگی اور اس کے تاثرات کی سچی ترجمانی نہ ہو سکتی تھی۔ قومی شاعری میں وہ سب سے پہلے اس تڑپ کو ظاہر کرتا ہے جو ملتِ بیضا کے لیے اس کے دل میں ہے۔ اور اس کا مقصد ملت کے مضمحل قویٰ اور نیم مردہ عروق میں ایک تازہ زندگی کی رو اور قومی اخلاق اور ادبیات میں نشاۃ جدید کا پیدا کرنا ہے۔ مگر وہ اس حیاتِ جدید کو مغربی رنگ کی کورانہ تقلید سے بھی بچانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشاہیرِ اسلام اور اسلاف کا بار بار ذکر کرتا ہے اور ان کے محاسن و کردار کی مثالیں دے دے کر مسلمانوں کی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگاتا ہے۔ اقبال کی اس دور کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کا شاعرانہ وجدان حسن وعشق کے آئین، مضمون آفرینی اور اظہارِ بیان کے رسمی قیود سے آزاد ہے۔ بلحاظ شاعر کے وہ دل دادگانِ خال وخط کے اس زمرہ میں محدود نہیں ہے جو سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں۔ وہ ایک فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت سے عالم وما فی العالم کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا شاعرانہ وجدان اور طرزِ بیان اسی لیے ایک خاص قدرت رکھتا ہے۔

اقبال کے شاعرانہ وجدان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی پر جوش اور طوفان خیز موجوں میں تبلیغ خیال اور پیام عمل ہے ۔ اور جس کی گہرائیوں میں زندگی کے ارتقاء اور تعلیم کے ہائی کے بیش بہا گوہر ہیں ۔ اس کا حساس دل زمانے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس جمود و سکون کا متحمل نہیں ہوتا جو اس کے قریبی ماحول اور اس کے ملک و قوم میں موجود ہے اس لیے وہ اس کو دور کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے ۔ کبھی تو وہ اسلاف کے کارنامے یاد دلاتا ہے ۔ اور کبھی طرح طرح سے غیرت دلا کر حمیت قومی کو اکسا کر ان کی قوت جد و جہد کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے سہ

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

فطرت کو خرد کے روبرو کر ۔۔۔ تسخیرِ مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے ۔۔۔ کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بے کرانہ ۔۔۔ تو بھی یہ مقام آرزو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت ۔۔۔ جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

غرض اس جمود قومی کو مٹانے اور اس سکون کے خلاف ردعمل کرنے کے لیے اس کے جذبات کا دریا امنڈتا ہے باوجود قوم کی بے حسی کے اقبال کو ان کے مستقبل سے یاس نہیں نہ وہ ہمت پست کرنے والی قنوطیت ہے جو اکبر الہ آبادی کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ فرماتے ہیں سہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

برخلاف اس کے اقبال کا انداز تخاطب امید افزا اور ہمت آفریں ہے سہ

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں — وہ جلوہ گاہ ترے خاک داں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں — غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

کتنا بلند پیام ہے اور کیسا دلکش اور جوشیلا اندازِ بیان کیا سوتوں کو جگانے کا اس سے بڑھ کر کوئی اور دلنشیں پیرایہ بھی ہو سکتا ہے۔ اقبال کے جذبات مثل ایک ابلتے ہوئے چشمے کے ہیں جس کے سوتے خاکِ دانِ حیات سے ابلنا چاہتے ہیں ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدی
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ہمت کی یہی بلند حوصلگی اور طبیعت کا یہی غیر معمولی جوش ہے جو اقبال کے طرزِ بیان میں ایک ایسا انوکھا پن اور کلام میں وہ جذبات کی فراوانی اور زور اور آمد کا ایسا سیلاب موجزن کر دیتا ہے جو اردو اور فارسی کے کسی اور شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے انوکھے ڈھنگ کا آپ مالک ہے اور اپنی نرالی شان کا آپ خالق۔ یہ حسنِ بیان یہ پیام جد و جہد، یہ جوشِ عمل اور یہ فلسفہ زندگی، یہ زورِ کلام، یہ گرجتی للکار اور یہ شکوہِ زبان اعجاز یا الہام نہیں تو کیا ہے؟

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

اقبال نے اپنی قومی شاعری سے زبان و ادب کی بھی قابل قدر خدمت کی ہے۔ بعض سخن داں اس کی زبان کی بعض معمولی لغزشوں پر اعتراض کرتے ہیں لیکن بات یہ ہے وہ اپنے جذبات کے تلاطم اور اپنے تاثرات کے طوفان میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے۔

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

مگر دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی نرالی اور جدت آفریں طرز، دلکش تشبیہوں اور دل پذیر ترکیبوں اور گرجتی زبان سے جو خدمت اردو زبان کی کی ہے وہ فراموش نہیں

کی جا سکتی۔ اس نے گیسوئے اردو کے سنوارنے میں درحقیقت ایک خاص حصہ لیا ہے۔ اس کی پروازِ خیال کی طرح اس کی خصوصیاتِ زبان بھی قابلِ تعریف ہیں سے

مشتی از خروارے

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روزِ تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا (کنارِ راوی)

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقاب آگہی
ہے غبارِ دیدۂ بینا حجاب آگہی
محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں (شمع و پروانہ)

مہرِ روشن چھپ گیا، اٹھی نقابِ روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھری ہوئی گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لبِ گفتار پر
ساحرِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر

منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

(خفتگانِ خواب سے استفسار)

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُرافشاں ہونا
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا!!
بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں (ابرِ کہسار)

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح، یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلعت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار (نمودِ صبح)
ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی (ماہِ نو)

تغیر آگیا ایسا تدبر میں، تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
فروغِ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی
تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلی داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوز دلی داری (تہذیب حاضر)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوہ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ، رمیدہ بو
میں حکایتِ غم آرزو، تو حدیثِ ماتم دلبری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوت حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشست سمندری
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللہی وہی مرحبی وہی عنتری (میں اور تو)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پہ کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

حسنِ بیان اور زورِ کلام کے ایسے ایسے ہزارہا نمونے اقبال کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ جن کے مختصر انتخاب سے بھی ایک ضخیم جلد تیار ہو سکتی ہے۔ جب ہم ہندوستان کے اس سب سے بڑے موجودہ شاعر کی شخصیت پر غور کرتے ہیں تو علاوہ ایک مایۂ ناز ماہرِ فن اور ایک استادِ سخن ہونے کے اس کی شخصیت کے دو اور نمایاں پہلو نظر آتے ہیں ——
(۱) پیامِ عمل (۲) فلسفۂ حیات اس لحاظ سے اقبال نہ صرف دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہی ہے بلکہ ایک پیامبر اور مفکر (فلسفی) بھی ہے۔

(۱۹۳۸ء)

شجاع الدین

ترجمانِ حقیقت کی ایک فلکی سیر

قصرِ شرف النساءؒ

داستانِ عہدِ گل را بشنو از مرغِ چمن

جاوید نامہ علامہ اقبال مرحوم کی ایک زندہ جاوید تصنیف ہے۔ اس میں شاعرِ اسلام نے اپنی اجرامِ فلکی اور بہشت وغیرہ کی سیر کا ذکر کیا ہے۔ جو جو گفتگوئیں وہاں کے باسیوں اور روحوں سے ہوئیں اور جو نظارے اس نے چشم تصور سے وہاں دیکھے انہیں نہایت ہی عمدہ پیرائے اور خوبصورت زبان میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ جب شاعرِ مشرق فلکِ قمر۔ فلکِ عطارد۔ فلکِ زہرہ۔ فلکِ مریخ اور فلکِ مشتری کی سیر کرتے ہوئے فلکِ زحل میں پہنچتے ہیں تو انہیں وہاں دو غداروں کی روحیں نہایت ہی دردناک عذاب میں مبتلا دکھائی دیتی ہیں۔ یہ دو غدار میر جعفر بنگالی اور میر صادق دکنی ہیں۔ آگے چل کے جنت الفردوس میں پہنچتے ہیں۔ تو وہاں انہیں "لعلِ ناب" کا بنا ہوا ایک کاشانہ نظر پڑتا ہے۔ جو کہ چمک دمک میں آفتاب سے بڑھ کر تھا۔ علامہ اسے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے رہبرِ سفر پیر رومیؒ سے پوچھتے ہیں۔

گفتم ایں کاشانۂ از لعلِ ناب ۔۔۔ آنکہ مے گیرد خراج از آفتاب
ایں مقام ایں منزل ایں کاخ بلند ۔۔۔ حوریاں بر درگہش احرام بند
اے تو دادی سالکاں را جستجوی ۔۔۔ صاحبِ او کیست با من باز گوی

پیر رومیؒ جواب دیتے ہیں

گفت ایں کاشانۂ شرف النساءؒ است ۔۔۔ مرغ بامش با ملائک ہم نوا است

میں اس جواب کو آگے بیان کرنے سے قبل یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر طور پر بیان کروں کہ "یہ شرف النساء صاحبہ کون تھیں" اور ان کے آباؤ اجداد کون تھے۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اعظم" وہی عالمگیر جن کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ۔

درمیان کارزارِ کفر و دین　　ترکش ما را خدنگ آخرین

کی وفات کے بعد سرزمین پنجاب میں بندہ بیراگی نے بہت ہڑبونگ مچائی۔ شہروں اور دیہات کو لوٹنا۔ جلانا اور رعیت کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مختصراً یہ کہ شہنشاہ فرخ سیر نے اس فتنے کو دبانے کے لئے نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو ناظم پنجاب مقرر کیا۔ نواب صاحب تورانی الاصل تھے۔ اور ان کے پاس ایک لشکر بہادر تورانی سپاہ کا تھا۔ نواب صاحب نے تھوڑے ہی عرصے میں پنجاب کی بدامنی کا خاتمہ کر دیا اور ترقی کا دور دورہ دوبارہ شروع ہوا۔ مفسد بندہ گرفتار ہو کر دہلی پہنچایا گیا۔ اور وہاں اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ نواب صاحب موصوف حضرت خواجہ خاوند محمود المشہور حضرت ایشاں قدس سرہٗ کی اولادؓ سے تھے۔ حضرت محمودؒ عہد جہانگیر و شاہجہان میں ایک بہت باشریعت ولی اللہ نقشبندی سلسلہ کے ہو گزرے ہیں۔ نواب صاحب نے ان کے مقبرے کے پاس محلہ مغل پورہ کو اپنی قیام گاہ مقرر کیا۔ اس محلے میں پہلے ہی مغل امراء کے بڑے بڑے عالیشان محلات باغات اور مقابر تھے۔ مگر اب تو حاکم پنجاب کی اقامت گاہ ہو جانے کی وجہ سے اس علاقے کی خوبصورتی رونق اور زیب و زینت کو چار چاند لگ گئے انہوں نے مغل پورہ میں بہت ہی عالیشان محلات بمع باغوں، حماموں اور مسجدوںل کے تعمیر کرائے۔ ان کے اور اس کا ملحقہ علاقہ ان کے حرم محترم ملکہ علیا بیگم جہاں صاحبہ کے نام پر "بیگم پورہ" مشہور ہوا۔ ملکہ دوران ایک خدا رسیدہ اور علم دوست خاتون تھیں۔ چنانچہ مرتے وقت وصیت کی کہ ان کے ذاتی زیورات فروخت کر کے مزار شاہ چراغ رحؒ کے پاس ایک مسجد تعمیر کرا دی جائے۔ چنانچہ وہ مسجد جو حال ہی

ل۔ تحقیقات چشتی صفحہ ۶۲۴

میں گورنمنٹ نے مسلمانوں کو واپس دی ہے۔ تعمیر ہوئی۔ ملکہ مذکور کی قبر بھی درگاہ حضرت شاہ چراغ رح کے احاطے میں مشرقی سمت واقع ہے۔ اور اس کے اوپر دن کا درخت ہے۔ نواب صاحب بھی بہت دیندار مسلمان۔ عادل حاکم اور مردِ غازی تھے۔ چنانچہ ایسے ماں باپ کے ہاں "شرف النساء" پیدا ہوئیں۔ بیٹی کے علاوہ بیٹا نواب زکریا خان خان بہادر بھی بڑا شریف النفس اور صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ باپ کے بعد ناظم پنجاب مقرر ہوا۔ انہیں پنجاب کا آخری صاحب قوت و ثروت حاکم کہنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے بعد اندرونی خانہ جنگی اور بیرونی حملوں کی وجہ سے پنجاب میں دولتِ اسلامیہ کا زوال شروع ہوگیا۔ ان کے زمانہ میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ اور ان کی یاد اہلِ درد کے دلوں سے ابھی تک بھی نہیں گئی۔ شرم النساء علوم و فنون اور بلند اخلاقی میں صحابیات اور قرونِ اولیٰ کی خواتین کی مثیل تھیں۔ چنانچہ بقول علامہ اقبال

قلزم ما ایں چنیں گوہر نہ داد　　ہیچ مادر ایں چنیں دختر نہ داد
خاکِ لاہور از مزارش آسماں　　کس نہ داند راز او را در جہاں
آں سراپا ذوق و شوق درد و داغ　　حاکم پنجاب را چشم و چراغ
آں فروغِ دودۂ عبد الصمد　　فقر او نقشے کہ ماند تا ابد

شہزادی ہر لمحہ یادِ خدا میں صرف کیا کرتی تھیں۔ ہر وقت قرآن خوانی کا مشغلہ جاری رہتا تھا۔ اور ایک تلوار ان کے پاس موجود رہتی تھی۔ چنانچہ اس بیان کو ترجمانِ حقیقت کی زبانِ فطرت آشنا سے سنیئے اور لطف اٹھائیے:۔

تا ز قرآں پاک می سوزد وجود　　از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود
در کمر تیغ دو رو قرآں بدست　　تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز　　اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

چنانچہ اسی نیم مجذوبانہ طریقہ سے شہزادی صاحبہ نے تمام عمر گزار دی۔ تمام عمر

لے۔ تاریخ لاہور۔ کنہیا لال صفحہ ۲۹۷۔ تحقیقات چشتی صفحہ نمبر ۳۸۹

گزار دی۔ تمام عمر شادی بھی نہ کی۔ اسلام کی سچی تعلیم کے مطابق قرآن اور تلوار ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے۔ آخر ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ اور جس وقت وہ دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف ہجرت کرنے لگیں۔ تو اپنی والدہ کو بلایا اور یہ وصیت کی۔

برلبِ او رچوں دم آخر رسید | سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از راز من داری خبر | سوئے ایں شمشیر و ایں قرآن نگر

اگلے شعر کو غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ تمام فلسفۂ اسلام کو کس طرح شہزادی صاحبہ نے چند الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند | کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس | دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن | تیغ و قرآں را جدا از من مکن
دل باں حرفے کہ می گویم بنہ | قبر من بے گنبد و قندیل بہ
مومناں را تیغ با قرآں بس است | تربت ما را ہمیں ساماں بس است

یہ وصیت کر کے تھوڑے عرصے کے بعد شہزادی نے اس عالم فانی سے سفر کیا۔ بیگم پورے کے ان محلات کے صحن میں جو کہ خوبی و زیبائش میں جنت الفردوس کو شرماتے تھے۔ ایک منزل بلند پست سے گنبد والی کاشی کار عمارت میں اسے دفنایا گیا۔ گنبد کے اندر تلوار اور قرآن کو بھی قبر کے پاس رکھ دیا گیا۔ اور کئی سال جب تک کہ پنجاب پر اسلامی حکومت رہی۔ وہ مقبرہ اسی طرح اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔

عمر ہا در زیر ایں زریں قباب | بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہان بے ثبات | اہل حق را داد پیغام حیات

لیکن جب مسلمان مسلمان نہ رہا۔ اور اس نے اللہ سے رشتہ توڑ کر ماسوا کی محبت کو اپنے دل میں جاگزیں کر لیا۔ جب کہ مسلمان نے غیر اللہ سے جوڑنا شروع کر دیا۔ جبکہ مسلمان کے دل میں مال و زر کی محبت نے جگہ پائی اور مسلمانوں سے اتحاد رخصت ہوا۔ تو مملکت پنجاب میں ہر طرف شیطانی قوتوں کا دور دورہ ہو گیا۔ علامہ مرحوم کی زبان سے سنیئے۔

نامسلماں کرد باخود آنچہ کرد — گردشِ دوراں بساطش در نورد
مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد — شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت — خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را بہ برد — اندر آں کشور مسلمانی بمرد

مسلمانوں کی خانہ جنگی درانی اور ابدالی کے حملوں نے سکھوں کو پھر سر اٹھانے کا موقعہ دیا انہوں نے پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل پنجاب کے آباد و خوشحال حصوں پر ڈاکہ زنی شروع کردی۔جہاں جاتے۔مکانوں کے لوٹنے اور مکینوں کو قتل کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ مسجدوں - مقبروں - باغوں - کتب خانوں اور مدرسوں کو بھی تباہ و برباد کر دیتے۔چنانچہ ان کے ظلم وستم سے تنگ آکر اس زمانے کا ایک پنجابی شاعر دلشاد پسروری فریاد کرتا ہے کہ ۔

الٰہی قطع ہستی کن سگانِ گرگ تازاں را — ز لامقراض میگرداں سراین موذرازاں را[1]
حوا سم آب شد از آتشِ دورِ سیہ کاراں — بکن بیروں ز پنجاب ایں شرار فتنہ سازاں را[1]
جہاں در چنگلِ مردار خوارانِ سیاہ آمد — خداوندا بریں زاغاں رہا کن شاہبازاں را[1]

میں یہ اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ بیگم پورہ میں لاکھوں روپے کی لاگت کی حویلیاں - بڑے بڑے عالیشان باغ اور بڑے بڑے دیوان خانے جن میں شاہی اجلاس ہوا کرتے تھے بازاروں میں جوہریوں کی دکانیں تھیں۔کسی جنس اور کسی نوع کی چیز کی کمی نہ تھی۔آہ آج جس علاقے خاک اڑتی ہے - اونچی نیچی سی کھبتیاں ہیں - وہاں سر بفلک محلات سنگ مرمر اور کاشی کے کام کی عمارات تھیں۔جب احمد شاہ ابدالی نے نواب شاہ نواز خاں ولد نواب خان بہادر کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کیا۔ تو اس کی فوج نے صرف ایک روز بیگم پورے کو لوٹا اور بیگم پورے کی اس ایک دن کی لوٹ سے وہ اس قدر مالامال ہو گئے کہ باقی شہر کے ۳۵ گذروں یا محلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھی اور سامان قیمتی ایک سپاہی کے پاس اس قدر تھا۔کہ اٹھا نہ سکتا تھا۔سکھوں کی مثلوں نے اس محلے کو تین بار لوٹا اور مالامال واپس لوٹے

[1] ملاحظہ ہو تاریخ کنھیا لال صفحہ ۹۳

رنجیت سنگھ کے دور میں جبکہ یہ محلہ اجڑ چکا تھا - اس کے کھنڈرات سے اس قدر اینٹیں نکالی گئیں - کہ کئی محلات تیار ہوئے - اور کئی دفینے بھی نکلے - زنانہ اور مردانہ قبروں اور دوسری عمارتوں پر جس قدر سنگ مرمر تھا - اتروا کر امرتسر بھیج دیا گیا - سکھوں کے علاوہ انگریزی عہد کے آغاز میں بھی جس کا داؤ چلا - مقبروں - حماموں - تالابوں اور بارہ دریوں کی اینٹیں اکھیڑ کر لے جاتا رہا - اور اب میکلیگن کالج کے پاس شالامار روڈ پر کھیتوں کے درمیان تھوڑے سے کھنڈرات رہ گئے ہیں - اور ان کے اندر زمیندار لوگ آباد ہیں -

ایک مسجد کاشی کار اور چند ٹوٹی پھوٹی گری پڑی سی دیواریں ان اولوالعزم ناظمان پنجاب کی یادگار رہ گئے ہیں - ان کے پاس حضرت محمود خاوندؒ کا مقبرہ اور لب سڑک خوبصورت کاشی کے کام کا عالیشان دروازہ گلابی باغ کا ہے -

شہزادی شرف النساء کا مقبرہ جانب شرق کھیتوں کے درمیان واقع ہے اونچی زمین سے دو قد آدم بلند عمارت خشتی سادہ ہے - اوپر چاروں طرف گنبد تک کاشی کا کام کیا ہوا ہے - اور اس پر سبز رنگ کے سرو بنے ہوئے ہیں - اس لئے یہ مقبرہ "سرو والا" کے نام سے مشہور ہے - اور مغربی سمت ایک محراب دار دروازہ ہے اور اندر کچی مٹی کی سادہ قبر ہے - غالباً اب محکمہ آثار قدیمہ نے بنوائی ہے پہلی سنگ مرمر کی قبر کو سکھوں نے قرآن اور تلوار لوٹتے وقت گرا دیا تھا - مقبرے کے گرد جو عالیشان حوض - بارہ دریاں اور چمن تھے - سب تباہ ہو چکے ہیں ؎

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

(۱۹۳۸ء)

اکرام قمر ہوشیار پوری

علامہ اقبال کی شاعری

اقبال کو شاعر کی حیثیت سے مختصر الفاظ میں پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بلا مبالغہ ان کی منزلت کچھ ایسی بلند ہے کہ بلند ذوق ارباب خود ہی ان کے حقیقی معیار کو مقرر کر کے ان کے شاعرانہ کارناموں کی کماحقہ، داد دے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کچھ ایسی ناپید اکنار پہنائیوں، وسعتوں اور بلندیوں میں شاہبازِ تخیل و معانی بن کر پرواز کرتا ہے کہ اس کے پر پرواز کو تولنا تو درکنار اس کا نظروں کے سامنے رہنا بھی ناممکن ہو چکا ہے۔ اور وہ ان بلند پروازیوں میں ایسا محو ہے کہ اسے اپنی حقیقت خود معلوم نہیں۔ اور اسے پتہ نہیں کہ وہ کیسے پرواز کر رہا ہے۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے　　کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

وہ ایمان و یقین کی بلندی پہ پُر نور حقیقت کی روشنی میں زندگی کا اصلی مہرہ دیکھ چکا ہے۔ جس کے حصول کے لئے وہ بیتاب ہے۔ اور اس بیتابی میں اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر والہانہ اور قلندرانہ طرز میں محوِ پرواز ہے۔ اور اس پرواز کی راہ کی تمام منازل کے جو راز اس پر آشکارا ہوتے ہیں۔ وہ انتہائے مسرت میں اپنے خاکباز اور بے حوصلہ طائرانِ چمن پر ظاہر کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ بھی اس کی پیروی کریں اور رفعت کی طرف جھپٹیں۔ یہ خاکباز ہمنوا اس کے الاپ کو فقط مسرت سے سن لیتے ہیں۔

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اقبال اپنی شاعری کا نہ خود قائل ہے اور نہ اپنے آپ کو شاعر کہنا چاہتا ہے۔ وہ

ایک قلندر ہے۔ جو نفرِ بیخودی کے جذبات نغموں میں الاپ جاتا ہے۔

مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ شاعر نہیں ہے۔ وہ شاعر ہے اور حقیقی شاعر، ایسا شاعر کہ جو اپنی شاعری کے انتہائی احساسات و جذبات میں گم ہو کر اپنی شاعرانہ حقیقت سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اس کی شاعرانہ حیثیت کو حقیقی طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ فن شعر کا صحیح مفہوم ہمارے ذہن میں ہو۔

شاعری کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ بعض نے اسے منظوم کلام کہا ہے۔ بعض نے اسے الفاظ کی برجستگی اور تراکیب کی چستی پر زور دیا ہے۔ بعض اسے علوِ تخیل کا نام دیتے ہیں۔ بعض محض لفظ آرائیوں پر اسے منحصر کرتے ہیں۔ مگر دراصل شاعری ان تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ برجستگیٔ الفاظ، لطافت و جذبات، علوِ تخیل، موزوں اندازِ بیان پر ہی شاعری کا انحصار ہے۔ اور انہی چیزوں کے کمال سے شاعری میں کمال آتا ہے۔ احساسات و جذبات کو الفاظ میں پیش کر کے ان کے موافق اثرات پیدا کرنے کا نام شاعری ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہر شاعر کے جذبات و تاثرات کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور چونکہ طبائعِ انسانی فطرتاً مختلف واقع ہوئی ہیں۔ اس لئے مقاصد کی پسندیدگی میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اور اسی لئے متضاد آرار ظاہر ہوتی ہیں۔ اگرچہ علامہ اقبال کا مقصد ایک عالمگیر اخوت کا آئینہ دار تھا۔ تاہم اقبال کے متعلق بھی یہ اختلاف ظاہر ہو کے رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گروہ تو انہیں شاعر ایشیا قرار دیتا ہے۔ اور بعض کور ذوق لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کے شاعرانہ کمالات کے اعتراف سے گھبراتے ہیں اور ایک غیر معقول توجیہہ کے ساتھ کہ فلسفہ کو شاعری میں دخل نہیں۔ اقبال کو فلاسفر قرار دے کر انہیں خود ساختہ شاعرانہ حدود میں داخلہ کی ممانعت کا اعلان کرتے ہیں۔ بعض اسے صرف صوفی قرار دیتے ہیں جس کا ترانہ وجدانی نغمات ہیں۔ شاعری نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے

کہ اقبال کی حیثیت جامع ہے ۔ وہ شاعر ہے مگر کیسا شاعر جو اپنے تخیل میں حکیمانہ غور و خوض کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ۔ خودداری کے ساتھ اپنے پیغام کو دنیا تک پہنچانے میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ خود کو بھول جاتا ہے ۔ اس کا پیغام کسی خاص فرقہ و مقام تک محدود نہیں ۔ بلکہ وہ ساری دنیا کو پیغام دیتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے ۔ کہ اہل عالم موجودہ تہذیب و تمدن کے خطرات سے آگاہ ہو کر فطرتی مسلک کی طرف رجوع کریں اور امنِ عامہ کے ضامن بن کر زندگی کے حقیقی معیار تک پہنچیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

وہ موجودہ دور کے خطرات سے دنیا کو آگاہ کر کے ایک بہترین لائحہ عمل پر اسے چلانا چاہتا ہے ۔ جس طرح ایک خفتہ جماعت کو بیدار کرنے کے لئے ایک الارم کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ اقبال نے " بانگ درا " سے خفتہ قسمت دنیا کو بیدار کرنا چاہا جب دنیا اس بانگ سے بھی بیدار نہ ہوئی ۔ تو شاعر اس کے اندر ولولے پیدا کرنے کے لئے ترغیبی تدبیر کرتا ہے ۔ چنانچہ "بال جبریل" سے اس کو جوش دلا کر اسے اٹھانا چاہتا ہے ۔ مگر جب خفتہ قسمت سے دنیا بیدار نہیں ہوتی ۔ تو سمجھتا ہے کہ عصائے موسوئی سے ہی کام چلے گا ۔ چنانچہ " ضرب کلیم " سے غفلتِ اقوام کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے ۔ مگر اقوام کی غفلت ابھی تک یاس افروز ہے ۔ ان کا چوتھا مجموعۂ کلام جسے اب "ارمغانِ حجاز" کا نام چند در چند وجوہات کی بنا پر دے دیا گیا ہے ۔ اس کے متعلق پہلے یہی مشہور رہا کہ اس کا نام " صورِ اسرافیل " ہوگا ۔ اور یہ نام شائد اس لئے رکھا گیا تھا ۔ کہ شاعر مایوس ہو کر دنیا کو خواب گراں سے جگانے کا آخری حربہ استعمال کرنے کو اٹھا ہے ۔ اور قیامت برپا کر دینا چاہتا ہے ۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ دنیا بیدار ہو اور اپنی حقیقت کو سمجھ کر ارتقا کی طرف مائل ہو ۔ علامہ اقبال کی شاعری کا مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

جبکہ آپ سیالکوٹ میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس زمانہ کی شاعری چند غزلیات پر مشتمل ہے۔ جن میں تراکیب کی بندش، زورِ تخیل، صفائی اور سادگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ اور اقبال کے بلند مستقبل کی پیش گوئی کرتی ہیں۔

دوسرا دور اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ آرنلڈ کے فلسفہ کا اثر، انگریزی شاعری کا دقیق مطالعہ اور گرد و پیش کی فضا کے اثرات نے آپ کے جذبات و احساسات کو مجلی و مصفیٰ کر دیا اور ایک ہی شعر نے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

آپ کے زورِ تخیل کو پنجاب پر ظاہر کر دیا۔

دورِ ثالث میں آپ غزلیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سوز و گداز سے وطنی اور قومی نظمیں لکھنا شروع کرتے ہیں "نالۂ یتیم، ہمالہ، نیا شوالہ، ہندوستاں ہمارا، میرا وطن وہی ہے، وغیرہ نظمیں مشہور ہوتی ہیں۔ انجمن حمایت اسلام کا اسٹیج آپ کے نغموں سے گونجنا شروع ہوتا ہے۔

اس کے بعد چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ جبکہ آپ یورپ تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں کے مشاہدات کے زیرِ اثر ان کے جذبات میں تغیر آیا۔ شاعری کو انہوں نے پختہ طور پر قومی و ملی اصلاح کا ذریعہ بنا لیا۔ اور اردو سے فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ فلسفہ اور تصوف کے دقیق و وسیع مطالعہ نے آپ کو اس زبان میں دقیق ترین خیال کو ظاہر کرنے کی سہولت نظر آئی۔ اس کے بعد آپ کی طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان آ کر آپ نے فارسی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ "اسرارِ خودی" "رموزِ بے خودی" "پیامِ مشرق" "زبورِ عجم" "جاوید نامہ" اور "مثنوی مسافر" اسی عہد کی یادگار ہیں۔ اس دور کی انتہا پر آپ کا اردو کلام "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کے ناموں سے شائع ہوتا ہے۔ "ارمغانِ حجاز" جس کے لکھنے میں آپ اپنی زندگی کے

آخری حصہ میں مصروف تھے۔ افسوس وہ مکمل نہ ہوسکا۔ اور تشنۂ تکمیل رہا۔

اب آپ کے تمام کلام پر بحیثیت مجموعی تبصرہ کرتا ہوں۔ آپ کی تمام شاعری میں جو عنصر غالب ہے وہ خودی کی تلقین ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

آپ اتحاد عالم کے دل سے خواہاں تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں — غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

چونکہ آپ کے خاندان میں صوفیانہ عقائد گھر کر چکے تھے۔ اس لئے آپ کے کلام میں بھی جا بجا تصوف کے گراں بہا موتی بکھرے پڑے ہیں۔ رومی اور عطار کا اثر آپ پر غالب ہے مگر آپ کا فلسفۂ تصوف امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ صوفیائے قدیم بیخودی کے قائل تھے۔ خودی کو مٹانا اور فنا فی اللہ ہو جانا ان کا عرفانی توسل تھا۔ مگر علامہ اقبال اس چیز کو مرگِ دوام تصور کرتے ہیں۔ آپ خودی کی تلقین کرتے ہیں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہی فلسفۂ تصوف آپ کی ساری شاعری پر اثر انداز ہے۔

اقبال کی شاعری مبالغہ سے مبرّا ہے۔ عام شعراء کی روش کے خلاف آپ نے حقائق بیان کئے ہیں۔ اور حقیقت بیانی ہی آپ کی شاعری کا اعلیٰ وصف ہے۔

"ارضی خداوندان" سے تو ڈرنا برکنار آپ خدائے قدوس کے سامنے بھی آزادی سے اپنا مافی الضمیر کہہ دیتے ہیں۔ "شکوہ" اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔ آپ کی شاعرانہ تصانیف میں اکثر جگہ جہاں کہیں خدا سے تخاطب کیا گیا ہے۔ آپ کی نیازمندانہ شوخی ظاہر ہو کے رہی۔ مثال کے طور پر "بال جبریل" کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

تری دنیا میں ہیں محکوم و مجبور — مری دنیا میں تیری بادشاہی

تِرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا   یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی   خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
خدائی اہتمام خشک و تر ہے   خداوندا! خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ   یہ درد سر نہیں درد سر ہے

آپ نے شاعری کی تمام اقسام پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم، رباعی، مخمس مسدس، مثلث، تضمین، اور ظرافت وغیرہ۔

تضمین اگرچہ آپ نے بہت کم لکھی ہیں۔ مگر جو لکھی ہیں وہ کمال کا درجہ رکھتی ہیں آپ کی ظرافت اکبر الہ آبادی کی سی ظرافت نہیں بلکہ ان سے امتیاز رکھتی ہے۔ آپ کی تراکیب چست، مگر غیر مانوس الفاظ سے پاک ہیں۔ اشارات وکنایات سے آپ مختلف سبق دے جاتے ہیں۔ آپ کے ظریفانہ اشعار زمانہ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں ؎

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں   مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف   پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے
تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ   دفعِ مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض   دل چاہتا ہے ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق   کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

ایک مشہور نظم ایک آرزو، میں اقبال خدا سے دعا مانگتا ہے کہ اے خدا! مجھے اس شور و غل کی دنیا سے الگ ایک مکان پر سکوت عطا ہو جائے۔ ایسا مکان جہاں ؎

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں   ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ   پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی   جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو۔
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو   سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے   رونا مرا وضو ہو۔ نالہ مری دعا ہو

ندی کے کناروں کا جو عکس پانی پر پڑتا ہے اس کو شاعر نے کس ندرت و لطافت سے بیان کیا ہے۔ پانی کی موجوں کے بلند ہونے کا باعث پانی کے کہسار کے نظارہ کی خوبصورتی کو دیکھنے کی خواہش قرار دینا، پھول کی ٹہنی کے سطح آب پر جھکنے کو ایک حسینہ کے آئینہ دیکھنے سے تشبیہہ دینا، غروب آفتاب کے وقت شفق کو عروس شام کی مہندی لکھنا اور شبنم کو آب وضو کہنا کمال شاعری اور نزاکتِ تشبیہہ کا معراج ہے۔ جو صرف اقبال ایسے ندرت آفرین اور جدت پسند شاعر ہی کا حصہ ہے۔ شکوہ میں فرماتے ہیں ع

ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

اس ایک مصراع میں ضرورتِ فریاد کو کمال خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے

ایک شاعر اور ایک مصور کے لئے انتہائے کمال یہ ہے:۔ کہ وہ جس چیز کا نقشہ کھینچے ہو بہو اس کی شکل پیش کر دے چنانچہ علامہ اقبال نماز کی تصویر کس خوبصورتی سے کھینچتے ہیں ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایک بند میں ایک تصویر کھینچ کر دکھا دینا یہ کمالِ مصوری نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کاروانِ حجاز سامنے نماز پڑھ رہا ہے۔

موج مضطر کے ساکن ہو جانے کی تصویر یوں کھینچی ہے:

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

ماہِ نو کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

المختصر آپ کے کلام میں علوِ تخیل کے ساتھ دلکش اندازِ بیان شامل ہے۔
الفاظ و معانی اپنی لطافت و وسعت کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہیں۔ خیالات کی بلند آہنگی، جذبات کی لطافت، الفاظ کی برجستگی، اندازِ بیان کی موزونیت اور پھر ان کی باہمی لطیف آویزش نے اقبال کو شاعری کا اقبال بنا دیا ہے

۱۹۳۸ء

محمد احمد سبزواری

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں　　کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ہندوستان یا اسلامی دنیا کے شاعر نہ تھے بلکہ بہ حیثیت شاعر، متفکر اور فلسفی ان کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ چنانچہ مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار نے آپ کی وفات پر جو بیان دیا ہے۔ اس میں کہا کہ مسولینی اقبال کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اور آپ کی متعدد نظموں کا ترجمہ اطالوی زبان میں ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ دنیا کے بڑے حصہ کو براہ راست اپنا پیغام پہنچایا اور باقی ماندہ دنیا اس کے ترجموں سے مستفید ہوئی۔ اقبال کی وفات سے مشرق اور بالخصوص ہندوستان کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ اور مادر ہند اپنے اس عظیم المرتبت فرزند کی جدائی پر جتنی بھی سوگواری کرے کم ہے۔

غالب کے بعد اردو اور فارسی شاعری میں اقبال کا ہی درجہ ہے۔ خود اقبال غالب سے متاثر بھی ہوا - اور ان دونوں میں بعض خصوصیات مشترک بھی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے سر شیخ محمد عبدالقادر سابق مدیر مخزن نے بانگ درا کے دیباچہ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں بھی جا کر چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی پیکر خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا۔ اور محمد اقبال نام پایا"

اقبال محض شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ جید عالم بھی تھا۔ اس نے ایک طرف مولانا روم، غالب اور دوسرے مشرقی علماء کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تو دوسری جانب انشٹنے، برگساں، اور گوئٹے کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ اور اس وسیع مطالعہ سے اس نے اپنا ایک جدید فلسفہ پیش کیا، اقبال نے شاعری اور فلسفہ کو ملا دیا۔ اس کے تمام کلام حتیٰ کہ صبح، شام، شفق جیسی معمولی سادہ نظموں میں بھی جابجا فلسفہ موجود ہے۔

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ قومی شاعر نہ تھا۔ اور ہندوستان میں رہ کر عراق و عرب کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہ حیثیت مسلمان اس کو فلسفۂ اسلام کے مطالعہ میں سہولت ہوئی اور اس کا بڑا گہرا اثر اس پر پڑا، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے حقائق و واقعات کو نظرانداز نہیں کر دیا۔ دراصل یہ سوال کچھ آسان بھی نہیں ہے کہ کسی شاعر کا کسی بات کے متعلق صحیح اور قطعی نظریہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کے پیشِ نظر تو حقائق اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر پہلو پر جدا جدا روشنی ڈالتا ہے۔ اقبال مذہب کو کسی ملک سے وابستہ نہیں کرتا۔ وہ عالمگیر اخوت پر زور دیتا ہے وہ غلط قومیت کو بھی مہلک سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ان خیالات کا جابجا اظہار کرتا ہے طارق کی مثال سے اسے واضح کیا جا سکتا ہے

طارق چو بر کنارِ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

جوابِ شکوہ میں صاف صاف کہہ دیا ہے۔ کہ مذہب کا تعلق کسی خاص خطے سے نہیں ہے۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

وطن کی محبت بلاشبہ ایک عزیز ترین شے ہے۔ مگر اس میں مبالغہ اور غلو سے کام لینا بھی مناسب نہیں۔ موجودہ زمانہ میں وطنیت کی انتہائی شدت اکثر ممالک میں

نظر آرہی ہے، اور دنیا اس کے خطرناک نتائج سے بھی ناواقف نہیں ہے، چنانچہ اقبال کسی ملک کی قید بھی گوارہ نہیں کرتا۔

تو ابھی رہ گذر میں ہے، قیدِ مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر، پارس و شام سے گذر

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے حسب ذیل اشعار دیکھ کر کون انکار کرسکتا ہے۔ کہ اس کو ہندوستان سے محبت نہ تھی۔ وہ تو نہ صرف وطن بلکہ اس کے پہاڑوں، دریاؤں، وادیوں، اور مناظر تک سے الفت کرتا ہے، اس کو خاکِ وطن کا ذرہ ذرہ عزیز ہے۔ وہ وطن سے دور رہ کر بھی وطن کو یاد کرتا ہے۔ ورڈسورتھ کے "لوے" کی طرح گو اونچی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ مگر اس کا دل اپنے آشیانے کی طرف لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے متعلق کہا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا!
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہندوستانی بچوں کے گیت میں لکھتا ہے۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!

شاعر کو وہ "دیدۂ بینائے قوم" سے تشبیہہ دیتا ہے، اور دیدۂ بینا کا ملک کی تباہی پر آنسو بہانا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے ملک کی حالت پر روتا ہے

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وہ ہندوستانیوں کے آپس کے نفاق اور نا اتفاقیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ ان میں عزم و استقلال کی ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے۔ مگر جب دیکھتا ہے۔ کہ ملک پر جوں تک نہ رینگی تو فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیتا ہے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ان تباہیوں کے قصے بزرگوں سے سُنے ہونگے۔ اور آج جو بات بات پر لڑائی، جھگڑا، دنگا، فساد، مار پیٹ، کی نوبت آرہی ہے۔ وہ ہم سب کے سامنے موجود ہے۔ شاعر کے پیش نظر دونوں چیزیں تھیں۔ اس نے ساری کیفیت کو اس شعر میں پیش کیا ہے۔

یا باہم پیار کے جلسے تھے۔ دستور محبت قائم تھا
یا بحث اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے!

ہندوستان میں قومیت کا کھیل بالکل جدید چیز ہے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد سے اس کا آغاز سمجھنا چاہیے ۱۹۳۵ء کے نئے دستور کے بعد اس میں جان ڈالنے کی کوشش شروع ہوئی۔ شاعر نے اس تخیل کو بہت عرصہ پہلے اس صورت میں پیش کر دیا تھا۔

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا اور چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اقبال نے اگر ایک جانب ابوبکر صدیق رض بلال رض اور اسلام کی دوسری برگزیدہ ہستیوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ تو دوسری جانب ہندوستان کے مشاہیر اور بزرگوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ سوامی رام تیرتھ، رام مہاراج، گرونانک، جیسے بزرگوں سے بھی وہ عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ رام مہاراج کے متعلق لکھتا ہے۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

گورو نانک کے متعلق ارشاد ہے۔

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اقبال کے اسلام میں ایک جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ وہ انسان کو پستی سے رفعت کی جانب لے جانا چاہتا ہے۔ اس کو عزم و استقلال، کوشش، نیک کرداری، صداقت اور بہادری کی تعلیم دیتا ہے۔ زندگی مصیبتوں اور خطروں سے پر ہے۔ مگر بلند ہمت انسان ان خطرات سے نہیں گھبراتا۔ وہ ان کا جان توڑ کر مقابلہ کرتا ہے۔ اور زندگی میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔

ذیل کے اشعار میں ان ہی چیزوں کو پیش کیا ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زندگی کی راہ میں چل لیکن ذرا بچ بچا کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

قسمتوں کو بگاڑ اور بنا سکتے ہیں۔

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستیٔ شوق — نہ مال و دولتِ قارون نہ فکر افلاطون

کسی ملک کے نوجوانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی تعیشات و تنوعات میں بسر کریں۔ بالخصوص غلام ملک کے نوجوان کو اس وقت جب کہ اس کے ہم وطن قوم کی خاطر قربانیاں دے رہے ہوں، جاہ و منصب، آرام و آسائش، اور مال و دولت کی تمنا نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

موجودہ دور سرمایہ داری کا دور ہے، سرمایہ داروں نے مزدوروں پر جو مظالم روا رکھے ہیں۔ ان کی داستان بڑی تلخ اور طویل ہے، مزدور جو دراصل دولت پیدا کر رہا ہے۔ اس کو اپنی پیدا شدہ دولت کا اتنا حصہ بھی نہیں ملتا۔ کہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کے اچھی طرح شکم پروری بھی کر سکے۔ اور وہ لوگ جو پیدائش دولت میں قطعی کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ مزدوروں کے خون اور پسینہ کی کمائی سے اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کر رہے ہیں۔ اور تو اور مزدوروں کی پیدا شدہ آمدنی کی بدولت مزدوروں کے حقوق غصب کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ اس طویل داستان کو کس عمدہ پیرایہ میں ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکات

لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں کہلواتا ہے

رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت!
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ!
دنیا ہے تری منتظر، روز مکافات!

روس میں جو انقلاب ہو رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ دوسرے ممالک میں مزدور جو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر تھی۔ اس لئے وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب سرمایہ داروں کا خاتمہ قریب ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔

زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے	پرانی سیاست گری خوار ہے
تماشا دکھا کر مداری گیا	گیا دور سرمایہ داری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دور سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے، غریبوں کو ان کے جائز حقوق۔ مزدوروں کو ان کی مزدوریاں دلوانے، مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ گرفت سے چھڑانے، اور نام نہاد مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی غلط تعلیم و تدریس کے خلاف آواز بلند کرتا ہوا خدا کی زبان سے کہلواتا ہے۔

کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو	اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو	گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو	جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
پیران کلیسا کو۔ کلیسا سے اٹھا دو	کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

وہ اس ساہوکار کو جو اپنی ناجائز ترکیبوں سے غریبوں کی آمدنی کا بڑا حصہ بشکل سود وصول کرتا رہتا ہے۔ اور اس نظام سلطنت کہ جس میں غریبوں کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو، جہاں وہ اپنی دادخواہی بھی نہ کر سکیں، جہاں کوئی ان کی آواز سننے والا نہ ہو۔ ایک ہی سمجھتا ہے۔

جو جتنا کمزور ہوتا ہے اس کو اتنا ہی زیادہ دبایا جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد کس طرح یورپ کی مختلف حکومتوں کو دبایا گیا۔ ان کی نوآبادیاں چھین لی گئیں، فوج و اسلحہ میں کمی کی گئی

تاوان جنگ عائد کیا گیا۔ اور دنیا خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ مگر جب یہ ملک خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے۔ اور قوت و اقتدار حاصل کیا۔ تو پرانے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا۔ اسلحہ و فوج میں اضافہ کیا۔ نئے نئے ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ اور دنیا نے بھی بے چون و چرا ان کے حقوق کو تسلیم کیا۔ شاعر یہی کہتا ہے۔ کہ جب تک دوسروں کی مدد اور بھروسہ کا انتظار کروگے اس وقت تک تم ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر واقعی زبردست بننا چاہتے ہو تو خود اپنے اندر قوت و صلاحیت پیدا کرو تب ہی دنیا تمہارا لوہا تسلیم کریگی ورنہ کمزوروں کو دنیا پیستی ہی رہتی ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

ان اشعار کو دیکھ کر کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ وہ شاعر انقلاب نہ تھا۔ وہ بادشاہت، سرمایہ داری، اور ظالمانہ قومیت کے خلاف ہے۔ اور ببانگ دہل ان کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ جدید تعلیم کے رواج سے ملک میں تعلیم یافتہ افراد ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی بڑی تعداد مغرب کی تقلید میں مصروف ہے۔ مغرب کی جن مختلف باتوں کی تقلید کی جا رہی ہے۔ ان میں سے ایک چیز الحاد بھی ہے۔ سوسائٹی ان لوگوں کو قدامت پرست تصور کرتی ہے۔ جو باوجود تعلیمیافتہ ہونے کے خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں اقبال کہتا ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم!
کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں پیش کیا ہے۔

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائر دیں کر گیا پرواز

دوسرا شعر آج سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے کا ہے۔ ورنہ آج تو یہ حال ہے کہ دنیا بھی نہیں ملتی، وہ موجودہ تعلیمی نظام سے بھی مطمئن نہیں۔ اس کا خیال ہے، اور جو بالکل صحیح ہے۔ کہ موجودہ طریقہ تعلیم ہم میں صحیح علمی مذاق، پختہ فکر، پیدا نہیں کرتا۔ اور ہماری تعلیم

محض کتابی ہو کر رہ جاتی ہے۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فروغ کہ تو   کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

حکمران قوتیں کبھی یہ نہیں چاہتیں کہ ان کے محکوم ممالک آزاد ہوں، خواہ ان سے بجائے فائدہ کے نقصان ہی کیوں نہ پہنچ رہا ہو۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ باوجود جمہوریت کی دلدادہ ہونے کے اور باوجود جمہوریت کا دم بھرنے کے فلپائن کے چند معمولی جزیروں کو بھی مکمل آزادی نہیں دینا چاہتی۔ زبردستی ان کو محکوم بنائے ہوئے ہے یہی صورت دوسری حکمران قوتوں کی ہے۔ اگر کبھی محکوم ابھرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو مختلف حیلوں، بہانوں، اور تدبیروں سے ان کو تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے۔ شاعر نے اس حکمتِ عملی کو یوں بیان کیا ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مسلمانوں کے پاس، اول تو جائیداد ہی نہیں۔ اور جو کچھ ہے وہ بھی ان کی فضول خرچیوں اور بری عادتوں کی بدولت ان کے قبضہ سے نکلتی جا رہی ہے۔ اس خیال کو بھی لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

پیروں کی جس قدر عزت و وقعت ہمارے ملک میں ہے شاید ہی کسی ملک میں ہو، خود مرید کے گھر میں کھانے کو نہ ہو مگر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں نذر، حلوے مانڈے، دستار و تہہ بند کا پیش کرنا ضروری ہے، دراصل ان میں اور ساہوکار میں کوئی فرق نہیں، ایک غریبوں کی آمدنی بہ شکل سود وصول کرتا ہے۔ اور دوسرا بہ شکل نذرانہ، پھر بعض مرتبہ اپنے رکیک افعال سے ان بزرگوں کو بھی بدنام کرتے ہیں، جن کے یہ نام لیوا ہیں مگر اس کے باوجود بھیڑوں کے لباس میں بھیڑیوں سے کوئی بدگمان نہیں۔ اور ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہا جاتا ہے، شاعر نے کس انداز اور خوبی سے قلعی کھولی ہے۔ نیز نظم کا عنوان "باغی مرید" قرار دیا ہے، کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ کوئی صاحب ارادت و عقیدت مرید تو ان کی شان میں گستاخی کرنے

کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ — مانند بتاں پجتے ہیں کعبہ کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا — ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اردو شاعری کے جدید دبستان کے امام مولانا حالی تھے۔ جنہوں نے گل و بلبل، سنبل و ریحان اور ہجر و وصال کی پارینہ داستانوں کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی۔ اقبال اس دبستان کے چیلے اور سب سے اہم علمبردار تھے۔ انہوں نے اس نوشگفتہ کلی کو گل نورس میں تبدیل کیا۔ انہوں نے اعلیٰ جذبات، قومی سیرت، انسانی عظمت، صحیح ذوق طلب اور سیاست حاضرہ پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھ کر شاعری کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اقبال نے فطرت کی ان چیزوں میں بھی حقیقت کی جھلکیاں دیکھیں جنکو دوسرے مبتذل اور عامیانہ سمجھ کر نظر انداز کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گائے، گلہری، مکڑی، مکھی، جگنو جیسی بے حقیقت اور معمولی چیزوں پر اعلیٰ قسم کے نظمیں لکھ کر اپنی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا۔ جگنو جیسے حقیر کیڑے پر جو نظم لکھی ہے۔ غالباً اردو ادب اب تک تو اس کا جواب پیش کر سکا۔ کہتا ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو — ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا۔ مغرب میں کافی عرصہ تک قیام کیا۔ مگر وہ مغرب کی پرشکوہ عظمت و جبروت سے مرعوب نہ ہوا۔ وہ ہر مغربی نشئے کو اپنے شوق کے معیار پر جانچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور مشرقی تہذیب کا علمبردار تھا۔ اس نے مغربی خیالات

کی رو میں اپنے پاؤں نہ اکھڑنے دیئے اس کی شاعری میں مشرقی نشاۃ ثانیہ کی روح موجود ہے۔ اس نے قدامت اور جدت میں اس صحیح اور موزوں تناسب کو قائم رکھا جو ہر دور میں کسی راست فکر معلم، شاعر، یا مجدد کا فرض ہے۔ ایسے افراد جو قوموں کی رہبری کرتے ہیں، ان کا ادب بناتے ہیں، ان میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں ہر وقت اور ہمیشہ پیدا نہیں ہوتے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ میر نے ان ہی مستیوں کے متعلق کہا ہے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اقبال ہم سے جدا ہو چکا ہے، زندگی میں کبھی اس کی عظمت کا وہ احساس نہ ہو سکا جو اب ایک خلا کی صورت میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ جو اس کی وفات سے پیدا ہو گیا ہے، گو اقبال آج ہم میں موجود نہیں۔ مگر اس کا کلام جو فنائیت کی دسترس سے باہر ہے۔ ہمارے ادب کا گرانبہا سرمایہ ہے۔ جس سے نہ صرف ہم بلکہ آنے والی نسلیں بھی مستفید ہونگی۔ وہ ان کے لئے شمع ہدایت کا کام کرے گا محفلوں کو گرمائے گا۔ دلوں میں جولانیاں پیدا کرے گا خفتہ قوموں کو بیدار کرے گا۔

۱۹۳۸ء

میر سراج الدین علی خان

اقبال کی شاعری کا اہم پہلو

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کی محرک ہندوستان والوں کی وہ داستانِ غم اور درد بھری کہانی ہے۔ جو قوم کو ہمیشہ خون کے آنسو رلاتی رہے گی یہ ایسا عبوری دور تھا۔ جبکہ مسلمان اپنے محور سے ہٹ چکے تھے۔ ان پر ادبار، کاہلی، خود فراموشی اور احساسِ پستی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ جہالت غلامانہ ذہنیت اور مغربی تمدن کے مضر اثرات ان کی قومی زندگی اور قوتِ فکر وارادہ کو گھن کی طرح کھوکھلا کر رہے تھے۔ ان کی مثال اس بادبانی کشتی کی سی ہو گئی تھی۔ جو ہر ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اور ہر دامنِ موج کو اپنا مامن سمجھتی ہے۔

اس دورِ تلاطم میں قوم کی نگاہیں ایسے عیسیٰ نفس، بے لوث اور دردمند رہبران قوم کی متلاشی ہوتیں۔ جو ان کی ڈوبتی ناؤ کو ساحلِ مقصود تک پہنچا دیں۔ جو ان کے قالبِ مردہ میں زندگی کی روح پھونک دیں اور ان کی عظمتِ رفتہ کو بار بار یاد دلا کر ان کے جذباتِ خفتہ کو پھر سے بیدار کر دیں۔ سرسید، حالی، اکبر اور اقبال قوم کے اس خواب کی تعبیر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قوم کو خوابِ گراں سے بیدار کرنے میں اقبال کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ اقبال نے ایک ایسا جامع نظام العمل اور تصورِ حیات پیش کیا جس کی بدولت پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے قوم کے تنزل و تباہی کا اصل سبب ان میں احساسِ خودی یا احساسِ نفس کا فنا ہو جانا قرار دے کر یہ ثابت کیا کہ خودی کا تصور ہی فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے

فلسفۂ خودی یا فلسفۂ احساسِ نفس کو اقبال یوں بیان کرتے ہیں۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداری کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے　　نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے　　فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

انسان میں جب جذبۂ خودی کارفرما ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی کو حصولِ مقاصد کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ وہ ان تمام مشکلات پر غالب آجاتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اقبال جس زندگی کے تصور کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ تمناؤں، آرزوؤں اور مقاصد کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ اس زندگی کو بیکار اور بے قیمت قرار دیتے ہیں۔ جس میں کشمکشِ حیات نہ ہو۔

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
ما زِ تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

ایک مقصد کے بعد دوسرا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ لاتناہی ہوتا ہے۔ جذبۂ خودی انسان کو کبھی ایک حال پر رہنے نہیں دیتا۔ وہ نئے مقام اور نئے مقصد کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اس لیے کہ زندگی میں سکوت و جمود موت کے مترادف ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

محبت سے خودی میں نئی جان پڑ جاتی ہے اور جو شخص خودی کے اس زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔ دنیا کی ساری قوتیں اس کے زیر اثر ہو جاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماں دہ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود

اقبال اطاعت اور ضبط نفس کو شیوۂ انسانیت قرار دیتے ہیں۔ جس کے بغیر خودی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ قوموں کی ترقی اور کامیابی کا راز آئین و اصول کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور نفس پر قابو پانے میں مضمر ہے:

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند
خویش را زنجیری آئیں کند
شکوہ سنج سختیٔ آئیں مشو
از حدود زندگی بیروں مشو

اقبال کا یہ ایقان ہے کہ جس طرح قطرہ کے دریا میں مل جانے سے قطرہ کے وجود کی نفی نہیں ہوتی اسی طرح فرد کے ملت یا جماعت میں ضم ہو جانے سے فرد کی ہستی فنا نہیں ہوتی بلکہ اس میں نئی جان پڑ جاتی ہے اور اس کو ایسا ابدی استحکام نصیب ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو زیر نہیں کر سکتی یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی خودی پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے ؎

فرد تا اندر جماعت گم شود!
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است

اقبال کا یہ ایقان ہے کہ خودی کی تکمیل کا واحد ذریعہ اسلام ہے جس کے سر چشمہ پیغمبر اسلام ہیں۔ یہی وہ بزرگ و برتر ہستی ہے جس کا دامن تھام کر مسلمان نجات ابدی حاصل کر سکتے ہیں۔

از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما
از میانِ بحر او خیزیم ما
مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ایں کہ یک جانیم از احسانِ اوست
قوم را سرمایۂ قوت ازوست
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازوست

اقبال جس اسلام پر فدا ہیں وہ مساوات اور اخوت کا حامی اور نسل و نسب کے امتیازات کا دشمن ہے وہ محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں دیکھنا چاہتا ہے

امتے از ما سوا بیگانۂ | بر چراغِ مصطفےٰ پروانۂ
ناشکیب امتیازات آمدہ | در نہادِ او مساوات آمدہ
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است | بوریا و مسند دیبا یکے است

قرآن کریم اسلام کی روح اور زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے۔ یہی وہ مقدس کتاب سماوی ہے۔ جس کو حرزِ جاں بنا کر مسلمان فلاح دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زمان دلِ من پئے خوب تر نگارے

زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بہ میرم از قرارے
دلِ عاشقاں بہ میرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

خودی کی ہے یہ منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پہ
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اقبال مال و دولت کی طلب میں صاحبان ثروت کے آگے دست سوال دراز کرنا جذبۂ خودی کے منافی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے انسان قعرِ مذلت میں پڑ جاتا ہے۔ اور اس کے لیے دنیا میں کوئی باعزت مقام نہیں رہتا۔ غیر کا دست نگر ہونا اپنی عزت وحمیت کو خاک میں ملانا اور اپنی خود داری کا خون کرنا ہے۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج
گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج
از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخلِ سینائے خودی

وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر
گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر
چوں حباب از غیرت مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

فقر سے انسان میں شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو خودی کی شرطِ اولین ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

صوفیاء کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو شیخ کی محبت میں اس طرح فنا کر دے۔ کہ وہ اپنی ہستی اور وجود کو بھول جائے۔ صوفیا اپنی اصطلاح میں اسے مسئلہ فنا فی الشیخ کہتے ہیں۔ لیکن اقبال کا یہ ایقان ہے کہ شیخ کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کرنے سے احساس نفس یا احساس خودی کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی بدولت روحانی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ اور جذبۂ خودی کو معراجِ کمال نصیب ہوتا ہے۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے
آں کتاب زندہ قرآن حکیم

حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است

بہر حال اقبال کی شاعری کا یہی وہ اہم پہلو ہے۔ جو ہمارے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے۔ جو سوتوں کو جگاتا ہے۔ اور جاگتوں کو حیات ابدی سے مالامال کرتا ہے۔ ان کی شاعری بالخصوص مسلمانانِ ہند کی رگوں میں جس نامعلوم طریقہ سے بیداری، خودشناسی اور جذبۂ عمل کی لہر دوڑا دی ہے اس کا صحیح طور پر اندازہ لگانا اس وقت ناممکن ہے۔ البتہ مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو اقبال کا نام سرِ ورق رہے گا۔

اقبال مر چکے ہیں لیکن ان کی تعلیمات زندہ ہیں۔ ان کی آواز دنیا کے گوشے گوشے میں گونج رہی ہے۔ اور زبانِ حال سے عمل و حریت کا پیام پہنچا رہی ہے۔

۱۹۳۸ء

میاں ارشد محمود

اقبال اور جدید اُردو شاعری

ہماری جدید ادبی تحریک غدر کے بعد ظہور پذیر ہوئی قدیم روایات اپنے پورے زور پر تھیں۔ شوبی اثرات نے ان میں تغیر پیدا کرنا شروع کیا۔ سرسید۔ حالی۔ شبلی آزاد اور ان کے معاصرین کی سرگرمیاں انہی تغیرات کی آئینہ دار ہیں۔ جہاں تک ذہنی امور کا تعلق ہے غدر سے پہلے ہندوستان کی حالت بعینہٖ وہی تھی جو ہمیں یورپ کے ازمنہ وسطیٰ میں دکھائی دیتی ہے۔ یورپ کی طرح یہاں بھی توہم پرستی کسر نفسی، مذہبیت، تصوف، جمود، نفی، خودی اور ظاہر پرستی کا دور دورہ تھا۔ تہذیب، تمدن اور زندہ ادب کا نشو و نما پانا محالات میں سے تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہاں یزداں پرستی (DIVINITY) کا چرچا تھا۔ اور انسانیت (HUMANISM) کے نغمے شاذونادر گوش زد ہوتے تھے۔ چونکہ تمام لوگوں کی نظر آنسوئے افلاک پر مرتکز تھی۔ اس لئے وہ دنیوی کاموں میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی۔ کہ وہ دام تعلق سے آزاد ہو کر عالم لاہوت میں سرگرم پرواز ہوں۔ اہل یونان کی مسرت پرستی ان کے نزدیک ایک ایسا لفظ تھا جو شرمندہ معنی نہیں۔ فردوسی سے لے کر گرامی تک جتنے شاعر گذرے ہیں ان سب کے کلام میں تصوف کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ سعدی ہو یا حافظ۔ رومی ہو یا عطار۔ عرفی ہو یا نظیری۔ سب کے سب ایک ہی راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

بس عدم گردم عدم چوں ارغنوں
گویدم کانا الیہ راجعوں

اور حافظ شیراز فرماتے ہیں ۔

کہ اے بلند نظر شاہبازِ سدرہ نشیں
نشیمن تو نہ ایں کنج محنت آباد است
ترا ز کنگرہ عرش مے زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است

صرف غالب ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں تصوف اور قنوطیت کے ساتھ ساتھ مسرت پرستی کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ادبی امور میں بھی صورتِ حالات اس سے زیادہ مختلف نہ تھی وہی سلف پرستی جو ہمیں مذہبی اور معاشرتی امور میں دکھائی دیتی ہے شعر و ادب کی دنیا میں بھی موجود تھی ۔ شعرا بالعموم اپنے بزرگوں کے ہی نقشِ قدم پر چلنا پسند کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی شاعری میں کوئی تازگی یا جدت نہیں پاتے ان میں مقررہ اصناف ۔ مضامین ۔ تشبیہات اور استعارات کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعرا کا دائرہ فکر بہت محدود ہے ۔ اور سطحی باتوں پر قناعت کرنے کے عادی ہیں ۔

آج کل جب کہ ہم ڈرامائی ۔ رزمیہ ۔ غنائیہ شاعری کے نام سے مانوس ہیں ۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے ۔ کہ زمانہ قدیم میں اربابِ فن کو ان کا کوئی علم نہ تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ ہمیں ایرانی شاعری میں رزمیہ اور غنائیہ شاعری کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں ۔ لیکن اتفاقاً شاعری کی ان اقسام کے نمونے دستیاب ہونا اور بات ہے اور شاعری کو دانستہ ان اقسام میں تقسیم کرنے کے بعد ان کے نمونے پیش کرنا اور بات ہے قدیم زمانہ میں ان اقسام کی عدم موجودگی کا سبب یہ تھا ۔ کہ اس وقت اہلِ فن

سے امتیاز نہیں کر سکتے گویا اقبال بھی کیٹس (KEATS) کا ہمنوا ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ "حسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن - اس سے زیادہ انسان کو اور کسی چیز کے جاننے کی ضرورت نہیں"۔

ڈاکٹر اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں - جنہوں نے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے - اور اپنی قوم کو یہ بتایا ہے کہ جو قومیں دنیا میں ترقی کرنا چاہتی ہیں - انہیں ترکِ خودی کے مسلک گوسفندی سے پرہیز کرنا چاہیئے - کیونکہ زندگی جدوجہد اور پیہم کشمکش کا نام ہے - اس کے علاوہ اور جتنے بھی نظریے ہیں وہ باطل اور بے بنیاد ہیں - انسان کی زندگی کا مقصد صرف روحانی نشوونما ہی نہیں بلکہ مادی نشوونما بھی ہے - اگر ایک طرف ہمارا یہ فرض ہے - کہ ہم علم و حکمت - تہذیب و تمدن - سیاسیات اور اقتصادیات میں دلچسپی لیں - آپ نے ایک ہی جنبشِ قلم سے اہل مشرق کی ذہنیت بدل دی ہے اور ان کی سرگرمیوں کا رخ تبدیل کر کے ان کو دنیا میں امن پھیلانے کی ترغیب دی ہے -

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے - اقبال دور اول کے شعرا اور عہدِ حاضر کے رومانوی شاعروں کے درمیان حد فاصل ہیں - ایک طرف ان کی طبیعت اپنے پیشروؤں کی ہمرنگ ہے اور دوسری طرف وہ عہد حاضر کی شاعری کا اچھا خاصا عکس پیش کرتے ہیں - وہ ایک طرف عصرِ کہن کی مذہب پرستی اور روحانیت کے پرستار ہیں - اور دوسری طرف عہدِ حاضر کے شعراء کی طرح حسن آفرینی کا ذوق رکھتے ہیں - جو بات آپ کو جدید نوجوان شعراء سے متمیز کرتی ہے - وہ آپ کا اخلاقی احساس اور حقیقت پرستی ہے - جدید رومانوی شاعر حقیقت کو حسن کے منافی خیال کرتے ہیں - ان کے نزدیک شاعر کا فرض مصوری ہے - حقیقت طرازی نہیں - اگر ہم حقیقت کو شاعری میں لانا چاہتے ہیں تو ہمیں حسن کے

معنی کی بجائے صورت سے مانوس تھے۔ اور انہوں نے شاعری کی تقسیم اصناف کے اعتبار سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم شاعری کا سرمایہ بالعموم غزلوں۔ قطعوں اور مثنویوں تک محدود رہا ہے۔

استعارات۔ تشبیہات۔ مضامین اور بحور میں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ یہ تمام چیزیں شروع ہی سے مقرر ہو چکی تھیں۔ اس لیے شعرا بالعموم انہیں پر اکتفا کرتے تھے۔ جب مضامین اور تشبیہیں پہلے ہی سے مقرر ہوں تو لازماً شاعر کو اپنی طبیعت پر زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہی سہولت تھی۔ جس نے آج تک پرانی قسم کی تشبیہات اور مضامین کی مقبولیت زائل نہیں ہونے دی۔ شاعر تصوف کے مسائل کو آسانی سے پیکر نظم میں لا سکتا ہے۔ اور سامعین سے داد تحسین حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر وہ کوئی نیا مضمون باندھے یا اس کے لیے کوئی نیا پیرایہ اختیار کرے تو اسے اپنے مداح پیدا کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ بہر نوع یہ بات قدیم اردو شاعری کی خصوصیات میں داخل ہے کہ اس میں شاعر کے لیے آزادی کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہ تھا۔

تنقید کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اس کی کائنات چند تذکروں تک محدود تھی۔ جو بالعموم حشو و زوائد سے پُر ہوتے تھے ان میں شعرا کے سوانح حیات کا خواب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن صائب آراء اور تنقید عالیہ کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ شعراء کے دیوانوں میں کوئی اچھی بات دستیاب ہو جائے۔ لیکن تنقید کی کتابوں میں ظاہر پرستی کا اس قدر غلبہ نظر آتا ہے۔ کہ ہم ان سے کوئی مفید بات اخذ نہیں کر سکتے۔

یہ ماحول تھا۔ جس میں مغربی ادبیات نے غدر کے بعد تغیر پیدا کرنا شروع کیا۔ اور جس طرح یورپ میں نشاۃ ثانیہ نے رفتہ رفتہ زندگی کے

ہر شعبہ پر تسلط پیدا کر لیا ہے۔ اس طرح ہندوستان میں مغربی تہذیب و تمدن کے زیر اثر قدیم روایات اور شعائر کا اثر کم ہوا۔ اور ان کی جگہ نئی روشنی کے آثار نمودار ہوئے۔ اگر غدر سے پہلے ہندوستان میں درویشی۔ تصوف۔ توکل اور تجرد کا دور دورہ تھا۔ تو اب تحصیل معاش۔ جد و جہد اور تنازعہ للبقا کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اگر پہلے ترک خودی کو قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا تو اب تربیت خودی کو قومی ترقی کی تمہید تصور کیا جانے لگا۔ اور اگر پہلے تسلیم۔ اطاعت اور انکسار کو پسند کیا جاتا تھا۔ تو اب جستجو استفسار اور تحقیق کا ذوق پیدا ہوا۔ سرسید۔ حالی۔ شبلی اور اکبر مختلف صورتوں میں انہی رجحانات کے نمائندہ ہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا مظہر ڈاکٹر اقبال تھے۔ ہم شرق کے اس زندۂ جاوید شاعر کی عظمت کا اندازہ اسی صورت میں لگا سکتے ہیں جب ہم ان کی شاعری کا قرون وسطیٰ کی شاعری کے ساتھ موازنہ کریں۔ اور پھر ان کے پیشروؤں کے ساتھ مقابلہ کریں جنہوں نے جدید اردو شاعری کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قدیم شاعری اور تصوف کے مسائل سے قصداً انحراف کیا اور ایک نئی قسم کی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ یہی کام آپ سے پیشتر مولانا حالی بھی انجام دے چکے تھے۔ اور انہوں نے فلسفۂ خودی سے بے خبر ہونے کے باوجود اپنی زندہ دلی کا ثبوت بہم پہنچایا تھا۔ بایں ہمہ ان کے یہاں وہ حرارت۔ وہ ولولہ۔ وہ تنوع مضامین۔ جدت اور رفعت تخیل نہیں۔ جو ہمیں اقبال کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔ حالی کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ایک بیدار مغز اور زندہ دل مصلح قوم تھے۔ لیکن اقبال فی الحقیقت علوم مشرق و مغرب کے جامع اور یگانہ روزگار شاعر تھے۔ ان کا کلام نہ صرف ہمارے ذہنی تجسس کی تسکین کرتا ہے۔ بلکہ روح کے لئے وجد و کیف کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس میں حقیقت اور حسن کی اس طرح آمیزش کی گئی ہے کہ ہم ان دونوں کو ایک

ضمن میں لانا چاہیے۔ اگر شاعر اظہار حقیقت کے لئے حسن کو اپنا آلہ کار بنائے گا۔ تو اس کی شاعری کبھی جاودانی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ عہدِ حاضر کے شعراء نے نئی نئی اصناف اور موضوع اختیار کئے ہیں۔ شاعری کے ترنم میں زیادہ آزادی اور لچک پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے نظم معرّا اور نظم رواں کو رواج دینا شروع کیا ہے اقبال میں خالص حسن کا ذوق موجود نہیں۔ اس لئے وہ متضاد رجحانات کا شکار رہیں۔ آپ کو خود بھی اس امر کا احساس تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے آپ کو ایک نظم میں مجموعہ اضداد قرار دیا ہے۔ یہ خصوصیت ہمیں آپ کے مرتبہ کی تعیین میں بہت مدد دیتی ہے۔ کیونکہ آپ کی اصناف مضامین۔ الفاظ۔ تشبیہات۔ موضوعات۔ عنوانات اور سب سے زیادہ افتادِ طبیعت سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱۹۳۸ء)

خواجہ حمید الدین شاہد

کلامِ اقبال کی بعض خصوصیتیں

از شمارِ دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی موت ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی شاید صدیوں کے بعد ہو سکے۔ ان کی رحلت کا افسوس نہ صرف ہندوستانیوں کو ہے بلکہ تمام دنیائے اردو ان کے غم میں سوگوار ہے، اردو اور فارسی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ہم کو سنوارنے والا نہ رہا۔ فلسفہ مضطرب ہے کہ اس کے مسائل حل کرنے والا ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ ہندوستانی افسوس کر رہے ہیں کہ اب ان کو کون پیغامِ حیات دے گا، حقیقت میں آنکھ اور گوشِ نصیحت نیوش کی ضرورت ہے، ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اگرچہ اقبال کا تنِ خاکی زمین میں دفن ہو گیا لیکن اس کی روح ہر وقت ہمارے لیے پیغامِ حیات لیے پھر رہی ہے۔ "بانگِ درا" اب بھی بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتلا سکتی ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی اب بھی حق شناسی کا سبق دے سکتی ہیں۔ پیامِ مشرق ہر وقت ایک نیا پیغام پیش کر سکتی ہے۔ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق۔" اب بھی سوتوں کو جگا سکتی ہے بشرطیکہ ہم میں شاعرِ اعظم کے پیام کے احترام کا صحیح جذبہ موجود ہو۔

ہر زمانے میں مختلف مقامات پر مختلف پیغمبر آئے اور انہوں نے انسانوں کو صحیح راستہ بتلانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ سننے والوں نے ان کے پیغام کو گوشِ دل سے سنا اور اس پر عمل پیرا ہو کر سعادت حاصل کی۔ جب پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو

دنیا کو پیغام دینے والے شاعر صرف رہ گئے۔ جس طرح پیغمبر الہامی کلام کو لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح حقیقی شاعر بھی اپنے الہامی کیفیات اور واردات قلبی کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات اور کیفیات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ عوام کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنا اور حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے ؎

شاعری جزویست از پیغمبری

جس طرح پیغمبر کی ہر آواز خدا کی آواز ہوتی ہے شاعر کا ہر لفظ الہامی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ شاعر عوام کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے بہت جلد متاثر ہو کر دوسروں میں بھی احساس تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جس کی باعث شاعر کی ہستی ملک و قوم میں امتیاز حاصل کر لیتی ہے۔

اقبال نے جتنا کائنات عالم کا قریب سے مطالعہ کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ انہوں نے مشرقی فلاسفہ مثلاً مولانا روم، عطار، سنائیؒ اور رازی کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے خیالات کو دنیا کے سامنے نئے رنگ میں پیش کیا۔ ان کے کلام میں جا بجا ایک بجلی سی کوندتی نظر آتی ہے۔ طاقت اور زور بیان کا وہ حال کہ سوتوں کو جگا دے، مردوں کو زندہ کر دے، مایوس دلوں کو شاہراہ ترقی پر گامزن بنا دے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے کلام میں سوز و گداز، تڑپ اور اضطراب جا بجا نظر آتا ہے انہوں نے اپنے کلام سے ہندوستان کی زوال یافتہ قوم میں احساس خودی اور جوش عمل پیدا کر دیا۔ ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد دل میں ذوق عمل اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ہر شعر اہل دنیا کے لیے ایک بصیرت افروز پیغام ہے اور ہر پیغام میں حیات جاودانی۔

جن اصحاب نے مولانا اور اقبال کے کلام کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ غرض اقبال ان کے قدم بہ قدم نظر آتے ہیں، جس طرح مثنوی کی وجہ سے مولانا روم کا نام زندہ ہے اسی طرح اقبال بھی اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ کلام کے باعث رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔

اقبال فطرتاً خوددار آزاد منش تھے۔ شاعرانہ قیود کی جکڑ بندیوں کا پابند رہنا ان کی

شان خودداری کے خلاف تھا۔ وہ جس چیز کو بیان کرنا چاہتے آزادانہ اور بے باکانہ کہہ جاتے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ ڈھونڈنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ خیالات خود اپنے ساتھ الفاظ لئے آتے۔ سادگی، بے ساختہ پن، اپج، شگفتگی ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں ہیں۔ ان سب سے زیادہ ان کے کلام میں بلا کا اثر تھا۔ جو بھی لکھتے متاثر ہو کر لکھتے اور دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہتے۔ ان کی انقلاب پسند طبیعت ہمیشہ جمود کے خلاف جنگ کرتی رہتی تھی۔ قوم کو بیدار کرنا اور خودی کا سبق پڑھانا ان کا مطمعٔ نظر تھا خاص کر ہندوستان والوں میں جوشِ عمل، اخوت اور خودداری کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا ان ہی کے سر رہے گا۔

اقبال کا کلام ہمہ گیر ہے۔ اس لیے اس کے متعدد پہلو ہیں وہ ہر جگہ حیات کی گتھی سلجھاتے ہیں اور زندگی کو بے نقاب کر کے دکھانا چاہتے ہیں ؎

ترا ایک نکتۂ سربستہ گویم — اگر درسِ حیات از من بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نہ داری — وگر جانے بہ تن داری نمیری
بہ دریا غلط دبا موجش درآویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
کسے کو در دپنہانے نہ دارد — تنے دارد و لے جانے نہ دارد
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست

بگوشم آمد از خاکِ مزارے — کہ در زیر زمیں ہم می تواں زیست
نفس دارد و لیکن جاں نہ دارد — کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست
تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد وصال — چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام
بساز زندگی سوزے بسوزِ زندگی سازے — چہ بے دردانہ می سوزو چہ بے تابانہ می سازے
باز حیات پوچھیے خضر خجستہ کام سے — زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے
گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر — شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال کی جستجو پسند طبیعت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ تلاش و جستجو کسی نقطہ پر آ کر ختم ہو جائے وہ تمام عمر حقیقت کے پردوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں۔ بحرِ ہستی میں موج بن کر جدھر چاہتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ ساحل کا خیال ان کے لیے سوہانِ روح ہے۔ ان کی اضطراب پسند طبیعت سکون سے بالکل بے نیاز ہے تنگ دامنی اور قناعت ان کی شان کے خلاف ہے۔ ذوقِ سفر کا وہ عالم کہ منزل بھی سنگِ راہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنی منزل کو اسی ذوقِ سفر میں مضمر سمجھتے ہیں۔ وہ ایک جگہ مقید رہنا نہیں چاہتے۔ انکی آزادی پسند طبیعت ہمیشہ پرواز کی طرف مائل نظر آتی ہے سہ

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج — ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے!
مضطرب ہوں دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
نہ ہو قناعت پسند گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم — کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست
گفتم کہ شوقِ سیر نبردش بہ منزلے — گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
بہ آشیاں نہ نشینم زلذتِ پرواز — گہے بہ شاخِ گلم گاہ برلبِ جویم

مسلمانوں کے گھر پیدا ہوتے اور مسلمانوں کا سا نام رکھ لینے سے کوئی مومن نہیں کہلا سکتا صرف باتوں سے نہیں بلکہ کردار اور عمل سے ایمان کی تجلیات

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
آئین جوانمرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت — لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "نازِ بندگی" کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ انسان کو اپنی خوبیوں اور کمال پر ناز ہوتا ہے مثلاً کوئی حسن پر ناز کرتا ہے تو کوئی دولت پر، کسی کو اپنی قابلیت اور شرافت پر ناز ہے تو کسی کو اپنی حکومت اور سروری پر لیکن اقبال کا ناز انوکھی قسم کا ہے۔ وہ اپنے بندہ ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام میں ہر جگہ یہی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ "شکوہ" ان کے نازِ بندگی کی بہترین مثال ہے۔ بعض سطح بینوں نے شکوہ کی گہرائیوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اقبال پر کفر کے الزامات لگائے جن کے بعد ہی انہوں نے "جوابِ شکوہ" لکھا شکوہ میں اقبال نے خدا سے بغاوت نہیں کی بلکہ خدا کی بے نیازی اور بندگی کے ناز کو واضح کیا ہے سے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں
تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ایک جگہ اقبال نے بندگی اور خداوندی پر روشنی ڈالی ہے سے

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ!
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

بندگی کے متعلق اقبال کا تخیل بالکل انوکھا ہے۔ وہ درد و سوز اور تلاش و آرزو کو اصلِ حیات سمجھتے ہیں۔ اور اس کی طرف اس قدر مائل نظر آتے ہیں کہ مقامِ بندگی کے بدلے شانِ خداوندی لینا پسند نہیں کرتے ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

(۱۹۳۸ء)

سید احمد جعفری

اقبال کی حُبّ الوطنی

بیسویں صدی کے اوائل میں جب حضرت اقبال کی شاعری کا آغاز ہوا تو اس وقت ہندوستان ایک عجیب دور سے گزر رہا تھا۔ ملک میں فرقہ بندی کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ انفرادیت اور خود پرستی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ہندوستانیوں کے دلوں سے جذبہ اتحاد و یگانگت بالکل مفقود ہو چکا تھا۔ نہ کوئی ان کا لیڈر تھا۔ اور نہ ہی کوئی ان کی منظم جماعت تھی۔ اور ہندوستان کے بسنے والوں میں سے وہ تمام صفات جا چکی تھیں۔ جن کی بدولت ایک ملک کے افراد کو اپنے ملکی مفاد کا احساس ہو سکتا ہے — فرنگیت کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مغربی تہذیب بڑی سرعت سے ہندوستان میں اپنے پاؤں پھیلا رہی تھی۔ حالات اہل وطن کے لیے نا مساعد تھے۔ غرض ہر طرف بربادی اور ہلاکت کے سامان نظر آ رہے تھے۔ اور یوں دکھائی دیتا تھا۔ کہ اگر اس دفعہ یہ سفینہ ڈوب گیا تو قیامت تک اس کا دوبارہ سطح آب پر ابھرنا ممکن نہیں۔

فطری امر ہے کہ ہر شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعینہٖ یہی حال حضرت اقبال کا ہوا اول اول جوانی کی امنگوں اور شباب کے ولولوں نے تغزل کو پسند کیا۔ اور ایک عرصہ تک غزل گوئی ہی آپ کا مشغلہ رہا۔ مگر ابنائے وطن کی بے حسی، غفلت اور خود غرضی علامہ مرحوم کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ حب الوطنی کا وہ جذبہ جو قدرت کاملہ نے آپ کو ودیعت کیا تھا۔ بیدار ہوا اور وہ بے اختیار پکار اٹھے۔

بھلا نبھے گی تیری ہم سے کیونکر اے واعظ　　کہ ہم تو رسم محبت " کو عام کرتے ہیں

علامہ اقبال کی حقیقت شناس اور دور اندیش نگاہوں نے بھانپ لیا۔ کہ "رسم محبت" کو عام کرنے کے لیے اہلِ ہند کے دلوں میں اتحاد و یگانگت کا بیج بونا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک لوگ انفرادیت اور خود غرضی کے جال میں جکڑے رہیں گے۔ "رسم محبت" عام نہ ہو گی۔ چنانچہ گل و بلبل۔ زلف و رُخ اور کنگھی چوٹی کے فرسودہ مضامین کو خیرباد کہہ کر اقبال نے ایک نئے انداز سے اہلِ وطن کی خود پرستی، بے حسی اور قومی انتشار کا ذکر چھیڑا اور حقائق کو اشعار کی شیرینی میں قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

آپ کی چند ابتدائی نظمیں مثلاً "ہمالہ"، "ہندوستان ہمارا" جو سراسر جذباتِ حب الوطنی سے لبریز ہیں اسی زمانہ میں لکھی گئیں۔ مذہب کا نام لے کر فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے والوں سے اقبال کہتے ہیں۔ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

علاوہ ازیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ملک کے لیے آزادی حاصل کرنے کا بنیادی اصول اتحاد ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی قوم کے افراد "اسیرِ امتیازِ ما و تُو" ہوئے۔ زمانہ نے ان کی گردنوں میں محکومی کا طوق ڈالا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے گئے۔ چنانچہ حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تُو رہنا!

نفاق، بربادی اور ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

اقبال کی اتحاد پسند طبیعت ابنائے وطن کے باہمی نزاع کو پسند نہیں کرتی۔ وہ نہیں چاہتے کہ ملک خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بن جائے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تو ان کے

دل پر ٹھیس لگتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹایا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجۂ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

حضرت اقبال بار بار اتحاد پر زور دیتے ہیں۔ اور یہی فرماتے ہیں۔ کہ

ہے جذبِ باہمی سے سارے نظام قائم
پوشیدہ ہے یہ نقطہ تاروں کی زندگی میں

حضرت اقبال کی نکتہ رس نگاہیں جو کچھ دیکھتی تھیں۔ وہی ان کی زبان سے نکلتا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ

آنے والے مصائب کے متعلق اقبال اہل ہند کو یوں خبردار کرتے ہیں :۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

پھر فرماتے ہیں۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

"نیا شوالہ" حضرتِ اقبال کی وہ اتحاد پرور نظم ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ایک ایک لفظ میں اتفاق و اتحاد کا شاندار درس پنہاں ہے۔ فرماتے ہیں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

قوم نے یہ محسوس کر کے کہ ہمارے عین درمیان ہم اس سے اس قدر قریب دنیا کی ایک عظیم الشان ہستی موجود ہے اور ہم کم بخت اس کی نادر صحبت سے ذرا فیض نہیں اٹھاتے۔ مسلمانوں نے اپنے قومی شاعر کی بڑی قدر کی گو گزشتہ سردیوں میں میں نے بعض دفعہ ان کے پاس جا کر ان کی تنہائی اور بے کسی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ان کی آواز میں باوجود ہمت و استقلال کے اب اتنی محبت اور رقت کے جذبات بھرے رہتے تھے کہ انہیں یاد کر کے ان کی طرف اپنی کوتاہیوں پر شرم سی آنے لگتی ہے۔ سچ ہے انسان کی قدر مرنے کے بعد ہی آتی ہے۔

کس قدر قانع اور حوصلہ مند طبیعت پائی تھی سے

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

اور بے نیاز سے

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

اور پھر وہی سے

پر سوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ذرا اپنے ہی بعض اور لیڈروں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیے، کس طرح گمنامی اور ترکِ دنیا کے ذریعے سے بھی اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ لیکن مرحوم کو ہی خوشی تھی کہ سے

خوشی آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے؟

اس کے ساتھ ہی انھیں اپنے حیات بخش پیغام کی اہمیت کا احساس تھا، اپنے مزار کے لیے یہ کتبہ چھوڑ گئے ہیں ؎

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بُود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بُود

اور اپنی رحلت سے چند منٹ پیشتر یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزِ گارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

جناب حفیظ ہوشیارپوری نے ان کی یہ تاریخیں کہی ہیں۔

"ڈاکٹر سر محمد اقبال مُرد" — "پیغمبر دین خودی"
۱۳۵۷ھ — ۱۹۳۸ء

(۱۹۳۸ء)

محمد اسماعیل مسلم

اقبال کی تعلیم جوانمردی زندہ دلی

اقبال کی شاعری ایک مخزن طلسمات ہے۔ اندیشوں میں جدت، موضوعات گوناگوں۔ بات کے ڈھنگ بوقلموں، کبھی حب الوطنی کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ کہیں مزدوروں کو سرمایہ داروں کے آہنی پنجوں سے رہا کرانے کی تجاویز سوچ رہا ہے۔ لیکن نوجوانوں کو سازِ شعر سے بیدار کرنا ہے۔ کہیں صوفی و عارف کے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے لیکن شمع خودی جلا کر بھولے بھٹکے مسافروں کو منزل مقصود پر لانے کی مساعی کر رہا ہے۔ اور کبھی فقر صبر سے اخلاقی معیار کو ہفت اقلیم کی بلندیوں تک پہنچا رہا ہے۔ لیکن میں ان چند سطور میں شاعرِ مشرق کی جس نوعیت فکر پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں۔ وہ اس کی جوانمردی، زندہ دلی کی تعلیم ہے۔ اور تعلیم بھی وہ تعلیم جو عین اسلامی ماحول کے مطابق ہے۔

قوموں کا مستقبل بہت حد تک ان کے طریقۂ پرورش اور طریقۂ تعلیم پر منحصر ہوتا ہے "وائے بر حالِ ما" ہمارے والدین شروع سے ہی مسافروں کی بات کھوٹی کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ ایام کم سنی میں ہی بچوں کے دل و دماغ میں بھوتوں پریتوں کی ڈراؤنی تصاویر کا عکس بٹھا دیتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں سے فارغ ہو کر بھی ان کی روحیں ان خیالی بلاؤں سے لرزاں و ترساں رہتی ہیں۔ مذہب اور رسم و رواج کی غلط روائتیں سنا سنا کر ہونے والے جانبازوں کے حوصلے پست کر دیئے جاتے ہیں۔

اللہ بخشے اقبال مرحوم کو وہ ایسی پھیکی اور کمزور تعلیم کے خلاف پوری جد وجہد سے جہاد کرتے رہے ان کی نظروں میں وہی تعلیم مقبولیت دوام سے آراستہ ہو سکتی ہے جو طلبا میں اوصاف حمیدہ کی بنیاد ان کے بیباکی واستقلال کو بھی اوصاف حمیدہ کی ایک لڑی سمجھتے ہیں۔ جن کے بغیر اخلاق وانسانیت مکمل نہیں ہوتے۔ علامہ مرحوم ایسی تعلیم کے سخت خلاف ہیں۔ جو خوف وبیدلی پیدا کرے۔ جس طرح عشق خودی کو تقویت بخشتا ہے۔ اسی طرح خوف کا احساس انسانی صفات کو جڑوں سے اکھاڑ دیتا ہے۔ اقبال کی شاعری ببانگ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے۔ کہ خوف وخطرات قوتِ عمل کو مضمحل کر دیتے ہیں۔ خوشگوار زندگی خارستان بن کر رہ جاتی ہے۔ خوف مکر وفریب اور کینہ وشر کا سرچشمہ ہے۔

لابہ ومکاری وکین ودروغ
ایں ہمہ از خوف مے یابد فروغ
ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست

اقبال کی گردن آستانِ حق کے سوا اور کہیں نہیں جھک سکتی۔ وہ فقط خوف حق کے قائل ہیں۔ ان کے مذہب میں خوفِ غیر نشانِ شرک وکفر کی علامت ہے۔ اور خوفِ حق پختگیٔ ایمان کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لا تحزن بگیر
گر خدا داری غم آزاد شو!
از خیالِ بیش وکم آزاد شو!
بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی راہزن است

تخم او چوں در گلت خود را نشاند
زندگی از خود نمائی باز ماند
ہر کہ رمزِ مصطفٰے فہمیدہ است
شرک را در خوفِ پنہاں دیدہ است

اقبال تعلیم توحید سے ہر قسم کے خوف و خطرات اور اندوہ و غم کا کفارہ کرنا چاہتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اشاعت توحید سے زندہ دلی و جوانمردی کو معرض وجود میں لانا چاہتا ہے۔

خوفِ دنیا خوفِ عقبےٰ خوفِ جاں
خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حبِّ مال و دولت و حبِّ وطن
حبِّ خویش و اقربا و حبِّ زن

زندہ دلی و استقلال قائم رکھنے کے لئے اقبال عشق و اولوالعزمی کی تلقین بھی کرتا ہے۔ عشق قوموں کو خوف و ہراس کی بے پناہ تاریکیوں سے نکال کر ہمت و جوانمردی کی روشنی میں لے آتا ہے۔ اور غلاموں کو تخت پر بٹھاتا ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولے
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی
آئینِ جوانمردی ۔ حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہماری یونیورسٹیاں اور تعلیم گاہیں تلزم مصائب کی موجوں کو دیکھ کر ہراساں اور دل شکستہ ہونا سکھاتی ہیں۔ لیکن اقبال طوفان بھنور میں کود پڑنے

کو زندگی اور جوانمردی کے نام سے یاد کرتا ہے۔

سرّ ایں فرمان حق دانی کہ چیست
زیستن اندر خطرہا زندگی ست

جو معلم طلبار کا دامنِ حیات بیباکی واستقلال جیسی نعمتوں سے نہیں بھر سکتا۔ علامہ اقبال اسے خیرباد کہنے کو تیار ہیں جس تعلیم کی آغوش میں شوقِ عمل کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ اس سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(۱۹۳۸ء)

جہاں بانو بیگم

نذر اقبال

کچھ نظر کو لائے ہیں مرے دیدۂ تر بھی

قابل انشا پردازوں نے اقبال کی بے وقت موت پر اخباری دنیا کے لئے کافی مسالہ فراہم کر دیا ہے۔ کالم کے کالم اس کے ماتم میں سیاہ ہو چکے ہیں۔ آج گھر گھر اس کا تذکرہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس سانحہ کے افسوس کا اظہار۔ کتنے دل ایسے ہیں جن میں اس کا دکھ پنہاں ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جس کے انسنے رونے والے ہیں۔ یہ غریبوں کا مجازی بھگوان کس قدر جلدی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

۲۱ اپریل تاریخ عالم کا وہ حسرت ناک دن ہے جس نے مشرق کے ادبی افق سے رنگینی چھین لی۔ فضائے شاعری سے کشش مفقود ہو گئی۔ جس نے ان گنت اور بے حساب دلوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ تسخیر قلوب جس کی شاعری کا ایک جز ولاینفک تھی۔ اس کی موت نے سب کی آنکھیں کھول دیں۔ خبر مرگ نے ایک بیکس کی آہ کی طرح جگر کو چھلنی کر دیا۔ شاعری کی دیوی اندھی ہو گئی۔ حقیقت افسانہ بن گئی۔ واقعی اس مقولہ میں کتنی قوت ہے، کتنا جادو ہے:۔

”ایک ہونہار ادیب یا شاعر کی موت دنیائے ادب کی موت ہے“۔

وہ شوریدہ سری، وہ طوفان و ہیجان وہ تلاطم خیزیاں، وہ جوش و خروش جو اقبال کے قلم اور دماغ کا نتیجہ تھیں۔ قائم تو رہیں گی ۔ جب تک دنیا

قائم ہے۔ لیکن ان کا تسلسل ختم ہوگیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم، عرفان و فلسفہ پر اداسی چھاگئی۔ اب مردہ قوموں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا شاید کوئی نہیں رہا۔ اقبال کی شاعری قومی شاعری تھی۔ اس کا دائرۂ عمل اپنے ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے لیے زندہ تھا۔ شاید یہ ٹھیک ہی ہے۔

مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے

جیتا ہے وہ جو مرچکا انسان کے لیے

اقبال کی موت ایک فلسفہ ہے۔ جس کو سوچنے اور اس پر سر دھننے سے دماغ تھکا ہوجاتا ہے۔ اقبال کو موت سے وابستہ کرنے میں دل پس و پیش کرتا ہے۔ یقین کی حس ساکت و صامت ہوجاتی ہے۔ شاید زندگی کا لطف اسی میں ہے۔ کہ انسان آئے اور چلا جائے۔ ابدی زندگی کس کام کی — سو سو برس جینے کی لوگ دعا دیتے ہیں — اف کتنی بددعا دیتے ہیں — خیال کرنے سے وحشت ہوتی ہے۔ اور فوراً زبان سے "خدا نہ کرے" نکل جاتا ہے۔ ۶۰ — ۷۰ برس ہی کتنے بہت ہیں۔ خضر کیا کر رہے ہیں نہیں معلوم زندہ رہ کر اتنے زمانے سے "ابدی زندگی" نصیب ہے۔!!

تخیل — زندگی کے متعلق ایک خیالی دنیا — جس میں علو ہمتی ہو۔ اولوالعزمی ہو، ہمت و حوصلہ، وجدانِ کیف ہو، اسی کا نام شاید تخیل ہے اور اقبال ان محسوسات شاعری کا ناخدا تھا۔ بجھی ہوئی خاموش طبیعت کو اکسانے والی قوتیں اس کے قلم میں چھپی ہوئی تھیں۔ جس کو ایسے ایسے جادو جگانے یاد تھے کہ بس دنیا جانتی ہے۔

اس کا "شکوہ" ایک نیچے کا اظہار ہے۔ وہ زبان جو شکوہ پہ تلی تو اللہ کو بھی اس نے نہ چھوڑا اور پھر خدا کی شان اللہ ہی کی زبان لے لی۔ اور اسی شکوہ کا وہ دنداں شکن جواب دیا کہ جیسے خدا خود بول رہا ہے۔ شکوہ میں اس نے بات اٹھا نہیں رکھی۔ خوب ہی بھڑاس نکالی۔ اللہ کو پناہ بخدا "ہرجائی"

ٹھہرایا ــــــ اس پردۂ ناز کو بھی ناز ہو گیا۔ اس کے نالۂ بیباک نے آسمانوں کو چیر دیا۔ افلاک کے جگر کے چاک ہو گئے۔

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
بولے سیارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں، اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوہ کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

اللہ کی زبان میں کتنی مٹھاس بھر دی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

"جواب شکوہ" میں انسانی زندگی کے لئے عمل کا سبق ملتا ہے۔ وہ جو کہہ دیا نا کسی نے "کوشش کرنے سے خدا ملتا ہے" اقبال اس مقولے کی رگ رگ پر چھا دی ہے۔ وہ قوموں کو حرکت میں لانے کے لئے بے چین ہے۔ اور قوتیں رکھنے والوں کو بے چین و مضطرب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو جمود و سکوت ناپسند ہیں۔ اس کے الفاظ میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے اشعار کے بے پایاں دریا سے ان موتیوں کا اقتباس ستاروں کو گننے کے مشغلے سے کم نہیں۔

اقبال کی شاعری نے ایک عالمگیر ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ بلاشبہ اقبال پر بعض اوقات غالب کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ اس نوع سے زندہ غالب تھے۔ آج یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ صرف اقبال ہی نہیں بلکہ غالب بھی دنیا سے چل بسے۔

اقبال کی شاعری جھوٹے ڈھکوسلوں اور نفسانی لاچاریوں سے قطعاً بے

نیاز ہے ۔ اقبال میر کی طرح سرہانے آہستہ بولنے کی استدعا نہیں کرتا روتے رونے ابھی آنکھ لگنے کا اس کو گلہ نہیں ۔ بلکہ اس کے یہاں دھوم دھام یوں ہے ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو!

فرانس کا سب سے بڑا مفکر و ادیب روسو کہتا ہے ۔

" ہر ادبی کارنامہ انسان کا ذہنی شاہکار ہے "

خیال تو کیجئے اقبال نے ایسے کتنے شاہکار چھوڑے ہیں ۔ جن کا ٹھکانا نہیں —— جو بجائے خود ایک گلدستہ ادب ہے " بانگ درا " میں اقبال ایک ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہے ۔ اور بال جبریل میں ایک پانے والے کی طرح مطمئن ۔ بانگ درا زیادہ تر رنگ ہے ۔ اور بال جبریل تمام تر رس " یہ وہ الفاظ ہیں ۔ جو وجد نے اقبال کیلئے لکھے ہیں ۔ اور شاید اس سے بہتر تشریح نہیں ہو سکتی ۔

احساس خودی اور سخت کوشی یہ اقبال کے پیام کے دو اہم اجزا ہیں ۔ وہ اپنے نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کر رہا تھا — کہ زندگی ختم ہو گئی ۔ فلسفہ منہ ہی تکتا رہ گیا ۔ اقبال ایک سچے آدمی کی طرح اپنے طرز کلام میں صاف اور بے باک ہے ۔ جوش و خروش ہی تو اس کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں ۔ اور انہیں —— کا یہاں پلہ بھاری ہے ۔ اقبال کا نظریہ تھا ۔ کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت ؎

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کسی کا خیال ہے کہ زندگی ایک معمہ ہے " سمجھنے کا نہ سمجھانے کا " لیکن جن کے بازوؤں میں قوت ہے اور جوش ہمت ان کے ساتھ ہے ۔ اقبال عشق کو دنیا کی سب سے بڑی قوت اور حیات انسانی کی سب سے

اہم ضرورت خیال کرتا ہے ؎

جہانِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اسی کی بدولت منصور "انا الحق" کے نعرے لگاتا ہوا اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اسی کے طفیل موسیٰ کلیم اللہ بن جاتے ہیں۔ پریم کا رس ہر بول میں مٹھاس پیدا کرتا ہے ؎

تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں
اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں ہیں

رونے دھونے بسورنے گڑگڑانے کی جگہ اقبال کے یہاں ہمت افزا خیالات ہیں حوصلہ افزا تخیلات ہیں۔ ایک نیا شعور، ایک نئی ذہنیت سے اس کی شاعری معمور ہے یہی کاوش اور تلاش جمالیات کا مذاق سلیم اس کی قلم کی روحِ رواں ہے۔ اقبال کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا اثر رکھتی ہیں۔ اس کے یہاں وہی حسن و عشق، ساقی و صہبا، روندے ہوئے خیالات مہمل الفاظ کا گورکھ دھندا مفقود ہے۔ اس کا ذہن ہمیشہ اپنے مستقبل کو سمجھنے کی کوشش میں محو رہتا تھا۔ بال جبریل ایک کہن سال بزرگ کی فریاد ہے۔ اس میں شاعری کا زور بیان ہے۔ خیالات کے دھندلے نقوش شوخ ہو گئے ہیں پہلے جو باتیں رمز و کنایہ میں کہی تھیں وہ اس میں صاف صاف اور برملا بے دھڑک کہہ دی ہیں۔ بانگ درا میں مناظر قدرت کا ڈھیر ہے۔ طفلانہ چشمک ہے "ماہِ نو"، "برفیامت" کے الفاظ میں

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

یہ تشبیہہ استعارے کی سرگرمیاں ہیں "تصویرِ درد" کے لفظ لفظ سے درد و الم آشکارا ہے۔ یہ خود ایک درد و غم کی تصویر ہے۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
میں اُن کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا!
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

کچھ بالِ جبریل سے تغزل کی تمثیلیں :-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو غم کیا !
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

یہ اشعار حقائق پر کس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ کہ دماغ کو سوچنے اور غور کرنے کا ایک پر کیف مشغلہ مل جاتا ہے ۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن !
من کی دنیا ؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا ؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آجاتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

غرض کوتاہ بینوں کا یہ نظریہ ہے کہ اقبال کے یہاں تغزل نہیں۔ ایسی ذہنیتیں شاید موسیقی کے فن اور سر سے ناواقف ہیں ۔ بہر کیف ۔

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا ۔

۱۹۳۸ء

ذکیہ احمد

ہمارا قومی شاعر اقبال

ایک انگریزی مقولہ ہے۔ کہ پیغمبروں کی قدر ان کے زمانے میں نہیں ہوا کرتی میرے خیال میں بڑے بڑے شعراء کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی قدر ان کی زندگی میں نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنی ہمعصر قوم سے تخیل کے معیار میں بہت اونچے ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ان کی شاعری قوم کے خیالات میں ایک ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس تلاطم جذبات سے دماغی ارتقا کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور جب اس حالت میں کئی نسلیں گزر جاتی ہیں اس وقت قوم کا دماغ اس قابل ہوتا ہے کہ یہ محسوس اور تمیز کر سکے کہ شاعر کیا کہہ گیا۔ ہمارے قومی شاعر اقبال کا حال بھی اسی طرح پر ہے، سچ پوچھئے۔ تو اس فخر قوم کے دل و دماغ کی قدر اب تک ہم نے کچھ بھی نہ کی۔ حالانکہ وہ نہ صرف ایک عدیم المثال اور اعلیٰ پایہ کا شاعر ہے بلکہ ایک نہایت متبحر فلاسفر اور اسلام کا ہاتف غیبی ہے۔ قابل لوگوں کا تو کیا کہنا، ان پر عجیب حالت طاری ہوتی ہوگی، میں جب اس کا کلام پڑھتی ہوں اور اس کی شاعری کے محاسن صوری و معنوی پر غور کرتی ہوں تو اکثر محو حیرت ہو کر رہ جاتی ہوں۔ اور اس وقت یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ واقعی الشعراء تلامیذ الرحمان یہ غور کرنے کی بات ہے۔ کہ ایک شخص جو دنیاوی تعلیم کے لحاظ سے فلسفہ کا ایک ڈاکٹر اور بیرسٹر ایٹ لاء ہو، وہ جب نظم لکھنے کو قلم لے کر بیٹھے تو اس کے دماغ پر بجز اسلامی تعلیمات اسلامی فلسفہ اسلام کا عشق اور محبت کے کسی اور چیز کا جذبہ اور اثر

عادی نہ ہو سکے ! اگر اس کیفیت اور بیخودی کو تلمیذ رحمانی نہ سمجھا جائے تو اور کیا کہا جائے ؟ مجھے سر اقبال کے متعلق تو کوئی علم نہیں کہ ان کی معمولی زندگی اور خیالات کیا ہیں۔ مگر میں یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ شاعر اقبال اسلام کا دیوانہ اور مجنوں ہے۔ وہ جب اپنی شاعری کی دنیا میں ہنستا ہے تو اسلام کی بہاریں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ جب روتا ہے تو اسلام کے خزاں کو دیکھ کر نوحہ کرتا ہے۔ اور اس کے دل کی آہ دراصل ایک دھواں ہوتی ہے جو اسلام کی عظمت وسطوت کے مزار پہ جلتے ہوئے چراغ نے اس کے دل کو جلا کر پیدا کر دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی تاریخ اور اسلامی تصوف کے متعلق اس کی معلومات کس قدر وسیع، اس کا مطالعہ کس قدر عمیق اور اس کی بصیرت کس قدر زبردست ہے اس کا اندازہ ان اشارات و کنایات سے ہو سکتا ہے۔ جن سے اس کی شاعری لبریز ہے، مذہب اسلام کے باریک سے باریک نکات کی اس خوبی کے ساتھ تشریح کرتا ہے، کہ بیساختہ زبان سے سبحان اللہ کی صدا نکل جاتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں تو یہ ممکن نہیں کہ اقبال کی شاعری پر شرح دبسط کے ساتھ تنقید کی جا سکے، اور نہ مجھ میں اتنی لیاقت و صلاحیت ہے۔ مگر جی چاہتا ہے کہ ناظرین و ناظرات کے انبساط خاطر کے لئے تمثیلاً چند اشعار کا حوالہ دے کر یہ دکھاؤں کہ اقبال کی فکر کس قدر عمیق اور اس کا تخیل کس قدر بلند پرواز ہے۔

اپنی ایک نظم میں ایک مومن جو اپنے معبود کے عشق و محبت میں سرشار ہو۔ اس کی کیفیت بیخودی کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اسی نظم میں خداوند تعالیٰ کی غفاری و بندہ نوازی کا دلاسہ و سہارا دے کر مسلمانوں کو عملی میدان میں جد و جہد کرنے پہ یوں آمادہ کرتا ہے۔

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دراصل یہ عقیدہ ہمارے مذہب مقدس کی ایک وہ خصوصیت ہے جو اس کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ جہاں اکثر مذاہب میں ترک دنیا اور گوشہ نشینی کو اس بنا پر فضیلت دی گئی ہے۔ کہ دنیاوی تعلقات انسان کی معصیت کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ وہاں ہم کو یہ تعلیم ملی ہے۔ کہ دین و دنیا دونوں کو ساتھ ساتھ لیے رہیں۔ حتی الامکان معاصی سے اجتناب کریں۔ اگر تقاضائے بشریت سے کچھ خطا و نسیان ہو جائے۔ تو خداوند تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ بشرطیکہ مومن اپنے گناہوں کے لئے اپنے معبود کے سامنے ہمیشہ شرمسار و سرنگوں رہے۔ اور دل سے یہ محسوس کرے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

اپنی نظم "شمع و شاعر" میں مسلمانوں کے زوال و بربادی اور ان کی بےحسی و غفلت شعاری کا کیا خوب خاکہ کھینچا ہے۔ کہتا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و بزرگی کو امتِ مرحومہ محمدیہ کا کوئی فرد بھلا اس سے بہتر پیرائے میں کیا بیان کر سکے گا۔ جس عنوان سے اقبال نے اپنی نظم حضور رسالتمآب میں بیان کیا ہے۔ اس فرمانے کے جواب میں

نکل کے باغ جہاں سے برنگ دلبو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

یہ گذارش۔

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں

وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آب گینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

سبحان اللہ! سبحان اللہ! سچ ہے جس برگزیدہ جماعت کی مدح و صفت خود اللہ جل شانہ نے اپنے کلام پاک میں بیان فرمایا ہے۔ اس کے خون مقدس سے بڑھ کر بھلا کونسی قیمتی اور نایاب شئے باغ فردوس میں دستیاب ہو سکتی ہے؟ "تصویر درد" اور "شمع و شاعر" میں دنیائے اسلام کے اس ہزار داستان نے جو نواسنجیاں اور شعر و سخن کی رنگین آرائیاں کی ہیں۔ وہ تو بس سمجھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ نثر آخر نثر ہی ہے، اسمیں اتنی قدرت کہاں جو شاعری کی ان رعنائیوں کو بے نقاب کر کے دکھا سکے۔ "شکوہ" کے ایک ایک شعر جب میں پڑھتی ہوں۔ تو گھنٹوں اس غور و فکر میں پڑ جاتی ہوں، کہ آیا یہ نظم خداوند تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہوگی۔ یا اس کی خوشنودی کا۔ یکایک یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا دل کے اندر کوئی کہہ رہا ہے۔ کہ بہت ممکن ہے کہ یہی نظم شاعر کی نجات کا باعث ہو۔ اس کی مغفرت و بخشش کا وسیلہ ہو۔

(۱۹۳۴ء)

شاعرِ اسلام:

- ــــ ایس ایم الہیٰ "اقبال اور عشقِ رسول"
- ــــ سید وحید اللہ وحید "اقبال کی نعتیہ شاعری"
- ــــ ظفر قریشی دہلوی "شاعرِ اسلام"

ایس ایم الٰہی

اقبالؒ اور عشقِ رسولؐ

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو علم و دیں بت کدۂ تصورات

یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اقبال جس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اور جس استاد سے تعلیم پائی وہ صوفی منش خیالات کے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے۔ اور انہوں نے ہونہار بچے کی تعلیم و تربیت اسی طریقہ سے کی جیسی کہ ایک نیک مسلمان خاندان میں ہونی چاہیے تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقبال شروع سے ہی رسولِ اسلام کے ساتھ ایک بے اختیار جذبۂ شوق اور ایک والہانہ محبت رکھتے ہیں جس کی جھلک ہمیں اُن کے اولین کلام میں ملتی ہے کوئی شاعرانہ مبالغہ آمیزی نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا احساس نوجوان شاعر کو فطرتاً تھا۔

تنم گلے ز خیابان جنت و کشمیر!
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

جب آپ نے ہسپانیہ فلسطین و دیگر اسلامی ممالک کی سیاحت کی تو اس جذبۂ شوق پر اور بھی صیقل ہوا۔ اسلامی شان و شوکت کے بچے کھچے آثار اور یادگار اسلاف نے اُن کے دل پر بہت گہرا اثر کیا۔ اور عظمت و شکوہِ اسلام کا سرچشمہ وہ ایک چیز کو ہی سمجھنے لگے اور وہ "عشقِ رسول" تھا۔

بالغ نظر حضرات سے یہ امر مخفی نہیں کہ علامہ نے جو اشعار رسولِ کریمؐ کی محبت

ہیں کہے ہیں عموماً بہت پرسوز ہیں۔ سچ پوچھئے تو شروع سے آخر تک اقبال کی شاعری کا سوز و گداز "عشقِ رسول ؐ" کا بڑی حد تک مرہونِ منت ہے اس عشق نے ان کے کلام کو وہ رنگ اور اثر بخشا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہمعصروں بلکہ شاعرانِ گذشتہ سے بھی بدرجہا ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور شاعر ربانی کہلانے کے مستحق ہیں۔

یہ بات حضرتِ اقبال ؒ کی ژرف نگاہی سے پوشیدہ نہ تھی۔ کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب کمزوری ایمان ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایمان کے لیے ضروری ہے۔ کہ سرورِ کائنات ؐ کی اطاعت خلوص دلی کے ساتھ کی جائے اور یہ اطاعت ہی جب خوفِ عذاب اور طمع معاوضہ سے بلند ہو جائے تو عشق کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اسی عشق میں قوموں کی زندگی پنہاں ہے۔

آپ سرورِ دو عالم ؐ کی سیرت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس مطالعہ پر پہنچے کہ حضور ؐ کی ذاتِ بابرکات تمام صفاتِ ارضی و سماوی اور کمالاتِ ظاہر و باطن کا مجموعہ ہے۔ اقبال ایک انسانِ کامل (Ideal man) کی تلاش میں ہے۔ اس جستجو میں اسے نورِ محمدی ؐ کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ صرف وہ ہی ایک ایسے انسان تھے۔ جن کی دینی و دنیوی زندگی عیوب سے پاک اور برائیوں سے مبرّا تھی۔ اقبال ؒ کو گوہرِ مقصود مل جاتا ہے وہ ایک ایسے کامل انسان کو پا لیتا ہے جس کا وجود تمام نیکیوں کا سرچشمہ تمام خوبیوں کا منبع اور تمام صفات کا مظہر ہے۔ پیغمبرِ اسلام ؐ ہونے سے قطع نظر اقبال ؒ کو ان سے والہانہ عشق اس لئے بھی ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جو ایک کامل انسان میں ہونی چاہئیں۔

ذاتِ خداوندی کا نور ایک پیکرِ آب و گِل میں مجسّم ہو کر اس دنیا میں آتا ہے اور اس "عکس ایزدی" تک پہنچنے کے لئے سعیِ پیہم، درد و گداز

اور ذوق شوق کا نام عشق ہے۔

اپنے اردو کلام میں وہ اکثر فخرِ موجودات کے حضور میں امت کی زبوں حالی و بے بضاعتی کی فریاد کرتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ عشق ایک ذاتی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان کا یقین ہے۔ کہ عقل ایمان مستحکم کی بجائے شکوک شبہ پیدا کرتی ہے ـــــــ آنحضرتؐ کو مخاطب کرکے اپنے سوز و گداز کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں۔

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایمان ہے میرا
تیرے خندۂ رخسار سے حیراں ہونا

اقبالؒ نہ صرف عشق حبیبؐ سے مخمور ہیں۔ بلکہ دیار حبیبؐ کے بھی شیدا ہیں۔ اُن کے لئے پیغمبر صحرا کے وطن کے سامنے جنت الفردوس بے حقیقت ہے ـــ ؎

میں نے سو گلشن جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچہ میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے "قم" مجھکو

عشق نبیؐ کو ہی وہ سب خامیوں کا علاج جانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے قوم کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونکی جا سکتی ہے اور امت کی بیداری کے لئے اس سے زیادہ کوئی حربہ کارگر نہیں۔

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرۂ عشق نبیؐ از حق طلب
ہر کہ عشق مصطفےؐ سامانِ اوست

بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

علامہ کا عقیدہ ہے کہ تخلیق آفرینش ان کے عشق کا ہی نتیجہ تھی، اگر عشق نہ ہوتا تو عالمِ کون و مکاں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ عشق محمدؐ ہی تخلیقِ جہانِ رنگ و بو کا باعث ہوا۔

زانکہ ملّت را حیات از عشقِ اوست
برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست
روح را جز عشقِ او آرام نیست
عشقِ او روزیست کو را شام نیست

اسی عشق نے قرونِ اولیٰ میں غلامانِ نبیؐ کے دلوں میں ایمان کی ابدی شمعیں روشن کی تھیں۔ اسی عشق کی بدولت چند نہتے جاں نثاروں نے ایران و روما کی عظیم الشان سلطنتوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ یہ اسی عشق کا صدقہ تھا۔ کہ چند بے سروسامان مجاہدین سے قیصر و کسریٰ کے تخت لرزاں تھے۔ یہ عشق علامہ کے نزدیک غیر منتہی قوتوں کا مالک ہے جواب شکوہ میں فرماتے ہیں ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

شمع نبوتؐ کے اس پروانے کے نزدیک حضورِ پرنور کی غلامی پر ہزاروں آزادیاں قربان ہیں۔ اس متاعِ گرانمایہ کے سامنے ارضی و سماوی نعمتیں بے حقیقت ہیں۔ یہ ایک ایسا یدِ بیضا ہے۔ جس کے مقابلے پر اور تمام چیزیں سحرِ سامری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں فرماتے ہیں ؎

عجب کیا ہے گر مہ و پرویں میرے نخچیر ہو جائیں

کہ برفتراکِ صبا جبد دلتے بستم سرِ خود را

اور تعشق کی حد ہے کہ:

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا!
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین وہی طاہا

یہ آتشِ عشق تیز سے تیز تر ہوتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں۔ کہ ایمان، قرآن، اسلام، نماز، شریعت اور مومن سب کچھ اسی عشق کی بدولت ہے اور اس کے بغیر یہ سب ایک حرفِ غلط ایک خیالِ خام ہے۔ ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

وہ اس بات سے بے خبر نہیں کہ مادیت اور تہذیبِ مغرب کے اس زمانہ میں وہ وصف جو مسلمانوں کے عروج کا راز تھا۔ آج عنقا ہے۔

عہدِ حاضر سے انہیں اسی لئے شکایت ہے اور وہ متعدد دفعہ مسلمانوں کو اس کے خلاف متنبہ کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد
عصرِ ما۔ مارا زما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد
سوز او را از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

مگر فکر مداوا میں بھی وہ حضور اکرمؐ کی کرم گستری کے امیدوار ہیں۔ ان کے لئے درِ محبوب کے علاوہ اور کوئی پناہ نہیں ہے۔ ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی میرا ایماں ہے زناری

علامہ اقبالؒ بالخصوص آخری عمر میں عشقِ نبی سے بالکل مخمور تھے۔ وہ خداوندکریم سے التجا کرتے ہیں کہ میں عاصی ہوں مگر محشر کے روز حضور صلعم کے سامنے میری لاج رکھ لیجیو۔ تاکہ مجھے گناہوں کی وجہ سے اپنے محبوب کے سامنے شرمسار و سرنگوں نہ ہونا پڑے۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را
حسابِ من ز چشم او نہاں گیر

۱۹۳۹ء

سید وحید اللہ وحید

اقبال کی نعتیہ شاعری

(انسان کامل سے ان کا قلبی ربط)

در جہاں شمع حیات افروختی
بندگان را خواجگی آموختی

(کائنات میں آپ ہی نے شمع حیات روشن کی، غلاموں کو سرداری سکھائی)

اردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں نعت گوئی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان ہر دو زبانوں میں نعت شریف کا وافر ذخیرہ موجود ہے ہر دور کے چھوٹے بڑے شعرا بقدر ہمت اس سعادت میں شریک ہوتے رہے۔ دورِ حاضر کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال نے بھی اپنی مخصوص عظمت کے شایان شان پورے جوش اور اخلاص سے اس میں حصہ لیا۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ مشرق کے شاعر اعظم تھے، اس اعتبار سے بھی کہ وہ انسانیت کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ ان کا یہ "پیام انسانیت" ناقص رہ جاتا اگر ان کا تصور انسان کامل تک رسائی حاصل نہ کرتا۔

علامہ اقبال کو ذات رسالت مآبؐ سے غیر معمولی عشق و محبت تھی۔ ان کے حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ حبِ نبوی کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعبیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا مرجع اور مرکز ذات رسالت مآبؐ ہی ہے۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تو
فکر ما پروردۂ احسانِ تو

(سب کچھ آپ کی عنایت بے پایاں ہی سے حاصل ہوا ہماری فکر آپ کی آغوش احسان کی پروردہ ہے)

علامہ اقبال کا یہ حُب ان کے ترقی پذیر کلام کے ساتھ ساتھ "تدریجا" نکھرتا اور ترقی کرتا گیا تا آنکہ جب ان کا کلام انتہائی بلندیوں پہ پہنچا تو ان پہ مقامات "نبوت کبریٰ" بھی اسی لحاظ سے منکشف اور منفتح ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ کا نام مبارک یا ذکر مبارک کسی کی زبان پہ آجاتا تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہوجاتیں۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ "یوم اقبال" کے موقع پر مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لیے گئے تھے وہ اپنی اس ملاقات کا ذکر "جامعہ" میں یوں کرتے ہیں " دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ (۹) بجے تھے سلسلہ گفتگو ۱/۲ ۱۲ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں کچھ سنایا بھی مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش ایجاد با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر بالکل آیتہ ان اللہ و ملٰئکتہٗ یصلون علی النبی۔ (بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں) کے استغراق کا پُر کیف احساس ہے۔

نعت کے پاکیزہ موضوع پہ علامہ اقبال کی مستقل نظمیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف نظموں، رباعیوں اور غزلوں میں کہیں جستہ جستہ ہے۔

"عندلیب باغِ حجاز" اپنے سینائے دل کی فضاؤں میں گرم پرواز ہو کر بارگاہِ صمدیت میں یوں شرف مخاطبیت حاصل کرتا ہے ؎

؎ شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

بارگاہ قدس سے اپنے حبیبؐ کی صفت وثنا میں ڈوبی ہوئی ندا آتی ہے۔

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

ذکرِ نبی کی ابدیت اور رفعت کی نوید سنائی جاتی ہے۔

چشمِ اقوام، یہ نظارہ ابد تک دیکھے رفعتِ شانِ رفعنالک ذکرک دیکھے

اقبال کوئے حبیب کا سکندر دماغ گدا ہے ماشاء اللہ کیا شان گدائی ہے کہ شوکتِ سلاطین اس کا طواف کرے۔

کرم اے شہ عرب وعجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

سبحان اللہ کیا سرفرازی ہے کہ فرشتے بارگاہِ رسالت میں لیے جاتے ہیں۔ یہ عندلیب باغِ حجاز" یوں مخاطبت کی عزت حاصل کرتا ہے۔

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز
کلی کلی ہے تیری گرمی، نوا سے گداز

اقبال کا قلبِ صافی آٹھوں پہر سرخوشِ جام ولائے محمدؐ ہے اس کی شکست اور فتادگی غیرت وہ سجدہائے نیاز ہے۔

ہمیشہ "سرخوشِ جام ولا" ہے دل تیرا فتادگی ہے تیری غیرت سجودِ نیاز

حضور رسالت مآبؐ میں آبگینۂ دل نذر میں پیش کرتا ہے۔ جس میں امت کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا خون چھلک رہا ہے۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اسمیں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضرت صدیق اکبرؓ جن کا سینہ آتش عشق و محبت کا مجمر تھا۔ ایک دن سارا سرمایہ روزگار حضور نبوی میں خدمت اسلام کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ان کے احساس فدائیت کی ترجمانی حضرت اقبال کی زبان سنیئے۔

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر ۔۔۔ اے تیری ذات باعثِ تکوینِ کائنات

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس ۔۔۔ صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

حضرت بلال جن کی فطرت "نورِ نبوت" سے "مستنیر" تھی ان کے بے تاب جان و دل کا بیان کیا خوب ہوا۔

نظر تھی صورتِ سلمان ادا شناس تری ۔۔۔ شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

حضرت بلال کو مثل کلیم نظارے کا سودا تھا۔

تجھے نظارہ کا مثلِ کلیم سودا تھا ۔۔۔ اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

ادائے دید کے پردہ میں "نیاز و نماز" کی یکجائی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے۔

اشتیاقِ دید کی سعادت میں اقبال کا دل کس درجہ شریک ہے۔ اس کا اندازہ کیجئے۔

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا ۔۔۔ خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

سیرۃ طیبہ میں معراج ایک مہتم بالشان حقیقت ہے اس کا فیضان بقدر ظرف و ہمت ہر مسلم پہ عام ہے۔

ناوک ہے مسلمان ہدف اس کا ثریا ۔۔۔ ہے سر سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

جس نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اس کا مدّ و جزر چاند کا محتاج رہا تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج۔ کہیں ملتِ مرحومہ کی تباہ حالی پہ اقبال بارگاہِ روحِ نبویؐ میں عرض کرتے ہیں۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر ۔۔۔ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ ۔۔۔ آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اوپر عرض کیا گیا ہے جوں جوں اقبال کا ربط محبت ذات نبوت سے بڑھتا گیا ان کے قلب مجلّے پر مقامات نبوت کا انفتاح ہوتا گیا یہاں تک کہ انا من نور اللہ کل خلقہم من نوری۔ (میں اللہ تعالےٰ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے) کے جادوانی کیف و سرور کو اقبال کی بصیرت نے پا لیا اور ان کی یہ بصیرت اس قدر بلند ہوئی کہ بصارت پر چھا گئی۔ اب وہ خودی کی خلوتوں میں کبریائی اور اس کی جلوتوں میں

مصطفائیؐ کا تماشا بے حجاب کرنے لگے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ　　خودی کی خلوتوں میں کبریائیؐ

ظاہرش ایں جلوہائے دلفروز　　باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

اس موضوع پر نسبتاً علامہ اقبال کی فارسی نظموں میں نہایت لطیف اور نازک مضامین زیادہ آئے ہیں۔ ان سب کا احاطہ اس موقع پر ناممکن ہے۔ اس لیے فارسی کے چند شعر پیش کر کے مضمون ختم کئے دیتے ہیں۔

حضورؐ کا ظہور، زندگی کا شباب ہے آپ کے جلوے کے بغیر زندگی ایک خواب بے تعبیر ہے۔

اے ظہور تو شبابِ زندگی　　جلوہ ات تعبیرِ خواب زندگی

حضورؐ کے ظہور نے کائنات کے مدارج بلند و بالا کر دئے۔ آپ کی دولت فقر نے کائنات کو ابدی حقائق کا سرمایہ دار بنا دیا۔ فقر محمدیؐ کو سرمایۂ کائنات کہنا حقیقت کی کتنی پاکیزہ تعبیر ہے۔

از تو بالا پایۂ ایں کائنات　　فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

حقیقی فقر و شاہی اسی ذات کے فیضان سے ہے یہ ساری تجلیاں اسی جلوے کی دریوزہ گری سے مالامال ہیں۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰؐ　　ایں تجلیہائے ذات مصطفیٰؐ

"اٰیت کبریٰ" حضورؐ کا مقام خصوصی ہے۔ اس مقام تک رسائیٔ انسان کا کمال ہے اور معراج ہے۔ حضورؐ کا آشکارا دیدار اور حضورؐ کی قندھار میں حضورؐ کے خرقۂ مبارک کی زیارت کے بعد اقبال کے حسیات کا ارتعاش اور جذبات کا تلاطم دیکھئے۔

رقصد اندر سینہ ام ذرہ جنوں　　تا زراہ دیدہ می آید بروں

بوئے پیرہن پاک سے ان کی مشام جان تازہ ہو جاتی ہے تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

آمد از پیراہن او بوئے او　　داد مارا نعرۂ اللہ ہو

آپ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت بلالؓ کے سرود محبت و کامرانی سے محفوظ ہو چکے ہیں اب ابوجہل کے نوحۂ ہزیمت و شکست کو بھی گوش گزار فرما لیجئے۔ عہد جاہلیت کے

افکار و عادات کے خلاف اسلام نے وحدت، اخوت، مساوات وغیرہ کی جو تعلیم دی ہے وہ متکبر مخالفین کے خیال میں فضل عرب کی تباہی کا باعث تھی۔ ابوجہل اس پر نوحہ کرتا ہے۔ خصوصیات اور محاسن اسلام کا ذکر ابوجہل کے نوحہ میں نعت گوئی کا نادر پیرایہ ہے۔

مظہرِ شر سے اقرار خیر کا مشاہدہ کیجئے۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ　　از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

اپنے تصورِ جہالت کے خلاف آواز سے ابوجہل کا دل و دماغ ٹھکانے نہیں اس لئے سارا معاملہ سحر ہی سحر نظر آتا ہے۔

ساحر و اندر کلامش ساحری　　این دو حرف لا الٰہ خود کافری

حالات سے پریشان ہو کر کائنات کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے۔

پاش پاش از ضربتش لات و منات　　انتقام از وے بگیر اے کائنات

اس کا خیال ہے کہ حقیقت میں غائبہ وابستگی خطا ہے جو چیز چشم محسوس سے اوجھل ہے وہ معدوم ہے۔

دیدہ بر غائب فرو بستن خطا است　　آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا است

اسلام نے ملک و نسب، فضل و شرف خاندانی کی پرستش پر پانی پھیر دیا ایک ممتاز قریشی کے ہاتھوں قبائلی اور نسلی بت کی شکست اس کے لیے حیرت انگیز ہے۔

مذہب او قاطع ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضلِ عرب

اسلام نے آقا و غلام زنگ و ملک کا امتیاز مٹا دیا، مساوات کے خلاف عادت عمل اور اس کے احساں تکبر پر ایک کاری ضرب ہے۔

در نگاہ او یکے بالا و پست　　با غلام خویش بر یک خواں نشست

حضرت اقبالؒ کا جس قدر کلام نعت میں ہے وہ اس قدر بلند وسیع اور کثیر ہے کہ ایک ہی صحبت میں سب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

(۱۹۳۸ء)

ظفر قریشی دہلوی

شاعرِ اسلام

ہندوستان وہ ملک ہے جہاں مردوں کی پرستش ہوتی ہے۔ ہم اپنے آدمیوں کی قدر اس وقت کرتے ہیں۔ جب وہ آنکھ سے اوجھل ہو کر لحد کے گوشے میں جا سوتے ہیں۔ مگر میں اپنی ناتواں آواز بلند کرتا ہوں۔ کہ اقبال مشرق کا پیام بر اقبال اسلام کا شاعر اقبال، دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

ٹینی سن وہ ملکی عصبیت کا علمبردار انگیز کے دل میں انگلیسی جذبے کی لہر پیدا کرتا ہے۔ اور وہ انگلینڈ کا شاعر ہے.....

براؤننگ وہ آرٹ کا سچا ترجمان، شعر کی دلہن کو حسن کی ان اداؤں سے رنگین کرتا ہے۔ جن کی پرستش زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ اور وہ سخن کی محفل میں آرٹ کا صحیح نمائندہ ہے....

ورڈسورتھ وہ نیچر کا شیدائی، فطرت کی زبان میں اپنے القائے تصور کے بھید کھولتا ہے اور وہ ان فضاؤں کا سب سے زیادہ رنگین طائر ہے......

کیٹس حسن کی تعریف میں حسین نغمے گانے والا کیٹس، خیال کے پردے پر حسن کی وہ جمال آگین تصویریں اتارتا ہے۔ جن کی آب و تاب سے خاکی سینے میں دھک دھک کرنے والے دل کی گہرائیاں منور جاتی ہیں۔ وہ سچا حسن پرست ہے۔

بائرن وہ بائرن جس کے جام دل میں حوادث کی آتش سیال پڑی ہوئی ملتی ہے، وہ جہانِ شعر کا نپولین اعظم، وہ انقلابات کائنات کے تذکروں سے شعر کی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والا، وہ سچا حریت پسند ہے......

سکاٹ وہ انگلستان کی شجاعتِ کہنہ کا مصور، شولری کی پرہیبت تصویریں دماغ کے صفحے پر مرتسم کر دیتا ہے۔ وہ جنگ وجدل کی دنیاؤں کا سب سے بڑا نظر باز ہے.....

ملٹن پارلیمان کے شیدائیوں پر طعن کرنے والا ملٹن، فردوس کی گمشدگی و بازگشتگی کا داستان گو، اس کی شوکت، اس کا وقار مسلم ہے

شیکسپیئر وہ صاحب نظر، صاحب دل، مزاج میں فرد، سنجیدگی میں مثال، محفلوں کی رنگینیاں اپنی آنکھ کی ڈبیا میں چھپا کر لے آنے والا، بیابانوں کی وحشت اپنے دل کے عمق میں گم کر لینے والا جس کی آنکھ پر عرصۂ جنگ کے صدہا منظر عریاں ہیں۔ جس کے دل میں انسانی کرب کی دھڑکن کا نازک سے نازک احساس موجود ہے۔ شاہوں کی کمزوریوں سے باخبر غریبوں کی قوت سے خبردار، کائنات کا رازدان، مزاج انسان کا نبض شناس۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا کم دانگاہ ہے۔

گیٹے وہ المانوی فلک کا رخشندہ ستارا، اپنے عہد کی حشر آفریں فضا میں فلسفے اور خیال کی شعاعوں سے دل کے کاشانوں کو روشن کرنے والا۔ وہ شیکسپیئر کا ہمعصر، وہ المانیوں میں زندگی کی لہر دوڑا دینے والا۔ وہ مغرب کا اسلامی یورپ کی ظلمتوں میں ایک تابندہ ستارہ ہے۔ جس میں ہمارا عکس ملتا ہے۔

غالب وہ ہندی عظمت کی راجدھانی یعنی جہان آباد کا نغز گو شاعر، محشرستان دل کے ہنگاموں کو نوکِ زبان پر رقصاں کر دینے والا طلسم زارِ حیات کو جنتِ نظر اور زندگی کے راگ کو فردوس گوش بنا دینے والا۔ آہ! اس کی شیریں کہانیاں سمجھتے بھی ہو، کس دور کی ہیں۔ جب ہماری ہزار سالہ عظمت کے لب پر

آخری ہچکی تھی۔ وہ غالب، وہ آرزوؤں کے خون پر دل خون کر لینے والا۔

ٹیگور وہ سکونِ ابدی کا رسیا۔ وحدانیت کے گیت گانے والا، جس کا ترنم دکھ بھری زندگی کے ندیاؤں کو لوری دیتا ہے۔ وہ ویدانت کا پرستار ہے

شلر وہ منتہائے خیال تک پرواز کر جانے والا، وہ جنون کو فرزانگی کہنے والا، اس کا شمار ہمیشہ وسعت دل رکھنے والوں میں ہوگا۔

ڈانٹے حسن کی پرستش پر مرمٹنے والا ڈانٹے، وہ تصور کی جلو میں آسمانوں کی سیر کرنے والا۔ وہ جس کے جذبۂ عشق نے ایک گمنام عورت کو زندۂ جاوید بنا ڈالا۔ اس کا تصور بےشک، قابل عظمت ہے۔

ہومر جہانِ شعر کا باوا آدم، فردوس خیال کا پہلا مکین، وہ محاربے کی تصویر کھینچ کر دلوں میں زلزلے ڈال دیتا ہے۔

رومی وہ تعریف سے ماوراصوفی، حافظ و خیام وہ مئے ناب کے پرستار، نظامی و فردوسی وہ بزم و رزم کے یکتا ناز، سعدی، وہ ایران کا شیخ .... اور ایران کو اپنے فرزندوں پر فخر ہے۔

مگر اسلام ...... اے دوستو...... اسلام۔ بیک وقت قوم، وطن، آرٹ، فلسفہ، فطرت، حسن، شجاعت، انقلاب، حریت، تصوف، سب کچھ ہے۔ اور ان سب سے بھی فزوں تر......

اقبال اسی اسلام کا شاعر ہے...... اسلام ہر شاعری سے بلند ہے .....

اور اسی لیے.....

اقبال دنیا کے سب شاعروں سے بلند۔

پائندہ باد اقبال! زندہ باد اقبال!!

اے اسلام کے شاعر!

(۶۱۹۳۸)

بچوں کا اقبال

و— ح۔ انصاری "اقبال نے بچوں کے لیے کیا لکھا؟"
و— محمد عبدالسلام ذکیؔ۔ "حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی۔"

ح۔ انصاری

اقبال نے بچوں کے لیے کیا لکھا؟

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

بچوں کا پہلا شاعر:۔ اردو ادب کے سرمایہ پر جب کبھی بھی نظر ڈالی جائے تو ہر ایک شخص اسے بری طرح محسوس کرے گا۔ کہ اردو کے شاعروں نے بچوں کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ جن لوگوں نے بچپن گزر جانے کے بعد شاعری کی تو انہوں نے ماضی کی طرف نگاہ ہی نہ ڈالی اور جن رنگین مزاج طبیعتوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی۔ تو انہوں نے نہ صرف اپنے ہم عمروں کی ترجمانی اور اصلاح کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ اپنے بڑوں کی تقلید میں خود بھی بلبل و صیاد۔ فراق و وصال۔ آہ و فغاں۔ عشق و وفا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر ایسے گم ہو گئے کہ ادھر سے نکلنے کا نام تک نہ لیا یا اگر نکلنے کی کوشش بھی کی تو راہ نہ ملنے کی وجہ سے اور بھی بھٹک گئے۔

انیسویں صدی تک یہی حالت رہی لیکن جب حالی نے شعرائے اردو کو نظم لکھنے کی دعوت دی اور جب خود بھی مسدس لکھ کر ایک مثال قائم کر دی تو اکثروں نے حالی کو سرے سے شاعر ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بعض حالی کی قائم کردہ راہ پر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اقبال بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں۔

اقبال کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا۔ کہ اپنے ملک اور قوم کے بچوں کو

تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے - ان کی رہنمائی کی جائے اور انہیں صحیح راستہ پر لگایا جائے - اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال پہلا شاعر تھا جس کے دل میں یہ احساسات پیدا ہوئے - اور اسی بات پر ہندوستانی بچوں کو ہمیشہ ناز رہے گا -

سلیس اور پُر اثر شاعری :-

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

اقبال کا دماغ بچپن ہی سے شاعرانہ واقع ہوا تھا - شاعرانہ دماغ کا ساتھ زبان نے دیا - اور ان دونوں کے ملاپ نے دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دکھایا کہ اقبال کا کلام موزوں الفاظ کا ایک بے معنی مجموعہ نہیں بلکہ واقعات کا مرقع ہے جسے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے -

اقبال کے اس کلام پر نظر ڈالی جائے جس میں انہوں نے بچوں کے متعلق لکھا ہے - تو یہ بات بہت ہی واضح طور پر نظر آئے گی کہ ان کا کلام تصنع - تکلفات اور استعاروں سے پاک ہے - جس کی وجہ سے بچوں کے حلقوں میں اقبال کا کلام حد درجہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے - مگر اس مقبولیت میں سلاست اور دلچسپ طرز بیان کو بھی کافی دخل ہے - اقبال کے ہر شعر میں متانت اور شگفتہ بیانی کافی واضح طور پر پائی جاتی ہے - اقبال ایسی خوبیوں کے مالک تھے جو کسی گزرے ہوئے اور موجودہ شاعر میں نظر نہیں آتیں ان ہی اوصاف کا نتیجہ ہے کہ بچے اقبال کے کلام کو شوق سے پڑھتے ہیں اور اس پر خوشی سے عمل کرتے ہیں - اکثر دیکھا گیا ہے - کہ بچے اقبال کے ناصحانہ کلام کو بھی اس شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں گویا وہ کوئی دلچسپ کہانی پڑھ رہے ہیں - یہ اقبال کا انوکھا انداز بیان ہے -

مبتلائے درد ہو کوئی عضو روتی ہے آنکھ کسقدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دراصل نصائح بیان کرنے کے لئے بھی ایک خاص اندازِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اتنا دلکش ہو کہ پڑھنے والے کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلے۔ اور اتنا دلچسپ ہو کر پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کوئی نصیحت پڑھ رہا ہے۔ اقبال کے کلام میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے

اس کے علاوہ جب کبھی وہ قصہ بیان کرتے ہیں تو اس کے آخر میں کوئی نصیحت نہیں نکالتے۔ بلکہ قصہ خود اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا نہایت ہی آسانی سے نصیحت حاصل کرلیتا ہے۔ مثلاً:

دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے
اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

ایک دوسری جگہ انہوں نے فلسفہ مساوات نہایت ہی آسانی سے حل کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اسکی حکمت ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

مساوات کے فلسفے کو بیان کرنے کے بعد وہ ہمدردی کے متعلق لکھتے ہیں۔ ؎

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اتحاد کے متعلق بھی آپ کے جواہر ریزے ساری دنیا کے زرِ حرف

بچوں کو بلکہ بڑوں کو بھی سبق دینے کے لئے کافی ہیں ؂

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؂

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں بس ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیام بزم ہستی ہے انہیں سے
ظہور اوج و پستی ہے انہیں سے
ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

اقبال مذاق مذاق میں بڑے کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ ؂

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

بچوں کا قومی شاعر:۔

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

اس میں شک نہیں کہ اقبال جہاں بچوں کے مصلح تھے وہ ان کے ایک قومی شاعر بھی تھے۔ ان کی یہی خواہش تھی کہ بچوں کے دماغ سے بھوت پریوں کے خیالات نکال کر قومی خیالات بھر دیئے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" لکھا۔ جس میں انہوں نے ہندوستان کی عظمت کی کہانی سنائی ہے۔ وہ وطن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندوستان کی عظمت دکھانے کے بعد وہ ہندوستان کی موجودہ حالت کی تصویر کھینچ کر ہندوستانی بچوں کو عبرت دلاتے ہیں ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں سے

بچوں کا مصورِ جذبات و ترجمان :۔ ؎

نکلی تو لب اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی۔ دل محفل کا تڑپا بھی گئی

اقبال نے بچوں پر لکھنا ہی اس غرض سے شروع کیا تھا۔ کہ انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے۔ اقبال نے بچوں کی صحیح ترجمانی کی ہے ہندوستانی بچوں کو مشکور ہونا چاہیئے کہ اقبال نے ان کے لیے بھی وقت

نکالا۔ شیر خوار بچے کے متعلق لکھتے ہیں ؎

زندگانی ہے تری آزاد قید امتیاز
تری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

آگے چل کر اقبال طفلِ شیر خوار کا درجہ کتنا بڑھا دیتا ہے ؎

تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفلِ ناداں میں بھی ہوں

ایک جگہ ایک بچہ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

اگر فلسفہ والوں کو اس بات پر ناز ہے کہ اقبال ایک زبردست فلسفی تھا۔ اگر قانون والوں کو اس پر ناز ہے۔ کہ اقبال ایک قابل قانون دان تھا اگر قوم پرستوں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک قوم پرست تھا۔ اگر شاعروں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا۔ تو بچوں کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ اقبال ان کا پہلا ترجمان۔ پہلا ناصح اور پہلا شاعر تھا۔ اقبال اگرچہ گذر گیا۔ مگر اس نے ہمارے لئے اپنا وہ غیر فانی کلام چھوڑا جو ہمارے لئے ہوا سے زیادہ ضروری اور غذا سے زیادہ مفید ہے۔

۱۹۳۸ء

محمد عبدالسلام ذکی

حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی؟

پیارے بچو! تم نے حضرت اقبال کا نام سنا ہو گا۔ ان کی کوئی نہ کوئی نظم کہیں نہ کہیں پڑھی یا سنی ہو گی۔ آپ ہندوستان کے سب سے بڑے قومی شاعر تھے۔ آپ نے سوتوں کو جگایا۔ اور ان میں زندگی کی روح پھونکی آپ کی شہرت مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ بے رحم موت نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ اگرچہ آپ ہم سے جدا ہو چکے مگر آپ کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور زندگی کے جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتا رہے گا۔ آج ہم تمہیں یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت اقبال کے کلام کا زیادہ حصہ جوانوں اور بڈھوں کے لئے ہے۔ مگر آپ نے بچوں کی بھی کافی خدمت کی ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن تھا۔ کہ آپ اپنی قوم کی اٹھتی ہوئی پود کو بھول جاتے۔ یوں تو ہندوستان کے دوسرے بڑے شاعروں نظیر اکبرآبادی حالی پانی پتی۔ آزاد دہلوی اور ذہین حیدرآبادی نے بھی بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں۔ مگر حضرت اقبال کی بچوں کی لکھی ہوئی نظمیں خاص ہیں۔ اس کے سوا حضرت اقبال نے بچوں کے لئے نظمیں لکھ کر ہندوستان کے شاعروں کو دکھا دیا ہے۔ کہ بچوں کے لئے کس قسم کی نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ بچوں کے لئے کچھ لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ وہی لوگ بچوں کے لئے کچھ لکھ سکتے ہیں۔ جو بچوں کی فطرت کو جانتے ہوں۔ اور جن کی مشق پکی ہو۔

حضرت اقبال نے بچوں کے لئے یہ نظمیں لکھی ہیں ۔ (۱) بچے کی دعا۔ (۲) ہمدردی ۔ (۳) ماں کا خواب ۔ (۴) پرندے کی فریاد ۔ (۵) ایک مکڑا اور مکھی ۔ (۶) ایک گائے اور بکری ۔ (۷) ایک پہاڑ اور گلہری ۔ (۸) ہندوستان ہمارا (۹) میرا وطن وہی ہے ۔ ان نظموں میں صرف پہلی نظم دعا کے طور پر لکھی ہے کچھ نظمیں عام رنگ میں اور اکثر نظمیں قصے کے پیرائے میں کہی ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے ۔ کہ بچوں کو قصوں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اور مثال کے بعد نتیجہ نکال لینے میں آسانی معلوم ہوتی ہے ۔ جو شاعر قدرت کا یہ راز نہیں جانتے ۔ وہ نتیجہ پہلے بیان کرتے ہیں ۔ اس کے بعد مثال پیش کرتے ہیں ۔

پیارے بچو ہم تمہیں سب سے پہلے بچے کی دعا سناتے ہیں ۔ اس نظم میں ایک بچہ خدا سے دعا کرتا ہے ۔ کہ وہ علم کی شمع کا پروانہ بن جائے ۔ اس دھن میں وہ شمع کی مانند پگھلے دنیا کی جہالت کا اندھیرا اس کے ذریعہ دور ہو کر ہر طرف علم کی روشنی پھیل جائے ۔ وہ اپنے وطن کے لئے رونق ہو ۔ اس کی زندگی کا مقصد غریبوں ، کمزوروں اور دکھیوں کی مدد کرنا ہو ۔ خدا اسے برائی سے بچائے اور نیک راہ پر چلائے ۔ بے شک یہ نظم رات دن وظیفے کے طور پر پڑھنے کے قابل ہے ۔ اس لئے آج ہی تم اسے زبانی یاد کر لو ۔ اصل نظم یہ ہے :۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھکو

پیارے بچو! نظم کیے ہوئے قصے نثر یعنی عام بول چال میں لکھے ہوئے قصوں سے زیادہ اثر رکھتے ہیں - اس لئے حضرت اقبال نے چند قصے نظم بھی کیے ہیں - یہ نظم کئے ہوئے قصے بہت دلچسپ اور نصیحت سے بھرے ہوئے ہیں - زبان میٹھی اور بہت آسان ہے - بیان کا طرز سیدھا سادہ قصے کے جوڑوں کو ملا کر موتی کی لڑی بنا دی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آنکھوں دیکھی بات لکھی ہے - بیان کی طاقت سے لفظی تصویریں بنا دی ہیں دوسرے لفظوں میں یہ نظمیں بولتی چالتی تصویریں ہیں - چنانچہ مثال کے طور پر ایک دو قصے بیان کئے جاتے ہیں - پہلے ایک مکڑے اور مکھی کی کہانی سن لو - کہتے ہیں کہ ایک مکڑا کئی دن سے بھوکا تھا - ایک دن جب کہ وہ اپنے جالے میں بیٹھا ہوا تھا - ادھر سے ایک مکھی کا گزر ہوا - مکڑے نے مکھی کو اپنے چھوٹے سے کمرے میں آنے کی دعوت دی - مکھی نے جواب دیا جو کوئی تمہارے گھر میں قدم رکھتا ہے - پھر وہ باہر نکلنے نہیں پاتا - میں نادان نہیں - جو تمہارے دھوکے میں آؤں - مکڑے نے جواب دیا - میرا کمرہ اگرچہ باہر سے چھوٹا سا نظر آتا ہے - مگر اس کا اندرونی حصہ بہت سجا سجایا ہے - دیواروں پر آئینے لگے ہوئے ہیں - دروازوں پر پردے پڑے ہیں - مہمانوں کے آرام کے لئے بستر بچھائے ہیں اور آرام کے دوسرے سامان بھی مہیا کئے ہیں - ایسی آرام کی چیزیں تمہیں دوسری جگہ نہ ملیں گی

مکھی نے کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ مگر میں آپ کے گھر نہ آئی ہوں نہ آؤں گی۔ کیونکہ جو کوئی آپ کے نرم بستر پر سو رہتا ہے۔ وہ پھر کبھی نہیں جاگتا جب مکڑے نے دیکھا کہ لالچ دینے سے کام نہیں بنتا ہے۔ تو اس نے خوشامد کرنی شروع کی۔ کیونکہ دنیا میں خوشامد ہی سے کام بنتے ہیں۔ اس لئے اس نے کہا "جو کوئی آپ کی صورت ایک بار دیکھ لیتا ہے۔ اس کو آپ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی آنکھیں ہیروں کی کنیوں کی طرح جگمگاتی ہیں۔ سر پہ کلغی ہے۔ پھر آپ کا حسن، لباس، خوبی اور صفائی تو بہت ہی اچھی ہے۔ اور سب سے زیادہ آپ کا اڑتے ہوئے گانا سب کو بھاتا ہے"۔ مکڑے کی ان چکنی چپڑی باتوں نے مکھی کا دل موہ لیا۔ وہ پسیجی اور بولی، انکار کرنا اور کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں۔ یہ کہہ کر مکڑے کے قریب گئی۔ مکڑے نے کود کر اسے پکڑ لیا۔ اور بے فکری سے گھر بیٹھے ہوئے اسے چٹ کر گیا۔

اس قصے کا حاصل (MORAL) یہ ہے۔ کہ انسان کو چاہیئے کہ غرض والوں کی خوشامد پر نہ پسیجے۔

اب گائے اور بکری کا قصہ سنو۔ ایک ہری بھری چراگاہ تھی جس میں ہر طرف صاف پانی کی ندیاں بہتی تھیں۔ انار اور پیپل کے کئی ایک سایہ دار درخت تھے۔ چڑیوں کا چہچہانہ۔ ٹھنڈی ہوا کا چلنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں ایک بکری آنکلی۔ اس کی نظر ایک گائے پر پڑی۔ بکری نے گائے کو سلام کر کے کہا "بڑی بی! مزاج کیسے ہیں"؟ گائے بولی مصیبت میں جان ہے بری بھلی زندگی گزار رہی ہوں۔ میری قسمت ہی بری ہے۔ انسان سے کام پڑا ہے۔ اس لئے نت نئی چالوں سے مجھے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اگرچہ میں اسے دودھ پلاتی ہوں۔ اس کے بچوں کو پالتی ہوں۔ مگر جب کبھی دودھ کم دیتی ہوں۔ تو وہ میری شکایت کرتا ہے۔ اور جب دبلی ہو جاتی ہوں تو بیچ کھاتا ہے۔ اس طرح نیکی کے بدلے بدی سے پیش آتا ہے"۔ بکری نے گائے

کی رام کہانی کو سن کر کہا:" مجھے معاف کیجئے میں کھری کھری سناتی ہوں کہیں آپ بے مزہ نہ ہو جائیں۔ خدا لگتی بات کڑوی لگتی ہے۔ آپ کو یہ چراگاہ، لہلہاتی گھاس، سایہ دار درخت، خوشیاں، بے فکریاں اور آرام سب کچھ انسان کا دیا ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں جنگلوں میں دشمن کا ہر وقت خوف لگا رہتا ہے۔ اس لئے ہمیں گلہ نہ کرنا چاہیئے اور آرام کی قدر کرنی چاہیئے"۔ یہ جواب سن کر گائے شرما کر بولی"۔ بی بکری! اگرچہ تم چھوٹی ہو۔ مگر تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں"۔ اس کہانی کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہیئے۔ کہ وہ احسان کی قدر کرے۔

پیارے بچو! تم نے ابھی ابھی جو دو قصے پڑھے ان میں اشعار کو بول چال میں ادا کیا گیا تھا۔ اب ایک نظم کی ہوئی کہانی حضرت اقبال کی زبانی پڑھ لو۔ کہانی کا عنوان ہے" ہمدردی"

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا! بلبل تھا اک اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کے بلبل کی آہ وزاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھ کو دیا بنایا!
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

پیارے بچو! تم نے حضرت اقبال کی ان نظموں کا حال پڑھ لیا۔ جو انہوں نے تمہارے لئے لکھی ہیں۔ ان میں شہد کی مٹھاس، پھول کا بانکپن، دھنک کی رنگینی، چاند کی خوبصورتی، اور دریا کی روانی موجود ہے۔ ان کے پڑھنے سے طبیعت میں تازگی، اور دل کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دماغ

سے سوچنے اور ہاتھ پاؤں کو کام میں لگا رکھنے کی عادات پیدا ہوتی ہیں
یہ نظمیں وقت کو بے کار نہ کھونے، وطن دوست بننے اپنے پرائے سے
محبت اور ہمدردی کرنے، برائی سے بچنے، نیک راستے پر چلنے، خوشامد
سے بچنے، احسان ماننے اور شریفانہ عادتیں ڈالنے کی دعوت دیتی ہیں۔
امید ہے کہ تم ان نظموں کا شوق سے مطالعہ کرتے رہو گے۔

۱۹۳۸ء

فلسفیانہ مباحث

و — م۔م جوہر میرٹھی "علامہ اقبال کا فلسفہ"
و — محمد عبدالقیوم خاں باقی "علامہ اقبال کا فلسفہ"
و — م۔م جوہر میرٹھی "علامہ اقبال کا فلسفہ"
و — سید الطاف حسین "ترجمانِ حقیقت"
و — میاں ارشد محمود "ترجمانِ حقیقت"

م۔م۔ جوہر میرٹھی

علامہ اقبال کا فلسفہ

اختر : آداب عرض یوسف صاحب! کیا مطالعہ ہو رہا ہے؟

یوسف۔ آیئے اختر صاحب! علامہ اقبال کے لیکچر کتابی شکل میں نکل آئے ہیں انھیں دیکھ رہا ہوں۔

اختر۔ خوب کیا کچھ ادق کتاب ہے۔ پہلا باب کس موضوع پہ ہے۔

یوسف۔ وہی موضوع جس سے مرحوم کی شاعری پہ ہے

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　　خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　　چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اختر۔ جی ہاں۔ یہ امام غزالی کا فلسفہ ہے۔ ضرب کلیم میں علامہ نے امام صاحب کا فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن　　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن!　　　عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

یوسف۔ پہلے لکچر کا موضوع بھی یہی ہے کہ کیا حقیقت کو صرف عقل سے سمجھ سکتے ہیں؟ علامہ کا خیال ہے کہ خدا یعنی حقیقت کو عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کا صرف تجربہ کر سکتے ہیں اور وہ تجربہ بھی عقل سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لیے وجدان یعنی عشق یا نظر کی ضرورت ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　　علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات　　　علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

علامہ کے نزدیک خرد سے تو حقیقت کو جزوی طور پہ سمجھا جاتا ہے لیکن دل یا عشق یا نظر سے کل حقیقت کا مجموعی طور پہ احساس یا تجربہ کیا جاتا ہے خرد حقیقت کو سمجھنے کے لیے نامکمل ہے لکھتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علامہ کے نزدیک خرد و نظر ایک ہی شے کے دو رخ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ممد و مددگار ہیں۔ علامہ، برگساں کے اس خیال سے متفق ہیں کہ عشق یا نظر یعنی وجدان بھی اعلیٰ قسم کی خرد ہوتی ہے۔

اختر۔ میں کچھ سمجھا نہیں یوسف صاحب!

یوسف۔ آپ کیا نہیں سمجھے۔ برادر یہ وہی خیال ہے جس کا علامہ بار بار اظہار کرتے ہیں۔ بال جبریل میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　　ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں　　　راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

اختر۔ یوسف صاحب! میں خرد اور نظر کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں اگر خرد اور نظر میں وہی فرق ہے جو عقل اور تیز عقل میں ہوتا ہے تو یہ کہدینا کافی ہے کہ حقیقت زیادہ غور و فکر کرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ اس شکل میں حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک نئی شے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے جس کو علامہ نے کبھی دل کبھی عشق کبھی نظر کہا ہے۔ نہ صرف یہی کہ علامہ عشق و نظر کے قائل ہیں بلکہ عقل کو باغی اور کم مایہ خیال کرتے ہیں کبھی فرماتے ہیں۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

کبھی فرماتے ہیں سہ

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

جیسا ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے علامہ کے نزدیک نظر اور خرد کی نوعیت میں فرق ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نظر کو تیز عقل کہنا غلطی ہوگی۔

یوسف:۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نظر سے حقیقت کے اس پہلو کا شعور ہوتا ہے۔ جس کو خرد سے نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ کے نزدیک دل بھی مشاہدہ کرتا ہے اور اگر اس مشاہدہ کی درست ترجمانی کے بعد عمل کیا جائے تو انسان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بزرگان دین کی سوانح کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے مشاہدات اسی طرح حقیقی تجربہ ہوتے ہیں جس طرح خرد کے تجربات۔ البتہ دل کے مشاہدات کو تحلیل کر کے نہیں بتا سکتے سہ

معجزہ اہل فکر فلسفہ پیچ پیچ
معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اختر:۔ کیا علامہ کا یہ خیال ہے کہ تجربہ دو طرح ہوتا ہے ایک دل سے اور دوسرا دماغ سے اور یہ دل ہی ہے جو بیک وقت کل حقیقت کا تجربہ کر سکتا ہے؟

یوسف:۔ علامہ کا یہ خیال ہے کہ دل کی نظر سے حقیقت کو دیکھنے اور تجربہ کرنے سے انسان کو وہ الہامات ہوتے ہیں جن سے خرد بے بہرہ ہے آپ خرد کے ذریعہ سے مجموعی حقیقت کا دیدار نہیں کر سکتے لیکن دل بسا اوقات دھوکا کھا بھی جاتا ہے اور غیر حقیقت کو حقیقت اور غیر حقیقت کے پیغام کو حقیقت کا پیغام یعنی وحی و الہام سمجھنے لگتا ہے ہاں بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دل حقیقت کے پیغام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا اور اس وجہ سے غلط راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دماغ صرف جزوی حقیقت معلوم کر سکتا ہے اور جزوی اور مجموعی حقیقت میں وہی فرق ہے جو باجے کے ایک سر اور ایک راگ میں ہوتا ہے۔ راگ اگرچہ سروں کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن وہ اثر اور نوعیت میں کسی ایک سر سے مختلف ہوتا ہے بعینہ مجموعی حقیقت جزوی حقیقت سے اثر اور نوعیت میں جدا ہوتی ہے۔

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اختر :- اس کے یہ معنی ہوئے کہ درست علم حاصل کرنے کے لیے عشق پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

یوسف :- جی ہاں۔ علامہ نے یہ لکھا ہے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے لیے بھی شیطان کی پیش کردہ حقیقت اور پیغام، اور اصل حقیقت اور پیغام میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ علامہ نے اس خیال کی تائید میں کلام مجید کی ایک آیت بھی پیش کی ہے۔

ترجمہ :- "تم سے قبل بھی ہم نے رسول اور پیغمبر بھیجے جن کی خواہشات میں شیطان نے غلط خواہش داخل کر دی لیکن خدا شیطان کے چاہنے کو پورا نہیں ہونے دے گا۔"

بال جبریل میں سالک راہ کو اس طرح خبردار کرتے ہیں ؎

سالک راہ ہوشیار سخت ہے یہ مرحلہ　　　دل ہو غلام خرد یا کہ امام خرد

اختر :- تب تو یوسف صاحب اول بینا بھی خرد چالاک کی طرح ہو گیا غلطی کا امکان دونوں جگہ ہے خرد بھی غلطی کر سکتی ہے اور نظر بھی۔

یوسف :- نظر بھی غلطی کر سکتی ہے لیکن خرد تو صرف جزوی حقیقت دیکھ سکتی ہے، علامہ فرماتے ہیں۔

بیا کہ عشق کمالے زیک فنے دارد　　　نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس

اختر :- لیکن یوسف صاحب یہ تو فرمایئے کہ جب آپ نے دل کا غلطی کرنا تسلیم کر لیا تو یہ معلوم کرنے کا کیا معیار رہا کہ دل کا فلاں مشاہدہ حقیقت کا مشاہدہ تھا یا غیر حقیقت کا۔ پھر علامہ ایک اور بات بھی فرماتے ہیں کہ بعض دل مشاہدات کی درست ترجمانی نہیں کر سکتا۔ اس شکل میں یہ کس طرح فیصلہ ہو گا کہ دل مشاہدہ کی درست ترجمانی کر رہا ہے یا غلط۔

یوسف :- اختر صاحب علامہ نے وہ معیار بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا لکچر ان معیاروں کی بابت ہے علامہ نے دو معیار مقرر کئے ہیں۔ ایک عقلی دوسرا افادی، عقلی معیار سے یہ مراد ہے کہ حقیقت وہ ہے جس کی نوعیت کو عقل قبول کر لے۔ افادی معیار یہ ہے کہ انہیں پیغامات کو حقیقی سمجھنا چاہیئے جن پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے برآمد ہوں۔

اختر:- یوسف صاحب! علامہ نے یہ معیار قائم کر کے اپنے دل بینا کے نظریہ کی تردید کر دی علامہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ سے نہ مجموعی حقیقت کا شعور کر سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغامات سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف بے چاری عقل پر حقیقت اور غیر حقیقت میں تمیز کرنے کا بار ڈالتے ہیں اگر علامہ کے نزدیک عقل میں یہ اہلیت ہے کہ وہ حقیقت اور اس کے پیغامات اور غیر حقیقت اور اس کے پیغامات میں تمیز کر سکے اور ان کو جانچ سکے تو گویا علامہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ عقل چالاک دل بینا سے کہیں زیادہ بیدار ہے کہ وہ دل کی محسوس کردہ حقیقت اور پیغام کو پرکھتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افادی معیار بھی عقلی معیار ہے۔ عقل تو اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ حقیقت کے کسی خاص پیغام پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے نکل رہے ہیں یا برے۔

یوسف:- اختر صاحب آپ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نظریا دل بھی غلطی کر سکتا ہے تو دل کو دماغ سے الگ علم حاصل کرنے کا ذریعہ مان لینے سے مشکل حل نہیں ہوتی۔

اختر:- یوسف صاحب میرے خیال میں عقل میں ہر حقیقت سمجھنے کی اہلیت ہے۔ صرف فکر و جستجو درکار ہے۔ حقیقت کے جن پہلوؤں کو ہم فی الحال نہ سمجھ سکیں ان کی طرف ہمارا غیر جانبدارانہ رویہ ہونا چاہیئے نہ ان کا انکار اور نہ اقرار کرنا چاہیئے مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ چونکہ کاملین کے بہت سے بنیادی تخیلات عقل میں نہیں آتے لیکن ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لیے ان مفکرین کو جنہوں نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ ضرورت ہوتی ہے کہ مذہبی تخیلات کو درست ثابت کرنے کے لیے عقل کو معذور اور دل کو روشن بتائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیں کہ دل جو علم حاصل کرتا ہے وہ عقل کے احاطے میں نہیں آسکتا۔ علامہ پہلے تو فرماتے ہیں کہ دل ہی حقیقت آشنا ہو سکتا ہے۔ عقل انسانی مجموعی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ دل حقیقت کا تجربہ تو کرتا ہے لیکن بعض مرتبہ اس کو متاشبہ لگ جاتا ہے اور وہ غیر حقیقت کو حقیقت تصور کرنے لگتا ہے۔ یہاں عقل اس کی مدد کرتی ہے۔ اور تجربہ کی صحت اور غیر صحت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب عقل دل کے تجربات کے حقیقی وغیر حقیقی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے تو وہ خود

اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔

یوسف صاحب اگر آپ کو ناگوار نہ گذرے تو یہ عرض کر دوں کہ دلِ بینا کے فلسفہ نے دنیا کو عام طور پر اور ایشیا کو خاص طور پر جتنا نقصان پہنچایا ہے شاید ہی کسی دوسرے فلسفہ نے پہنچایا ہو۔ دل کو عقل پر ترجیح دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق نے عقل کو معطل قرار دے دیا۔ جس کی وجہ سے فکری اضمحلال پیدا ہو گیا اور بجائے زندگی میں جدوجہد کرنے اور عقل سے کام لے کر قدرت کی طاقتوں پر قابو پانے اور ان کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے استعمال کرنے کے ایشیا والے مراقبہ، تصوف اور علم باطن کے پیچھے پڑ گئے جس کے نتائج ہماری غلامی کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

یوسف: لیکن اختر صاحب علامہ کے فلسفہ میں عقل کے لیے بھی کافی میدان ہے۔ عقلی جدوجہد کو کسی نے منع نہیں کیا بلکہ اس سے بھی جزوی حقیقت کا علم ہوتا ہے جس قسم کے تصوف کے آپ خلاف ہیں علامہ بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ علامہ کے نزدیک وہ مراقبہ تصوف اور علم باطن باطل ہے جس سے عمل پیدا نہ ہو۔ شاعر مشرق کے نزدیک مراقبہ وغیرہ سے انسان میں جرأت عمل پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ریاضت بیکار ہے۔ اختر صاحب جہاں تک میں سمجھتا ہوں علامہ نے خرد و عشق میں تمیز صرف اس بنا پر کی ہے کہ خرد انسان کو عمل پر مجبور نہیں کرتی۔ اکثر صاحب کے دماغ بے عمل ہوتے ہیں یہ عشق کا کام ہے کہ وہ انسان کو عمل پر مجبور کرتا ہے۔

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

علامہ ضرب کلیم میں تصوف کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کے درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی اقبال کی اصطلاح میں انفرادیت کا نام ہے جو انسان کے اپنے ماحول پر عمل کرنے سے مستحکم ہوتی ہے۔ توحید کے عنوان سے علامہ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو — خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ — وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

خرد اگر عمل بھی پیدا کرتی ہے تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف خرد کے تابع ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہے اگر عشق کے تابع ہو کر عمل کیا جائے تو اس سے بہت اچھے نتیجے برآمد ہوں۔ خرد کو عشق کے تابع رکھ کر عمل کرنا چاہیئے۔

اختر: حسن اتفاق سے ایسی دنیا میں یورپ اور امریکہ موجود ہیں جہاں کے انسان بلا "دل و عشق" کی مدد کے صاحب عمل ہیں دل نہیں بلکہ خرد ان کے تمام تر عمل کے محرک ہے۔ ان کی خرد نے آپ کی دل کی دنیا کی تحلیل کر کے رکھ دی۔ اس حقیقت کے سامنے آپ کا دل کا فلسفہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ دل بینا کا فلسفہ اپاہج کا فلسفہ ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ جب یہ مان لیا کہ کل حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے کا طریقہ عقل سے جدا ہوتے اور انسان کا مقصد حیات حقیقت کا مجموعی دیدار ہے جس سے زندہ و پائندہ علم حاصل ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کل حقیقت کا دیدار اور زندہ و پائندہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور حقیقت کا دیدار ایک دو روز کے مراقبہ سے تو ہو نہیں ہو سکتا اس کے لیے عمر درکار ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان تمام عمر ریاضت اور مراقبے میں گزار دے۔ یوسف صاحب! ایشیا کی غلامی اسی عشق و نظر کے فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ یورپ کی زندگی اور ترقی سے متاثر ہو کر اقبال اس پر تو مجبور ہو گئے کہ ذوقِ کردار کا پیام دیں۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے عشق و نظر کا نظریہ پیش کر کے ایسا کیا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ کر اس کو عمل کی تلقین کیجائے مسلمانوں میں عشق و نظر کا انیونی فلسفہ اتنا سرایت کر گیا ہے کہ اب ان کو انیونی فلسفہ کی خوشبو بھی پینک میں لانے کے لیے کافی ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ ہی کی ہستی تھی کہ جس نے وقتی تقاضہ کو سمجھا اور اردو شاعری کو نیا رنگ دیا اور گل و بلبل اور خط و خال سے ہٹ کر عمل کا پیام دیا۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ علامہ نے دل کی دنیا کا راگ الاپ کر اپنے پیام کو کالعدم کر دیا۔

یوسف: اختر صاحب یہ تو آپ درست فرماتے ہیں کہ باطن کی کشاد اور مراقبے

کے ذریعے سے حقیقت کی جستجو کی آڑ لے کر ایشیا اپاہج بن گیا۔ مشرق من کی دنیا میں پھنس گیا اور تن کی دنیا سے اتنا بے نیاز ہوا کہ ایک عرصہ سے یورپ کا غلام ہے لیکن اختر صاحب جیسا میں عرض کر چکا ہوں علامہ اس قسم کے تصوف سے بہت بیزار ہیں اور اس کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں :۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

اختر :۔ یوسف صاحب یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ میں کردار پر از حد زور دیا گیا ہے لیکن علامہ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ خرد کے علاوہ عشق و نظر کو مانتے ہیں اور ان کو جوش کردار پیدا کرنے کا سبب بتاتے ہیں۔ عشق و نظر کے فلسفہ پر کسی تمدن کی بنیاد رکھ کر افراد کو کردار کا پیام دینا ایسا ہے جیسے پیاسے آدمی کا گلا دبا کر اس کو پانی پلانے کی کوشش کرنا۔ یورپ اس فلسفہ کی مجسم تردید ہے یوسف صاحب میں تو ایشیا کے زوال کا یہی سبب سمجھتا ہوں کہ ایشیا والوں نے فکر و جستجو سے کنارہ کر لیا اور عقل سے بیگانہ ہو کر اپنے آپ کو معجزات کے سمندر میں ڈال دیا جہاں توہمات کی مچھلیوں نے انہیں ہڑپ کر لیا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ایشیا کو صاحب جذب و سوز و مستی کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ صاحب عقل کی ہے جو جستجو و تجربہ سے کام لے کر حقیقت کو پہچانے۔

علامہ اگرچہ دنیا کو پیام عمل دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تلقین بھی جاری ہے۔

من کی دنیا من کی دنیا سوز مستی جذب و شوق
تن کی دنیا، تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

ایشیا والوں کی ساری عمر من کی دولت حاصل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اور تن کی دولت اغیار کے حصہ میں آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ تن کی دنیا میں آلودہ رہنے والے من کی دنیا

میں غرق رہنے والوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

یوسف صاحب آپ کو یہ تو علم ہوگا کہ علامہ رہبانیت اور خانقاہی کے بہت خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر   کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

علامہ ہر بات میں کچھ مذبذب معلوم ہوتے ہیں۔

یوسف:۔ اختر صاحب۔ دراصل ایشیا والوں کی تباہی اس لیے ہوئی کہ مولانا روم نے من کی دنیا میں رہنے والوں اور دل بینا کے دعویداروں کے لیے جو کسوٹی بتائی تھی جس کے علامہ بھی قائل ہیں۔ اس کسوٹی کو ہم نے فراموش کر دیا ہے۔

اختر:۔ وہ کسوٹی کیا ہے؟

یوسف:۔ آں کہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

مولانا فرماتے ہیں کہ جو افلاک پر چل سکتا ہے اس کے لیے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے جب ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں شخص واقعی بزرگ یعنی حقیقت آشنا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ باطن کی تلاش کا اسی کو حق ہے جو ظاہر کو اپنے تابع کر چکا ہو۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے   بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

ایشیا میں اب تک یہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ جب دنیا کے طمانچے نہ سہہ سکے تو تارک الدنیا ہو کر مراقبہ کرنے لگے جو تن کی دنیا پر قابو نہ پا سکا وہ من کی دنیا میں کیا کر سکتا ہے مجھے علامہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں   بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور   کہ معرکے ہیں شریعت کے دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی   اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اختر:۔ خیر آپ نے یہ تو مانا کہ پہلی حقیقت تن کی دنیا ہے اور من کی دنیا میں داخل ہونے

کے لیے مادی دنیا کو مسخر کرنا ضروری ہے معاف کیجئے گا۔ میں من کی دنیا کے فلسفہ ہی کو ایشیا کی تباہ حالی کا باعث خیال کرتا ہوں۔ یورپ والے بلا جذب و شوق و عشق و مستی اور من کی دنیا کے پیچھے پڑے ہر اعتبار سے ہم سے بہت بہتر ہیں۔

یوسف: اختر صاحب یورپ میں جو کشت و خون ہو رہا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یورپ کی نظر صرف تن کی دنیا تک محدود ہے۔

شرق حق را دید عالم را نہ دید　　غرب در عالم خزید از حق رمید
چشم بر حق باز کردن بندگی است　　خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

اختر: یوسف صاحب۔ یورپ کی نظر تن کی دنیا تک محدود سہی لیکن وہ ایشیا سے تو بہتر ہے جس کی نظر خلا میں دیکھتی ہے۔ مشرق کو ترقی کرنے کے لیے دونوں دنیائیں فتح کرنی ہوں گی لیکن یورپ نے تن کی دنیا فتح کر لی ہے اور علم نفسیات کے ذریعے سے من کی دنیا بھی قریب نصف کے فتح کر لی ہے رہا یورپ کا کشت و خون تو وہ تباہی نہیں ہے۔

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جس طرح بچہ پیدا ہوتے وقت ماں کو درد و کرب برداشت کرنا پڑتا ہے اسی طرح جب "جہان کہن" کے بطن سے "جہان نو" پیدا ہوتا ہے تو تمام دنیا میں تشنج پیدا ہوتا ہے۔ یہ جنگ وہی تشنج ہے جس کو آپ تباہی و بربادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یوسف: عصر حاضر را خرد زنجیر پاست
جان بے تابے کہ من دارم کجاست

اختر: مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں انھیں
پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں انھیں

(۱۹۴۱ء)

محمد عبد القیوم خاں باقیؔ

علامہ اقبال کا فلسفہ

جب کسی شاعر کے فلسفہ یا پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس سے اختلاف اور اتفاق کیا جائے۔ تو ضروری ہے۔ کہ ہم اس انتشار اور پیچیدگی کو دور کر دیں۔ جو اس موضوع میں پائی جاتی ہے۔ یا مشکل موضوع پر سوچتے وقت غور و فکر کرنے والے کے دماغ میں موجود رہتی ہے۔ واضح فکر اور سکون دماغ ادب عالیہ پر تنقید کرنے کے سنگ بنیاد ہیں۔ جو سوچتا نہیں وہ صاف لکھتا نہیں۔

ہم ان تمام الجھنوں سے نکل کر جو مکالمہ میں پیدا کئے گئے ہیں اور ان نقلی گورکھ دھندوں سے دور ہو کر جو اختر اور یوسف کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں مصنف کی اس بحث پر کہ اقبال کا فلسفہ، عقل و دل کیا ہے؟ جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ لکھنے کی ابتدا ہی ایسے اصول سے کی گئی ہے جو شعری تنقید کے لئے زیادہ موزوں نہیں ایسا معلوم ہوا کہ مصنف، شاعر کے کلام کی جراحی اور نثری تحریر سے کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں: تاکہ اس کے پیام کا تعین ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو ادب کی تنقید سے یہ خام طریقہ دور نہ ہو سکا۔

اقبال کے مفکرین عام طور پر تین قسم کی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱:۔ وہ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک ایک سمندر میں کود پڑتے ہیں جس میں کودنے کے بعد باہر نکل

آنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اور انہیں سوائے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی معیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کئے بغیر رائے زنی کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بہ حیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہے اور تجزیہ زیادہ۔ نفسیات۔ ادبی تنقید کے اعلی اصول اور جمالیات۔ جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد منفرق تجزیے یا تقابل پر رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ تجزیہ سے زیادہ ربط (Synthesis) کی ضرورت ہے۔

اس انداز کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور ہو کر بحث کرنے والوں کی ذاتی علمیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہے۔ دوسرے

اقبال کی تشریح و توضیح میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے جتنی کہ شرح کرنے والے کے دماغ میں رہتی ہے۔ قران مجید کی تفسیروں نے جس طرح قرآن کو " آیات بینات " کی حدوں سے نکال کر فقہہ، تصوف اور کلام کی گتھیوں میں الجھا دیا۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ اقبال اور اس کا کلام جو تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہمارے فہم و ادراک، جذبہ اعتراف و قبول اور ہماری شعوری زندگی کے قریب رہنے کی بجائے علمی بحث اور انفرادی منطق میں نہ گم ہو جائے۔

نفس مضمون پر غور کرنے سے قبل حسب ذیل تین امور کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

شاعر اقبال فلسفی نہیں ہے " فلسفی " کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے

جو ابتدا سے مسائل پر ایک خاص نقطۂ خیال، انہماک اور علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا اور آخر وقت تک ان کی تحقیقات رد و قدح کر کے ایک نظام فکر متعین کرتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزین ہوتا ہے۔ شاعر کے حکیمانہ خیالات کو فلسفہ سے متصادم نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے کیونکہ فلسفی ایک ذی شعور انسان، پاسبان عقل، کا محکوم منطق اور معقولیت کا شکار ہوتا ہے اور اس کے برعکس شاعر ایک جذباتی انسان شعور، منطق، ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنانے والا۔ ہاں اگر کلام کی نوعیت اس قسم کی ہو تو بعض شاعروں کے عمیق تصورات کو "حکیمانہ شاعری" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کا کوئی مستقل "نظام فکر" یا معقول اور منطقی محاذ قائم کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کی بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

۲۔ جس طرح شعر کی دنیا "فلسفہ" نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ کوئی منطق یا نظام العمل بھی نہیں ہوتی جسے ہم کانگریس یا مسلم لیگ کے پروگرام کی طرح اپنی زندگی کا ایک راست اور بالارادہ لائحہ عمل بنا سکیں۔ شاعر کسی نصب العین کی جھلک دکھاتا اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ جس کا مقصد عقل کے بندوں کو تشفی بخشنا یا قائل کرنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو دلفریب بنانے کے لئے جذبات اور احساسات سے کھیلتا ہے۔ ممکن ہے اس طریقہ سے عقل بھی بیدار ہو جائے۔

۳۔ اقبال خوش قسمتی سے کہئے یا بدقسمتی سے نثر نویس بھی تھا۔ اس نے چند مقالے لکھے۔ اور تقریریں کیں۔ ہم ان سے اس کی تعلیمات کا اندازہ کر

سکتے ہیں ۔ اور نظریات اور عالمانہ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے ۔ کہ شعری دنیا میں یہ عالمانہ خیالات داخل ہو کر کیا اپنی اصلیت قائم رکھتے ہیں؟ یا کسی دوسرے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟ شاعری کس طرح خیالات میں رنگ آمیزی کرتی اور ان میں کیا وسعت اور اثر پیدا کرتی ہے وہ خود شاعر نہیں جانتا اس لیئے اقبال کے نظریات اور فلسفیانہ عقائد کو معلوم کرنے کے لیئے اس کی تقریروں اور مقالوں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے لیکن ان اصولوں کو شعر کے ذریعہ سمجھنے کے لیئے دنیائے شعر کی "جادوگری" کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے ۔ میں ۲۵ سال سے متواتر اقبال کے کلام سے وابستہ رہا ہوں ۔ میں نے اس کی پہلی نظم "کوہ ہمالہ" کے بعد سے برابر ان کے ارتقائے خیال کا مطالعہ کیا ہے اور لفظی بحثوں سے ہٹ کر ہمیشہ "شاعر اقبال" میں "انسان اقبال" کو دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ میں جب کبھی اس کے کلام اور فلسفے پر غور کرتا ہوں تو ان کے الفاظ تشبیہات اور استعارات کے بہت پیچھے نفس شعور ادراک اور احساس کی اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں سے خیال کی آفرینش ہوتی ہے ۔ اور وہ خیال اپنی کئی نفسیاتی منزلیں طے کرتا ہوا شعر کے قالب میں اپنی نمود حاصل کرتا ہے غالب نے کہا تھا ۔

بینم از گداز دل ، در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس کے مطابق شعر کے سمجھنے کا میرا اپنا یہ اصول رہا ہے کہ میں شعر کے الفاظ پر (جو عکس خیال ہوتے ہیں، خیال نہیں ہوتے) غور کرنے کے بجائے "گداز دل" کو محسوس کروں اور "رہ بہ ضمیر" حاصل کروں ۔ اس طرح شاعر کو بغیر دیکھے ہوئے اس کی شعری تصویر پہ ناز کرتا ہوں ۔

فاضل مصنف کے مضمون میں جو طریقۂ فکر و استدلال ہے اس سے

مجھے اصولی اختلاف ہے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر مسلسل غور کرنے والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اقبال میں شروع ہی سے دو متضاد قوتیں موجود تھیں۔ ایک عقل کے راستے سے غور و فکر دوسرے دل کے راستے سے مشاہدۂ باطن۔ اقبال کو کچھ دنوں بعد جب ان دونوں قوتوں پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا۔ تو اس نے کہا ؎

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

ان دونوں قوتوں کو اقبال ہمیشہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے رہے۔ وہ ایک طرف "درس حکیمان فرنگ" یعنی فلسفہ۔ دوسری طرف "صحبت صاحب نظراں" یعنی مشرقی تصوف کو اپنی شاعرانہ زندگی کی روح بنائے رہے۔ لیکن یہ دو قوتیں آگ اور پانی کی طرح اس کے دل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں۔ اگر ہم بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک اس کی تصانیف کا مسلسل مطالعہ کریں۔ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعرانہ زندگی اور خیال کی مختلف منزلوں پر یہ دو قوتیں کس طرح متصادم ہوتی رہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا رہا اور ان دونوں کے باہمی تصادم کا مآل کیا ہوا؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس کی جملہ تصانیف میں تین کا مطالعہ ضروری ہے۔ ایک بانگ درا۔ دوسرے پیام مشرق۔ تیسرے جاوید نامہ۔ باقی تصانیف ان تین اہم تصانیف کے درمیانی خلا کو پر کرنے والی ہیں۔ یا وہ کڑیاں ہیں جو خیال کے ان تین ممتاز مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

بانگ درا میں اقبال ایک نوخیز شاعر ہے۔ جو ذوقِ جستجو کا شکار ہے۔ لیکن اس کے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ پیام مشرق میں اس

کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ فکر اقبال کے مکمل شباب اور پختگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے فلک پرواز خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی معنویت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ بمنزلہ عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں، برآمدے اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔

پیام مشرق کی منزل پہ اقبال ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعض سوالات کا جواب ملتا ہے۔ اور بعض کا نہیں لیکن اس کش مکش میں وہ جن مستقل نتیجوں پہ پہنچ جاتا ہے ان میں دو یہ ہیں جو ہمارے موضوع کے لئے مفید ہیں۔

۱۔ یورپ میں عقل کی ترقی ہوئی۔ اور اس نے زندگی کے مادی معیار کو بہت بلند کر دیا۔ حالات زمانہ کے لحاظ سے اقوام کو یہ درجہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ یورپ عقل کی ترقی میں روح، دل قلب اور باطن کی قوت سے دور ہو گیا۔ مشرق ہنوز اس روحانیت کا محافظ اور علمبردار ہے لیکن یہ آگ سینۂ مشرق میں چنگاری بن کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان چنگاریوں کو بھڑکانا اور نئی آگ سلگانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

فلسفۂ عقل و دل کی اصل اور حقیقت سمجھنے کا مقام یہی ہے۔ پیام مشرق کے دور میں یہ ہوا کہ اقبال کی توجہ عقل کی طرف سے زیادہ تر دل کی طرف پلٹ گئی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ مغرب کی مادی ترقی مشرق کی روحانی نجات کا باعث نہیں ہو سکتی یہ درس حکیمان فرنگ" پر "صاحب نظراں" کی خاموش تعلیمات ہر طرح حاوی آتی رہیں چنانچہ

جاوید نامہ کے بعد سے اقبال عقل کی دنیا سے پورے طور پر دل کی دنیا میں داخل ہو گئے اور ایک متفکر درویش کی طرح نعرہ اللہ ہو لگانے لگے۔

کلام اقبال میں "عقل و دل" کی یہ کشمکش بڑی دلچسپ ہے۔ جب وہ ذوق جستجو "بڑھ گیا۔ اور شاعر دورِ تشکیک سے گذر کر دورِ یقین میں آگیا تو اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس منزل پر اس نے اپنا مستقل نظریہ جو قائم کرلیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔

"حقیقت ایک کل ہے۔ جس کے دو پہلو ہیں ایک نظری اور دوسرا روحانی۔ یورپ کی آنکھ حقیقت کے نظری پہلو کو بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کی روح میں صرف مشرق ہی ڈوب سکتا ہے۔ اس لئے عصر حاضر کی بیدار مغز قوموں کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کو عقل اور دل دونوں کی آنکھوں سے دیکھیں۔ جسم اور ساخت پر غور کرنا عقل کا کام ہے اور جو چیز جو قوت روح کی دنیا کی تلاش کرے وہ دل ہے۔ اس دلچسپ مسئلے پر انشاء اللہ بشرط فرصت میں کچھ اور لکھوں گا۔"

ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ اقبال کا ارتقائے ذہنی کس ماحول میں ہوا؟ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ بحیثیت مجموعی اقبال کے پیام کے چار اہم موضوع ہو سکتے ہیں (۱) عشق (۲) عمل (۳) یقین (۴) خودی۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ اقبال کچھ تو اپنے فلسفیانہ مزاج، کچھ محور علم اور کچھ افتاد زمانہ کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ عقل و دل کی دو متضاد قوتوں کو اپنے سینے میں پرورش کرتے رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان دونوں کو ملانے کی بھی کوشش کی۔ چونکہ ان کا خیال تھا جس طرح کہ ابھی واضح کیا گیا کہ موجودہ زمانہ کو عقل و دل دونوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس کشمکش میں انہوں نے دو اہم سوالات کئے۔

۱۔ انسان کی آخری نجات اور انتہائی بلندی کس چیز میں ہے؟

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس سوچ میں رہتا ہوں کہ میری انتہا کیا ہے

۲۔ اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب ان کی فکر و مشاہدہ کی گہرائی نے یہ دیا۔ کہ انسان کی آخری نجات عشق ہے۔ مجھے اس موضوع پر تفصیل سے کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس لئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کا فلسفہ عشق، یا "من کی دنیا" قدیم صوفیوں سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کے حاصل کرنے کے طریقوں میں کچھ اختلاف ہے۔

عشق کی منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے تین راستے متعین کیئے (۱) خودی (۲) یقین (۳) عمل۔

عمل ایک جامع لفظ ہے۔ جو دنیاوی اور روحانی دونوں قسم کے مقاصد پر حاوی ہے۔ عمل کا پیام دینے سے اقبال کی مراد سوئی ہوئی اور کاہل قوم کو جگانا، ترقی پر آمادہ کرنا، اور اسے کام کی قوت دکھانا ہے۔ خواہ وہ سیاست ہو یا صنعت اس پیغام کو انہوں نے طرح طرح سے اکسایا۔ دو ایک مثالیں خود جوہر صاحب کے دیئے ہوئے اشعار سے معلوم کیجئے۔

(۱) لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

(۲) زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط ایک مسئلہ علم کلام

(۳) وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

یقین۔ شعری دنیا میں اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قوم مسلم کچھ تو یورپ کی جدید تہذیب اور علوم کی زد میں آکر حقائق حیات پر اپنا

یقین کھو بیٹھی ہے ۔ جسے تیرہ سو برس پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ جس بات پر یقین ہو گا ۔ اتنی ہی قوت عمل اور احساس پیدا ہو گا ۔ عمل میں جوش پیدا کرنے کے لئے حقائق پر یقین رکھنے کی تلقین ایک ضروری تلقین تھی ۔ جو اس آزاد خیال زمانے میں خاص جرأت اور حکمت کے ساتھ کی گئی ۔ ایسے دور میں جب کہ انسان ہر حقیقت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے ۔ اور علوم کے نظریات کے باہمی تصادم کی وجہ سے اسے حقیقت ایک بے معنی چیز معلوم ہونے لگی ہے ذوق یقین کو اکسانا کمال تھا ۔

خودی :۔ یقین اور عمل کے ساتھ احساسات کی بیداری ضروری تھی۔ اس مقام پر انہوں نے اپنا فلسفہ خودی جس کا تعلق عقل سے ہے ۔ خاص انداز سے پیش کیا ۔ یہی وہ منزل ہے ۔ جہاں اقبال کی تخلیقی قوت اور ایک خاص پیغام کی جھلک نظر آتی ہے ۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح فاضل مصنف نے کہا اقبال اس بیخودی کے مخالف تھے جس کی تعلیم نے مسلمانوں کو سست احساس اور کاہل بنا دیا تھا ۔ اس لئے انہوں نے یہ کہا کہ اب انسان کو اپنی بلندی اپنے مقام اور اپنی روحانی اور عقلی قوتوں کو منفی طریقے کے ساتھ معلوم کرنا چاہیئے۔ خودی ہو یا بے خودی دونوں کا راستہ ایک ہے ۔ دونوں عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں ۔ لیکن حالات زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ "منزل کبریا" کا سفر پوری خود شعوری کے ساتھ کیا جائے ۔ جس طرح مصنف نے سمجھا ۔ اس مقام پر خودی اور عشق ، عقل و دل ، یا تن کی دنیا اور من کی دنیا میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا ۔ اور خودی کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ انسان "یزداں بہ کمند آور" کا جذبہ پیدا کرے ۔ خدا ایک بلند مقام کا نام ہے ۔ اور اس مقام کا حصول اور یہاں تک رسائی کے لئے پہلے مرحلے کی ضرورت ہے ۔ حوصلہ خودی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے ۔ خدا کو پانے دیکھنے

کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو بلند کرے۔ ایک جگہ جمع کرے اور بلند مقام پر آکر خدا کو دیکھے۔ یہ عمل اس کی شایان شان ہے اس طرح خودی نہ صرف عقل کا راستہ بلکہ روح کا راستہ بھی بن جاتی ہے۔ تزکیۂ نفس، ریاضت، ذکر و شغل، مراقبہ سب جائز، لیکن اقبال کے فلسفہ کے مطابق یہ خود انکاری (SELF DENIAL) کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ خودی شعوری (SELF CONSCIOUSNESS) خود ثباتی (SELF ASSERTION) کی روح اور ارادے کے ساتھ۔ ان کا یہ خیال تھا۔ کہ خودی کے شعور اور اس کی بلندی کا ارادہ عام انسانوں کے فائدے کی چیز بن کر دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہوگا۔ اگر یہ آئندہ چل کر بے خودی میں مبدل ہو جائے تو اس کی یہ تبدیلی وقت اور مقام کے شایان شان ہو گی۔ اس خودی کے دو روپ یہ ہیں ؎

(۱) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

"یہ سخر لکم ما فی السمٰوات و ما فی الارض" کی نہایت ذی شعور، حکیمانہ تفسیر ہے جو اس زمانے میں کی جا سکتی ہے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں انہیں
پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں انہیں

جوہر صاحب کے پیش کردہ اس شعر میں خودی کا وہ تصور جو میں نے ابھی بیان کیا عمدگی سے واضح ہوتا ہے "طریق خانقاہی" گو فرسودہ ہو چکا ہے لیکن عشق کے لئے ضروری ہے البتہ اس میں پختہ تر ہونا چاہیئے وہ اس طرح سے کہ ذکر اور فکر دونوں میں انسان محو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے اور فکر کا تعلق عقل سے ہے۔ جیسے اقبال کسی اور جگہ کہتے ہیں ؎

گفت مرگ عقل گفتم ترک فکر
گفت مرگ قلب گفتم ترک ذکر

ان مختصر توضیحات سے معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی آخری منزل عشق ہے جہاں خدا ہاتھ آتا ہے اس تک پہنچنے کے تین راستے ایک خودی (۲) عمل (۳) یقین - انہیں پر زور دینے کے لئے اس نے طرح طرح کی تشبیہیں، استعارے، حکمت اور دوربینی کے نکات اور مثالیں پیدا کیں - افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جو مثالیں دی ہیں وہ بعض مقامات پر برجستہ نہیں ہیں اور نہ ان کا مفہوم صحیح پیش کیا گیا ہے - مثلاً انہوں نے ایک شعر پیش کیا ہے ؎

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ
معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اس شعر کا پہلا مصرعہ ان کے مفید مطلب ہے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے عمل، یقین اور عشق کے متفقہ پیغام پر زور دیا - جس کے مظہر حضرت موسیٰؑ ہیں اور ان کا تعلق فرعون اور طور سے ہے - پیغمبر اقبال کے نزدیک خودی عمل یقین اور عشق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے - فاضل مصنف نے دوسرے مصرعہ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس کا ذکر کیا۔

اسی طرح اقبال نے عمل اور خودی کی قوت کو اکسانے کے لئے "فلسفہ شاہین" کی دلچسپ تشبیہہ پیدا کی - عقل کو غلام - عشق کو امام - علم کو پوست - عشق کو مغز - جنوں کو جو عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے - علم سے زیادہ تیز رو بتایا بہرحال جس موقعے پر جس مسئلے کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہوئی وہاں حسن کمال کے ساتھ اس پر زور دیا گیا مثلاً:

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اس شعر میں عقل اور عشق کی ناتمامی اور بے راہ روی پر افسوس کیا ہے - ؎

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مصنف کے پیش کردہ اس شعر میں جیسا کہ میں نے کہا خودی کو عقل و دل دونوں کے لئے موزوں قرار دیا گیا ہے۔

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند!
آدم بمیرد از بے یقینی

اس شعر میں یقین کی قوت دکھائی گئی ہے۔

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنے دارد

اس میں عقل پر مکمل اعتماد کو باطل قرار دیتے ہوئے عشق کے کمال کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہزار طریقوں سے اقبال نے اپنے پیغام کے ان چار عناصر کو روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارا پیغام کالعدم ہو جاتا۔ اگر ان عناصر میں توافق باہمی کے بجائے تصادم باہمی کیا جاتا یا ایک کو دوسرے کا حریف گردانا جاتا لیکن بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اقبال نے ان کے مدارج اور فوقیت کا ہر منزل پہ خیال رکھا ہے اور جو واسطہ اور رابطہ ایک کو دوسرے سے ہے ان کی ترتیب اور مقام کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے فاضل مصنف اس مقام پہ غور و فکر سے کام لیں تو مناسب ہو۔

آخر میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ

۱۔ اقبال کی کمال شاعری اور اس کی قوت تخلیق اس کے علم سے متاثر ہوئی ایک تو العلم حجاب الاکبر، دوسرے اس کے خیالات میں اسکے مطالعہ اور مشاہدہ کی وجہ سے دوسروں کے خیالات کی اس قدر پرچھائیاں آگئیں کہ اس کے اکثر خیالات کسی نہ کسی گذشتہ بڑی شخصیت خواہ وہ غزالی ہوں یا برگساں کی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ اس

مقام پر یہ کہنا کہ یہ خیال غزالی کا ہے ۔ یہ نظریہ برگسان کا ہے ۔ اس لئے ناموزوں ہے ۔ کہ اقبال نے بالارادہ اپنے خیالات کو اس طرح نظم نہیں کیا کہ وہ ان کے معلوم ہوں یا انہیں مخاطب کیا جائے

(۲) اقبال نے اپنے کلام میں حقائق پیش کرنے کی کوشش کی اور ظاہر ہے کہ حقائق نئے نہیں ہوتے شاعر جن حقائق کو پیش کرتا ہے وہ تو زندگی میں گھلے ملے ہوتے ہیں ۔ بہت ممکن ہے نیوٹن آئن اسٹائن یا اڈیسن دنیائے سائنس میں نئے انکشافات کریں لیکن زندگی اور جذبات کی دنیا میں حقیقت جانی پہچانی ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ اقبال کی ،،من کی دنیا،، کوئی نئی چیز نہیں ۔ خود کوئی نئی بات نہیں ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتی ہے ؟ اس لئے اس مفروضہ یا تصور ما قبل کے ساتھ کہ اقبال ایک فلسفی تھا ۔ نئی چیزیں پیش کرتا تھا ۔ انتہائی اور یجنل شاعر تھا ۔ معلم تھا ۔ اس کے کلام کا مطالعہ کرنا خواہ مخواہ غیر ضروری صفات کا اضافہ کر کے اس کے کلام کو مشکل تر بنا دیتا ہے ۔

جہاں تک اس کے بیانات شاعرانہ کا تعلق ہے ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ واقعہ الٹا ہے ۔ اقبال نے اپنی شاعری کے بعض نظریات کو واضح کرنے کے لئے انہیں نثر کے خشک قالب میں ڈھالنے اور ان کی شرح کرنے کی کوشش کی ۔ اس کے برعکس اگر اس نے اپنی تقریروں میں شعور ارادے ، سنجیدگی اور غیر جذباتی طریقے سے بیان کئے ہوئے جذبات کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خیالات اور نظریات من و عن اسی طرح شعر میں منتقل ہو گئے ہوں جس طرح نثر میں ہیں ۔ شاعری کی ایمائیت (SUGGASTIVENESS) اثر اور وجدان کو روکنا ۔ جس کے ذریعہ اصل خیال کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اور نئی تاثیر پیدا کر لیتا ہے ۔ خود شاعر کے بس کی بات نہیں ۔ اقبال خود نہیں جانتا کہ اس کے مقالوں میں ظاہر کئے ہوئے خیالات اس کے شعر میں جلوہ گر ہو کر ہم پر کیا اثر کر رہے ہیں ؟

م۔م۔جوہر میرٹھی

علّامہ اقبال کا فلسفہ

جوہر۔ آئیے باقی صاحب مزاج عالی ہیں ماہ نومبر کے جامعہ ہیں اپنے مضمون پر آپ کی تنقید دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

باقی۔ شکریہ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کو اس تنقید سے اتفاق ہے یا اختلاف؟

جوہر۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو اختلاف ہے۔ اور اگر ناراض ہوں تو اتفاق

باقی۔ آپ نے بھی کمال کیا اختلاف تو اتفاق کی منزل پر پہنچنے کے لئے ایک ایک زینہ ہے جوہر صاحب آپ کے مضمون سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ علامہ کے کلام کی جراحی کر کے ان کی نثری تحریروں سے کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کے پیام کا تعین کر سکیں۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ اُردو شعر و ادب سے یہ خام طریقۂ تنقید دور نہ ہو سکا۔

جوہر۔ باقی صاحب میں نے مضمون میں اقبال کے فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سعی میں ان کی شاعری سے بھی مدد لی ہے۔ اقبال کی شاعری پر کسی تنقید یا تقابل کا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اور یہ امر مضمون سے واضح ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ
مرے ہمصفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

باقی صاحب! واقعہ یہ ہے کہ اقبال پہلے فلسفی ہیں۔ اور بعد میں شاعر چونکہ ایشیائی طبایع شعر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لئے اس نے اپنے فلسفہ کو شعر میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ حیات کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے اور انہیں امکانات کی روشنی میں علامہ کا پیام عمل ہے۔ یہ آپ نے بھی مانا ہے۔ کہ علامہ کا کلام تعلیماتِ قرآنی سے دور نہیں ہے۔ وہ بانگ درا کے دور میں تلاش و جستجو کا شکار تھے۔ ان کے دل میں سوالات کا ہجوم تھا۔ پیام مشرق میں وہ ان کا حل سوچتے ہیں۔ اور اس کو مغرب کے سامنے پیش کرتے ہیں اور جاوید نامہ میں یہ مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس قدر اعتراف کے بعد فرماتے ہیں کہ شاعر اقبال فلسفی نہیں۔ آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے میں یہ عرض کروں گا۔ کہ اگر آپ اقبال کو صرف شاعر خیال کرتے ہیں تو مندرجہ بالا خیال اس کی تردید کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک تو سوال کرنا۔ جستجو کرنا۔ مسائل کا حل کرنا اور ان کا اعلان کرنا۔ شاعر کا کام ہی نہیں اقبال چونکہ بقول آپ کے ایسا کرتا ہے اور صرف جذبات و احساسات سے نہیں کھیلتا تو آپ کے استدلال کے بموجب، شاعر نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس کو فلسفی مان لیں تو وہ (آپ کے نظریہ کے بموجب) شاعر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس ارشاد سے آپ کا یہ مطلب ہے۔ کہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی دو الگ الگ چیزیں ہیں تو میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنے مضمون اقبال فلسفی کی جراحی کی تھی۔ لیکن میری اپنی یہ رائے ہے کہ علامہ کا مقصد فکر شاعری نہیں بلکہ فلسفہ کا درس ہے وہ فلسفی

شاعر ہے اسلیئے آپ کے مجوزہ اصول تنقید جو صرف جمالیاتی وجذباتی شاعر کو پرکھنے کیلیئے شائد کافی ہو سکتے ہوں اقبال پر تنقید کرنے کے لیئے ناکافی ہیں۔

باقی۔ کیا آپ کو ان تین اصولوں سے بھی اختلاف ہے۔ جوہر صاحب وہ بدیہیات میں سے ہیں

جوہر۔ باقی صاحب! یہ بدیہیات ہو سکتے ہیں لیکن علامہ نے ادب کی تنقید کے جو اصول مقرر کیئے ہیں وہ آپ کے مجوزہ اصولوں سے بالکل مختلف ہیں اس اختلاف کی یہ وجہ ہے کہ آپ کے نزدیک شاعر فلسفی نہیں ہوتا اور اقبال کے نزدیک وہ شاعر جو فلسفی نہیں یا جس کا کوئی خاص پیام نہیں وہ ایک بد بودار رنگین پھول کی مانند ہے میرا خیال ہے کہ اقبال کے کلام کو اقبال کے مجوزہ اصولوں پر پرکھنا چاہیئے اقبال کے معین کردہ تنقیدی اصول پر غور کرنے سے یہ روشن ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال ادب کی تنقید کے لئے اس امر کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ادبیت کی وجدانی دنیا کی تعمیر میں کس قسم کے تخیلات سے کام لیا گیا ہے۔ وہ ادب کی طرز تحریر اور طرز ادا کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی پر نظر رکھتے ہیں آپ نے جذباتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے بہت سادگی سے یہ تحریر کر دیا ہے کہ شاعر وہ ہے جو زندگی کی چند صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صداقتیں کیا ہیں اور یہیں سے فلسفہ کی حد شروع ہو جاتی ہے یعنی اول تو شاعر کا یہ فرض ہوا کہ وہ صداقت سے روشناس ہو پھر اس کا اظہار شدت احساس سے کرے یعنی پہلے شاعر کو فلسفی ہونا چاہیئے پھر شاعر، اقبال خود اسلامی تخیل کو شعر کی زبان میں پیش کرتا ہے اور اسلام کے ہر پہلو

پر انہماک و علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا ہے ۔ اقبال موجودہ زمانہ کے رجحانات سے رد و قدح کر کے اسلامی نظام فکر میں معقولیت امر کرتے ہیں ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہے ۔

باقی ۔ تو کیا آپ کی رائے ہیں ایک جذباتی انسان جو شعور، منطق ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنا لیتا ہے شاعر نہیں ۔ جوہر صاحب! شاعر وہ ہے جو بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں ۔

جوہر ۔ باقی صاحب! یہ بھی ایک نظریہ ہو سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا علامہ بھی آپ کے جمالیاتی اور جذباتی نظریہ سے متفق تھے حقیقت نگار کو جمالیاتی اور جذباتی نظریہ کے مطابق پرکھنا اس کے کلام کی اہمیت کو گرانا ہے ۔ اب میں آپ کے سامنے اقبال کا کلام پیش کئے دیتا ہوں جس سے یہ صاف ہو جائے گا کہ ادب کو پرکھنے کے لئے علامہ نے آپ کے اصولوں سے مختلف اصول بیان کئے اور شعر و شاعری کے متعلق ان کا اپنا تصور آپ کے تخیل سے بالکل جدا ہے ؎

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ!
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

شعر کو خودی کی حفاظت کرنی چاہیئے ورنہ جذباتی گورکھ دھندہ رہ

جاتا ہے جمالیاتی ادب فسون وافسانہ ہے کیونکہ وہ خودی کو کند کرتا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ اگر اس تخیل کو مان لیا جائے تو اردو ادب کا ایک کثیر حصہ حدود ادب سے خارج ہو جاتا ہے والٹیر کہا کرتا تھا " جو باتیں اتنی ناپاک ہوتی ہیں کہ ان کو نثر میں بیان کرنا شرمناک معلوم ہوتا ہے ان کو شعر کی شکل میں گا کر بیان کیا جاتا ہے " والٹیر کا یہ قول ہماری جذباتی شاعری پر پوری طرح عائد ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ملوان دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم کہاں تم کہاں یہ جوانی (میر)

پینے تھے لب کے بوسے ہم دیتے تھے منہ میں وہ زباں
ہائے تھے کامیاب عیش دونوں ہم کہ ناگہاں

صبح دمید شب گزشت ماہ شبینہ خانہ رفت
روئے سحر سیاہ کنیم یار بہ ایں بہانہ رفت (مومن)

یہ شب اشعار شدت احساس سے احساس کو ابھارنے کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن اقبال کے نزدیک نہ یہ شعر ہیں اور نہ ان لمحات میں جبکہ ان بزرگوں نے یہ شعر کہے ان کو شاعر کہنا مناسب ہے کہاں ہمارے پرانے شاعروں کا یہ عصمت سوز جمالیاتی کلام اور کہاں اقبال کا یہ نظریہ ؎

اے کہ ہے زیر فلک مثل شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقامات وجود

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود

مکتب و مے کدہ جز درس نبودن ندہند

بودن آموز کہ ہم باشی وہم خواہی بود

جس شاعری سے تعمیر خودی نہ ہو اس پر اقبال آنسو بہاتے ہیں اور باقی صاحب آپ کی جمالیاتی شاعری اسی قابل ہے کہ اس پر نوحہ کیا جائے ہماری شاعری زوال کے زمانے کی شاعری ہے۔ اور شاید اسی قسم کی جمالیاتی اور جذباتی شاعری کو سراہنے کے لئے آپ کے بیان کردہ اصول وجود میں لائے گئے ان شاعروں اور ان کی شاعری کے سراہنے والوں کی بابت علامہ فرماتے ہیں ؎

آہ، وہ کافر بے چارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصر رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات ومنات
تو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کہ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دیکھئے باقی صاحب اقبال کے نزدیک شاعر وہ ہے جو حقیقت کو سمجھے اور حقیقت جذباتی طریقہ پر سمجھ میں نہیں آسکتی اس کی بابت علامہ نے اپنے خطبات میں اشارہ کیا ہے۔ اگلے شعر میں علامہ فرماتے ہیں ؎

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اگر شاعر نواتے خودی کو نہ ابھارے تو وہ شاعری بیکار ہے۔ ہنر کا مقصد سماجی زندگی کی تشکیل کرنا ہے۔ جس ہنر میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور جو زلف و کاکل کے جمالیات اور بوس و کنار کے جذبات سے آگے نہ بڑھے وہ ہنر نہیں بلکہ بے ہنری ہے۔ باقی صاحب آپ کچھ اکتا سے گئے۔

باقی۔ نہیں نہیں آپ فرمایئے میں سن رہا ہوں مفصل جواب دوں گا۔

جوہر۔ باقی صاحب! میں اس مسئلہ کو اس لئے زیادہ وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے چند عزیز دوستوں نے بھی میرا مضمون دیکھ کر یہی فرمایا کہ اقبال تو شاعر ہے اس کی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تنقید بے معنیٰ ہے اس سے مجھے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر یہی خیال ذہن نشین ہو گیا ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ خود علامہ کے کلام سے نوجوانوں کے اس خیال کی تردید کر دوں۔ اقبال جمالیاتی و جذباتی شاعر نہیں ہے۔ بلکہ فلسفی ہے جو حقیقت کو سمجھتا اور سمجھانا چاہتا ہے "شاعر" کے عنوان سے ضرب کلیم میں علامہ فرماتے ہیں ؎

مشرق کی نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی نے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

جو قوم غلامی میں جکڑی ہوئی ہو اس کے لئے جمالیاتی شاعری سم قاتل ہے جس طرح اگر گھر میں چوہے قلابازیاں کھائیں تو مسکین کو ناچ ورنگ دیکھنا تباہی کو دعوت دینا ہے ۔ اسی طرح غلامی میں جمالیات کی طرف جانا بربادی ہے اقبال شاعر کو حقیقت سے معرکہ آرا دیکھنا چاہتا ہے ۔ جمال سے مبہوت نہیں دیکھنا چاہتا ہماری شاعری کی بابت کہتا ہے

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دلاویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارا تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نماید بہ پرہیز

شاعر اگر حقیقت آشنا نہیں ہے اور وہ اپنے کلام سے خودی کو نہیں ابھار سکتا ۔ تو اس کو خاموش رہنا چاہیئے ایک دوسری جگہ وہ ہنروران ہند کے عنوان سے فرماتے ہیں ۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

باقی صاحب یہ ہے آپ کے جمالیاتی ادیبوں کی حقیقت علامہ کی نظر

میں جسے آپ اپنی جمالیاتی عینک سے دیکھنے کی سعی فرما رہے ہیں
دراصل جذبات واحساسات بھی کسی فلسفہ اور زندگی کے مطابق
ہوتے ہیں شاعر پہلے فلسفی ہوتا ہے پھر اس فلسفہ کی روشنی میں خاص
قسم کے جذبات واحساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے اقبال
فلسفی شاعر ہے جو اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام ایک خاص
قسم کی سماجی زندگی کا موید ہے اس زندگی کی تشکیل کے لئے ایک
خاص لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے۔ اقبال اس زندگی اس لائحہ عمل
اور اس نصب العین کی طرف برابر دعوت دے رہا ہے جو
کچھ علامہ نے نظم میں کہا ہے وہی نثر میں کہا ہے اس لئے میں سمجھتا
ہوں کہ آپ مجھے یہ حق ضرور دیں گے کہ میں علامہ کی نظم کو ان کی تحریر
کردہ نثر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کروں اور شعرا کی طرح اقبال
کا مسلک یہ نہیں کہ قافیہ اور ردیف نے جو خیال دل میں پیدا
کیا اس کو پر شوکت اور دلگداز الفاظ میں باندھ دیا بلکہ وہ قافیہ
وردیف کو فلسفہ کے تابع رکھتا ہے قافیہ وردیف کی خاطر اپنے
خاص پیغام سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا باقی صاحب
آپ کے تینوں بدیہیات سے مختلف ہیں علامہ کے کلام پر تنقید
آپ کے زاویہ نگاہ کے مطابق نہیں کی جاسکتی اور اگر آپ ایسا کریں
گے تو اس کے پیغام کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ جمالیاتی اور جذباتی
شاعری بھی سماجی زندگی میں جگہ ہے۔ لیکن ناچ ورنگ کی طرح شام
کو ایک آدھ گھنٹہ ہی اس کو دیا جاسکتا ہے اور بس۔

باقی۔ جوہر صاحب بڑی دقت یہ آگئی کہ آپ شعر کی جادوگری کو نہیں
سمجھتے۔ دراصل جو خیالات نثر میں معمولی طور پر بیان کئے جاتے ہیں وہ
جب شعر بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں تو ان میں اتنی رنگ آمیزی وسعت اور

اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ وہ کوئی دوسری شئے ہو جاتے ہیں۔

جوہر۔ باقی صاحب اشعار اور نثر کے طریقۂ بیان میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن اتنا نہیں کہ نثر میں اگر الحاد کی تبلیغ کی جا رہی ہے تو جب اس خیال کو نظم کریں تو وہ خدا کے وجود و واحدانیت کا ذکر معلوم ہوگا۔ مثنوی اسرار و رموز تو آپ کی نظر سے گذری ہو گی اس میں تمامتر علامہ کا وہی فلسفہ ہے جو انہوں نے اپنے مقالوں میں بیان کیا ہے۔ مثنوی کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ دربیان ایں کہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔

۲۔ دربیان ایں کہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است۔

۳۔ دربیان ایں کہ خودی از عشق و محبت استحکام پذیرد۔

۴۔ درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ۔

ساری مثنوی میں اسی قسم کے مطالب کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاید آپ یہ فرما دیں کہ یہ مثنوی ہے ضرب کلیم کو لیجئے۔ اس کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

اجتہاد، تقدیر، توحید، جہاد، قوت اور دین، فلسفہ، نکتۂ توحید خودی کی تربیت، خودی کی زندگی، عقل و دل، تسلیم و رضا، مرگ خودی، آزادیٔ نسواں، وجود، دین و ہنر، اشتراکیت، انقلاب وغیرہ یہ وہی باتیں ہیں جن کو علامہ نے نہایت جامع طور پر اپنے خطبوں میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ نثر میں خیالات کا اظہار آزادی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لئے علامہ کے کلام کو ان کے خطبوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ شعر میں استعارات، تشبیہات حسن ادا وغیرہ اتنی جاذب توجہ چیزیں ہوتی ہیں کہ نفس مضمون کی طرف توجہ مشکل ہی سے جاتی ہے۔

لیکن نثر میں تمام تر توجہ نفس مضمون کی طرف رہتی ہے اس لئے مطالب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں جو صاحب اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو علامہ کے خطبے پڑھنے چاہئیں اور ان پر پوری طرح حاوی ہونے کے بعد اس کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

باقی - اچھا ان امور کو چھوڑئیے ان کا جواب میں مفصل دوں گا۔ اب یہ فرمائیے کہ علامہ کا فلسفہ کیا تھا۔

جوہر - یہ اب دوسری صحبت کے لئے اٹھا رکھیئے لیکن باقی صاحب! یہ عرض کر دوں کہ آپ نے اقبال کے فلسفہ کی تحلیل جس طرح کی ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔

باقی - اچھا تو رخصت کیونکہ کافی رات چلی گئی اور اگر یہ گفتگو چھڑ گئی۔ تو طویل ہو گی۔ اچھا شب بخیر۔

جوہر - خدا حافظ

۱۹۴۱ء

سید الطاف حسین

ترجمانِ حقیقت

ہماری زندگی ایک معمہ ہے۔ ہماری ابتدا و انتہا کی کیفیت۔ ہماری تخلیق کا مقصد۔ ہماری آرزوں کا منتہیٰ اور ہماری کوششوں کی غرض وغایت سب کی سب باتیں ایک رازِ سربستہ ہیں جس کی عقدہ کشائی میں عقل وخرد کے ناخن متعدد بار ناکام رہ چکے ہیں۔ ہر ایک شخص نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس معمے کا کوئی نہ کوئی حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر ایک نے زندگی کے پیچ در پیچ مسائل پر مختلف زدایا سے روشنی ڈال کر اس کے مختلف پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ معمۂ حیات گویا ایک طویل وعریض ظلمت کدہ ہے۔ جس کی تاریکیوں کو مختلف الخیال فلاسفہ کے ظنون واوہام کی بازی گاہ تصور کرنا چاہیئے۔ عام آدمی خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس قابل نہیں کہ اسرارِ حیات کا ادراک کر سکیں۔ لہٰذا فطرت گاہ گاہ ایک آدھ دیدہ ور ایسا پیدا کر دیتی ہے۔ جو اس کے اشاروں کو سمجھ سکے اور اس کے رموز سے آشنا ہو کر اور لوگوں کو بھی ہدایت دے۔ فطرت کے ان پسندیدہ اصحابِ نظر کی ایک مابہ الامتیاز صفت یہ ہے۔ کہ وہ عالمِ محسوسات میں چند ایسی "غیر مرئی" حقیقتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو عام لوگوں کی نظر سے مخفی ہوتی ہیں۔ اور جن سے اکثر قطعی طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔ اقبال ان مخصوص دیدہ ور اصحاب کی جماعت میں نہایت ممتاز مقام پر متمکن ہے۔ اس کی نگاہیں ابتدا ہی سے اس حقیقتِ اشیا کی متلاشی ہیں۔ جسے

وہ اپنی محبوبہ خیال کرتا ہے ۔ اس کی جستجو اسے آوارہ و پریشان رکھتی ہے اور ابتدا میں اس خیال سے اس کا دل نہایت پژمردہ رہتا ہے ۔ کہ وہ اس کے جمال کی نظارگی سے شاید کبھی بہرہ ور نہ ہوگا ۔ اور وہ اپنے دل کی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

قدرت کو شاید اس کی پریشانی خاطر منظور نہیں ۔ اس کی مایوسی بہت جلد ختم ہونے لگتی ہے ۔ اور گلشن فطرت کی رنگینیوں میں وہ اپنی محبوبہ کے پرتو کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے :-

آمیں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا
نہروں کے آئینے میں شبنم کی آرسی میں

لیکن ابھی وہ حصول مقصد سے بہت دور ہے ۔ اور اس کا دامنِ دل گوہر مراد سے خالی ۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ فطرت کا نگار خانہ محض آئینہ حقیقت ہے ۔ حقیقت نہیں ۔ وہ چیز جس کی اسے تلاش ہے ۔ اگرچہ فطرت کے رنگین مناظر اس کے آئینہ دار ہیں ۔ تاہم اس کا اصلی وطن ان سے بلند و بالا تر ہے ۔ سکوت شب ۔ آسمان کے پاکیزہ جھلملاتے ستاروں کی نزہت آمیز تابندگی ۔ کوہسار کا سکوت ۔ شفق کی رنگینی ۔ چلتی نہریں حقیقت کے متلاشی دل کے لئے نیم تسلی کا باعث ضرور ہیں ۔ مگر ان سے اس کی کامل تشفی نہیں ہو سکتی ۔ اقبال اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے ۔ وہ اپنے دل کو مناظر فطرت کے نظاروں کی بار بار دعوت دے کر محسوس کرتا ہے ۔ کہ اس کا دل ہلکے سے ہلکے حجاب کی تاب بھی نہیں رکھتا ۔ اور جب تک حسن ازل بذاتِ خود اس کے روبرو بے نقاب نہ ہو ۔ اس کی تسلی ناممکن ہے ۔ کائناتِ عالم کے نظارے اس کے اضطراب کو فرو کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ۔

اور وہ اپنے دل کو قدرت کی ہم آہنگی کا بہلاوہ دیتے ہوئے حسرت آمیز الفاظ میں اس چیز کے متعلق سوال کرتا ہے جس کی تلاش اسے حیران کئے رکھتی ہے۔ ؎

جس شئے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

مگر بالآخر اس کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں۔ اور وہ گوہر جس کی تلاش میں اس نے گلشن نما صحرائے فطرت کے ذرہ ذرہ کو چھان مارا۔ اسے اپنے "ویرانہ دل" میں مل جاتا ہے۔ وہ حقیقت جس کی جھلک اسے فطرت نے نقابِ رنگ و بو میں سے پیشتر ازیں معمولی طور پر دکھائی دیا کرتی تھی۔ اب اسے اپنی رگ رگ میں ظاہر و باہر نظر آنے لگتی ہے۔ اور وہ ارتقا انسانی کی اس انتہائی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں حقائق آشنا نگاہیں حسن ازل کے نظارہ سے ایک لحہ تک کے لئے بھی جدا نہیں ہوتیں۔ کبھی اس کا یہ حال تھا کہ "میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیاز رنگ و بو" اور اب اس کا یہ حال ہے کہ:

شوق میری لے میں ہے، شور میری نے میں ہے!
نغمۂ اللہ ھُو، میری رگ و پے میں ہے!

وہ حقیقتِ اشیا جس تک پہنچنا فلاسفہ کے نزدیک حیات انسانی کی ارتقائی رو کا انتہائی مقصد ہے۔ وہ اقبال کے نزدیک عقل و خرد کی افزائش سے نہیں بلکہ محض تنویر دل سے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ عقل و خرد کے پرپیچ راستوں کی فریب دہی سے بخوبی واقف ہے۔ اور لوگوں کو بار بار اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ کہ دل کی معجز نمائی کے روبرو عقل بالکل بے بس و بے اختیار ہے۔ عقل کی مذمت جو برگساں کے فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی اکثر مقامات محض اس کے لئے وقف

نظر آتے ہیں :-

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

تنویر دل ایک وجدانی کیفیت ہے۔ جس کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگاہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہر شعر میں خودی کا سبق موجود ہے۔ اور چونکہ اقبال کی نگاہ میں خودی اور ایمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ وہ صحیح مومن کی زندگی کو نظارۂ حقیقت اور مادیت کی بے پناہ طاقتوں کو تابع فرمان کرنے کا واحد اور قطعی ذریعہ سمجھتا ہے :-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کا کلام مادہ پرست دنیا کے لئے روحانیت کا پیغام ہے۔ جس سے بار بار اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ عرصۂ حیات کی لا متناہی وسعتوں میں ہماری مادی زندگی کو وہی حیثیت حاصل ہے۔ جو ناچیز قطرۂ آب کو بحر بے پایاں میں۔ لہٰذا انسان کو اتنا تنگ نظر نہ ہونا چاہیئے۔ کہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اس کی نگاہیں ہر وقت مادہ کی چار دیواری میں ہی محدود رہیں۔ اگر وہ اپنی قوتِ مشاہدہ اور فکر و تدبر سے ذرّہ بھر بھی کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا۔ کہ زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہے جس کی روانی کے مختلف ارتقائی سطوح ہیں۔ اور جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر نئی سطح پر اپنے اندر نت نئے صدف اور نئے گوہر پیدا کرتا چلا جائے جمادات سے لے کر انسان تک جو مرحلے دریائے حیات نے طے کر لئے ہیں

ان سے اس میں ایک گوہرِ بے بہا پیدا ہو چکا ہے۔ اور وہ صفت آگہی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی قوتوں کی بدولت اپنے ماحول پر محض غالب ہی نہیں بلکہ اپنی قوتوں اور اپنے غلبہ کے احساس سے بھی متصف ہے۔ اگر زندگی کی ارتقائی رد کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہو گی۔ کہ جہاں آج تک اس سے انسان میں اپنی مادی قوتوں کا احساس پیدا ہوا ہے۔ وہاں یقیناً کچھ منازل ایسی بھی ہیں۔ جہاں انسان میں صفت آگہی سے لطیف تر صفات نمودار ہوں گی اور وہ اپنی روحانی طاقتوں سے بھی آگاہ ہو گا۔ خود انسانی زندگی میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جوں جوں انسان کے دل و دماغ پرورش پاتے ہیں اس کی نگاہیں مادے کے انفرادی کرشموں سے ہٹ ہٹ کر ان لطیف حقائق کی طرف منتقل ہونے لگتی ہیں۔ جو مادی کرشموں کی توجیہہ ہونے کے علاوہ ان کے لئے جامع اشتات کا کام بھی دیں۔ مثلاً اکثر لوگ تو محض گرتے ہوئے سیبوں اور ٹوٹتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان میں کوئی نسبت خیال نہیں کرتے۔ مگر انسان کی قوت متخیلہ جب عام سطح سے ذرا اونچی ہو جاتی ہے۔ تو بجز جیات میں سے ایک آدھ نیوٹن سا گوہرِ بے بہا ایسا نکل آتا ہے۔ جو اپنی دیدہ وری کے طفیل دنیا بھر کی گرتی ہوئی چیزوں کے پس پشت قوت کشش کو کارفرما دیکھ کر دنیا پر اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ وہ تمام کرشمے جو بظاہر بے تعلق معلوم ہوتے تھے۔ دراصل ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں :-

یہ محض اتفاقی امر ہے۔ کہ دیدہ وروں کی جماعت میں سے میں نے نیوٹن کی مثال پیش کی۔ ورنہ اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصحاب نظر محض دنیائے سائنس کے لئے ہی مخصوص ہیں۔ اور نہ میری اس سے یہ مراد ہے۔ کہ علومِ سائنس کو دیدہ وری سے کچھ خاص تعلق ہے جو اور

علوم کو نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ ایسے لوگ ہر شعبۂ علم میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ اور ادبی دنیا میں ان ہستیوں کو عام طور پر شعرا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حقیقی شاعر کی اختراقی نگاہیں محسوسات کے پردوں کو چاک کر کے حقائق حسن و عشق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ دنیا کو اس بات سے آگاہ کر دیتا ہے کہ فطرت کی دلفریبیوں کی نمود محض ان حقائق کے وجود سے ہے۔ اور اگرچہ عام نگاہیں ان حقائق سے ناآشنا ہیں۔ تاہم اگر انسان تھوڑا بہت غور و فکر کرے۔ تو اسے حقیقت کا نظارۂ کامل نہ سہی ایک آدھ جھلک تو ضروری نصیب ہو سکتی ہے۔ ادبی دنیا میں شاعر کو وہی حیثیت حاصل ہے۔ جو سائنسدان کو شعبہ سائنس میں اور جس طرح صاحب نظر سائنسدان کی نگاہیں گرتے ہوئے سیبوں اور ستاروں سے ہٹ کر قوت کشش کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ جس کی وحدت میں ان کرشموں کی کثرت کا راز ہے۔ اسی طرح حقیقی شاعر کی نگاہیں بھی گلشن فطرت کے حسین نظاروں سے کنارہ کش ہو کر حقیقی حسن و عشق کی طرف ملتفت ہوتی ہیں۔ جن کے رشتۂ واحد میں مختلف دلفریب مناظر اس طرح منسلک ہیں۔ جیسے ایک شاخ میں متعدد پھول :-

عام آدمی گرتے ہوئے سیب کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے۔ کہ اس نے محض ایک چیز کو بلندی سے نیچائی کی طرف آتے دیکھا۔ مگر سائنسدان کی باریک بین نگاہیں اس معمولی واقعہ میں قوت کشش کو مصروف کار دیکھتی ہیں بعینہٖ اسی طرح عام آدمی شگفتہ پھول کو دیکھ کر یہ خیال کرتا ہے۔ کہ وہ محض چند رنگین پتیوں کے مجموعہ کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ مگر بالمقابل اس کے شاعر کی نکتہ رس نگاہیں اس پھول کے کرشمۂ رنگ و بو کے پشت جہانِ عشق آباد دیکھتی ہیں۔ یعنی گرتا ہوا سیب اگر سائنسدان کی نگاہوں میں کشش کی ہمہ گیر قوت کا ایک معمولی مظاہرہ ہے۔ تو رنگین پھول شاعر

کی نگاہوں میں قوت عشق کی معجز نمائی کا کرشمہ۔

ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

صاف ظاہر ہے کہ زندگی کی ارتقائی منازل میں انسان اپنی قوت تخیلہ کی پختگی کے سہارے مادے کی چہار دیواری کے طلسم کو توڑ کر ان لطیف حقائق کی دید میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جو مادی کرشموں اور مادی زندگی کی طرح آنی و فانی نہیں۔ بلکہ ابدالآباد تک رہنے والی ہیں۔ مگر ایسی ہستیاں جنہیں زندگی کے لشکر جرار کی شاندار فتوحات تصور کرنا چاہئے کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں۔ عام آدمی تو زندگی کی نشیبی سطح پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ مگر ان کا مسکن اس کی بلند ترین منازل پر ہوتا ہے جن کی رفعتوں سے وہ کرشمہ ہائے عالم کی نیرنگیوں کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھ کر بنی نوع انسان کو شاہراہ حقیقت کی ہدایت کرتے ہیں بمندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے۔ کہ انسانی قوتیں عروج یافتہ ہو کر محسوسات کی قیود سے نکل کر حقائق لطیفہ کے نظاروں میں محو ہونے لگتی ہیں۔ یا بہ دیگر الفاظ یوں کہنا چاہیئے کہ زندگی کی ارتقائی رو کا میلان کثافت سے لطافت کی طرف ہے۔ ابتدا میں انسان مادے کے کرشموں سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور ان کو ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق سمجھتا ہے۔ اس سے اگلی منزل میں جو دیدہ ور ماہرین شعر و فلسفہ و سائنس کا مقام ہے۔ انسان ان لطیف اصولوں یا حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے ماتحت مادی زندگی کے لاتعداد منتشر کرشمے اس طرح یکجا کیے جا سکتے ہیں۔ جیسے رنگا رنگ کے موتی ایک ہی لڑی میں۔ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ ان منازل کے وجود کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ لہٰذا ان کو دیکھتے ہوئے اور ان سے زندگی کی ارتقائی رو کے میلان

کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا یقیناً بے موقع اور بے محل نہ ہوگا۔ کہ ان سے آگے ایسی منزلیں بھی زندگی کے لامتناہی سفر کا حصہ ہیں۔ جہاں لطیف سے لطیف تر حقائق چشم انسان جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جن کا محاصرہ پہلی منزل کے حقائق سے یقیناً بہت زیادہ وسیع و بسیط ہے۔ اس بات کو اگر ذہن نشین کر لیا جائے۔ تو یہ بعید از قیاس معلوم نہ ہوگا۔ کہ زندگی کی جولانگاہ میں ایسی منازل بھی موجود ہیں۔ جو دیدہ ور شعرا اور صاحب نظر سائنسدانوں کی منازل سے بالاتر ہیں۔ جہاں انسان پر ایسی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو علمی و شعری حقائق سے بھی لطیف تر ہیں۔ اور جن کا محاصرہ شعری حقائق کی طرح محدود مخصوص کرشموں پر نہیں بلکہ تمام کائنات پر ہے۔ مذہب نے ان لطیف ترین حقائق کو حقیقت اشیا یا خدا کے نام سے تعبیر کر کے ان منازل کو جہاں یہ حقیقت انسان پر بے نقاب ہوتی ہے۔ انبیا و صوفیا کی مخصوص ملکیت قرار دیا ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنا گویا عروج انسانی کا کمال ہے۔ اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس گوہر مراد کو پا لیا نیز صوفیا کی زندگی سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ حقیقت دیکھنے کی چیز ہے سمجھنے کی نہیں اور اس کا تعلق ذہنی ادراک سے نہیں بلکہ "مشاہدہ" سے ہے قرآن کریم نے ایمان بالغیب کے فلسفہ میں انسانی عقل و ادراک کی کمزوری کا اعلان کرتے ہوئے اس بات کی شہادت دی کہ معرفت حق ذہنی و ادراکی کیفیت کا نام نہیں، روحانی مشاہدے کی تفسیر ہے۔ اور اس واقعیت کو یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَھُمْ کے جامع الفاظ میں بیان کیا ہے مرید ہندی پیر رومی سے اسی سلسلہ میں استفسار کرتے ہیں۔ کہ انسانی ارتقا کا مقصد منتہٰی کیا ہے۔ علم حقیقت یا دیدار حقیقت؟

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایت آدم خبر ہے یا نظر

جواب میں ارشاد ہوتا ہے

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

اقبال کا دعوے ہے کہ یہ نظر انسان میں محض خودی کی نمود سے پیدا ہو سکتی ہے اور اس حقیقت کو اس نے متعدد اشعار میں ظاہر کیا ہے زندگی کی جولانگاہ اس کی نگاہوں میں تقدیر خودی کی مختلف منازل کا نام ہے اور ہماری مادّی زندگی ان منازل کا آغاز

خودی کی ہے یہ منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر

. جو انسان خودی سے آگاہ ہو وہ لمحہ بھر کے لئے بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا۔ کہ وہ ارتقائی منازل جن کا عبور اسے در پیش ہے۔ ان کی امتدادی وسعتوں کے مقابلہ میں انسانی زندگی نمود شرر کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ اس کی نگاہیں اپنی موجودہ منازل کے علاوہ آئندہ مراحل پر بھی لگی رہتی ہیں۔ اور وہ وقت حاضر کی نمود کے باوجود ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ ایسے انسان کی نگاہوں میں موت ایک تغیر محض کے سوا اور کچھ نہیں جس کی بدولت زندگی جامہ کثافت اتار پھینکتی ہے۔ اور وہ اس تغیر سے خائف ہونے کی بجائے گونا مسرت حاصل کرتا ہے کہ اس کی خودی جسم خاکی کی کثافت سے آزاد ہو کر اپنی قسم کے لطیف ماحول میں زندگی بسر کر کے اپنی نمود کے فرائض کو بہترین طور پر سر انجام دے سکے گی اور .

اس طرح وہ اس حقیقت اشیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ جسے بہت سے حکما زندگی کی ارتقائی رَو کا انتہائی مقصد خیال کرتے ہیں۔ اور جس کے حصول کا راز بقول اقبال انسان کی اپنی ذات کی نمود میں مستتر ہے۔ ایسے انسان کے لئے موت گویا ایک راستہ ہے جو اسے اس کے محبوب و مقصود تک لے جاتا ہے۔ اگر آدمی واقعی اپنی خودی سے آگاہ ہے یعنی اسے اپنے مقصود سے محبت ہے اور وہ اس تک پہنچنے کے لئے بیقرار ہے۔ تو موت یقیناً اس کی ثابت قدمی میں تزلزل پیدا نہ کر سکے گی۔ اور وہ اس سے لرزاں و ترساں ہونے کی بجائے خوش آمدید کہے گا ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان حیات

یہی ایک حقیقت ہے کہ جو انسان کو اپنے آپ سے اور خدا سے آگاہ کرتی ہے۔ اور انسان کو لازمانی و لامکانی کی تعلیم دے کر اس کے دل و دماغ کو توسیع بخشتی ہے۔ جس کی بدولت وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حیات سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اس طریق پر بھی گامزن رہے جس کا اتباع عین ہدایت کا موجب اور جس سے انحراف ضلالت کی دلیل ہے ؛

اقبال وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں اس راز کو فاش کیا۔ اس کا کلام انسانی تاریخ میں ایک عالمگیر انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے اثرات ابھی بہت کچھ پردۂ وقت میں مستور ہیں اس کی آواز سے نوجوانوں کے دلوں میں ایک نئی دنیا رونما ہو رہی ہے۔ جس کا پرتو ابھی ان کے افکار و اعمال پر بہت ہلکا نظر آتا ہے۔ مگر جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ رفتہ رفتہ نمایاں اور نمایاں تر ہوتا چلا

جائے گا۔ اقبال کا پیغام اسرارِ حیات کی تفسیر ہے۔ جس سے ہر ایک دل اپنے اندر ایک نیا ولولۂ زندگی محسوس کرتا ہے۔ وہ بھید جس کو اس دانائے راز، نے فاش کیا۔ اس کے انکشاف پر فطرت انسانی تا ابد ناز کرے گی۔ اس کے گنجینۂ سخن کے آبدار موتی فطرت کے رخ زیبا پر صبح کے پاکیزہ ستاروں کی مانند منوّر ہیں۔ اور ان سے اس کو وہی زینت نصیب ہے جو حسین پھولوں کو قطراتِ شبنم سے۔ تاریخ عالم ایسے دیدہ وروں کی مثالیں بہت کم پیش کرتی ہے۔ زندگی کی جوئے رواں کروڑوں کروٹیں لینے کے بعد ایسا گوہر شاہوار پیدا کرے۔ تو کرے ورنہ زمانہ شاہد ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

(۱۹۳۸ء)

میاں ارشد محمود

ترجمانِ حقیقت

اس میں کچھ شک نہیں کہ "ہماری زندگی ایک معمہ ہے" اور "ہمارا ناخنِ فکر" ہمیشہ اس کاوش میں رہتا ہے کہ اس عقدۂ مشکل کو حل کیا جائے۔ اور یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ عقل و خرد کا ناخن بسا اوقات اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی میں ناکام رہتا ہے۔ اس "طویل و عریض ظلمت کدۂ فطرت" کو جانے دیجیے جو "مختلف الخیال فلاسفہ کے ظنون و اوہام کی بازی گاہ" ہے۔ اس کے "پیچ در پیچ مسائل" پر مختلف "زوایا" سے روشنی ڈالنا بلند نظر مفکرین کا مرغوبِ خاطر مشغلہ ہے۔ دنیا کی معمولی اشیا بھی ایک عقدۂ لاینحل ہیں۔ اسی بنا پر عرفی نے کہا ہے کہ ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام ست

لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم "ترجمانِ حقیقت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ کیا اس کے معنی اس بصیرت کے ہیں جو اربابِ فکر کو دنیا کی اصلیت یا مختلف حقائق سے آگاہ کرتی ہے یا اس سے مراد وہ ذوقِ معرفت ہے جو پیغمبروں۔ عارفوں اور صوفیوں کو معبودِ حقیقی کے جلوہ پنہاں کا نظارہ کرنے کی تحریک دلاتا ہے؛ کیا اس سے مراد وہ صفائیِ قلب یا اشراق ہے جو انسان کو روحانیت اور الہٰیت کے عوالم کی سیر کراتا ہے یا اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہے؟

میرے خیال میں یہ بات عام طور پر تسلیم کی جائے گی کہ جب ناقدانِ فن نے اقبال

کو ترجمانِ حقیقت کا لقب عطا فرمایا تو ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ آپ نے دنیا کی اصلیت کو واضح کیا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ کے کلام میں خیالات کا عنصر حسن کے عنصر پہ غالب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال ابتدا میں مسئلہ "ہمہ اوست" کے قائل تھے۔ اور ان کی نظر حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ حسنِ ازل کو لالہ و گل کے پردے میں جلوہ گر دیکھیں اور دانتے یا شیلی کی طرح ایک مثالی حسن کو بیاطرس اور امیلیا دیویانی کے حسن عالم آرا میں مشاہدہ کریں۔ ان کی بے تاب تمنائیں شب و روز اسی مرکز کے گرد حرکت کرتی تھیں۔ فطرت کا نگار خانہ ان کے لیے آئینۂ حق نما تھا۔ اور وہ اس حسن کو جو کائنات کے تہ در تہ پردوں میں مستور ہے۔ اپنی محبوبہ کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن جیسا کہ اقبال کے ذہنی ارتقاء میں دلچسپی رکھنے والے اصحاب جانتے ہیں۔ "ترجمان حقیقت" تمام عمران معنوں میں حقیقت کے پرستار نہیں رہے۔ یہ نقطۂ نظر خالص صوفی شعرا کا نقطۂ نظر تھا۔ اور اقبال نے مغربی اثرات کے ماتحت اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے زندگی کے متعلق ایک نیا نقطۂ نظر قائم کیا۔ جس میں ایک طرف مشرق کی روحانیت کا عکس نظر آتا ہے۔ اور دوسری طرف مغرب کی مادیت جلوہ فروش ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کے نزدیک صرف شاہد ذات کی تجلیات کا مشاہدہ ہی انسانی فطرت کا مقصود و منتہیٰ نہیں۔ بلکہ اس کی صحیح نشو و نما کے لیے ظاہر باطن دونوں یکساں توجہ دینا ضروری ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید الطاف حسین کا یہ تصور کہ اقبال مرحوم ورڈ سورتھ، شیلی اور فشٹے کی طرح محض رموزِ معرفت کے شیدائی تھے۔ کس حد تک درست ہے۔

آپ کی بعض سطور سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ غالباً آپ لفظِ "حقیقت" کے وسیع مفہوم یعنی "فطرت کا حکیمانہ مطالعہ" سے غافل نہیں۔ لیکن جب آپ اہلِ معرفت کی وجدانی بصیرت کو آگہی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت قرار دے کر اقبال کو اس کا مظہر اتم قرار دیتے ہیں۔ تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی رائے میں حقیقت کا ادراک محض اہلِ تصوف کا عرفانِ باطنی ہے۔ ایک فلسفی یا سائنس دان کی حکیمانہ بصیرت نہیں۔ اور یہ متذکرۃ الصدر وجوہات کی بنا پر صحیح نہیں۔

ان سطور کے بعد میں ان اشعار پر نظر ڈالتا ہوں۔ جن سے فاضل مضمون نگار نے اپنے نظریہ کی تائید فرمائی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ کبھی اقبال کا یہ حال تھا کہ ہیں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیاز رنگ و بو اور اب اس کا یہ حال ہے کہ:

شوق مری لے میں ہے۔ شور مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

یعنی صاحبِ مضمون کی رائے میں اقبال اپنی آخری عمر میں عرفان کی آخری منزل تک پہنچ گئے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے۔ تو یہ شعر اقبال کی فطرت کے صرف ایک پہلو کی ترجمانی کرتا ہے اس کے پیغام کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں اس شعر کو دیگر اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیئے۔ جن سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جائے گی۔ کہ اقبال کا مقصد علم و عرفان دونوں کا نشو و ارتقا ہے۔ مگر چونکہ علم و حکمت کو محبت اور روحانیت سے علیحدہ رکھنے کی صورت میں بے شمار خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ عقل کو اخلاق اور نوعِ انسانی کی محبت کے ماتحت رکھا جائے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اگر ہم سائنس کے معلومات اور اختراعات کو ایک طاقت کے طور پر استعمال کریں تو اس سے بہت قباحتیں پیدا ہوں گی۔ لیکن اگر ان کا استعمال محبت اور اخلاق کے اصولوں کے مطابق کیا جائے تو ان سے کوئی خرابی نہیں پیدا ہو سکتی۔ یہی مضمون اقبال نے عقل و عشق۔ علم اور عرفان کی قدیم صوفیانہ اصطلاحیں استعمال کر کے ادا کیا ہے۔ جن کے مفہوم میں اب پہلے کی نسبت بہت وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ اقبال کی نظر صرف منزلِ کبریا ہی پر مرکوز نہیں بلکہ وہ اس دنیا کے ہنگاموں میں بھی دلچسپی لینا چاہتے ہیں جس سے عجمی تصوف پہلو تہی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ کے نزدیک تربیت خودی صرف "تنویرِ دل" ہی نہیں۔ بلکہ اس میں عقل و خرد اور دیگر ملکات کی تربیت بھی شامل ہے۔ آپ نے کبھی بھی عقل کی مذمت نہیں کی۔ اور جن اشعار سے فاضل مضمون نگار نے عقل و خرد کی مذمت کا نظریہ اخذ کیا ہے۔ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی صحیح نشو و نما کے لیے اس قوت آشفتہ کو مناسب حدود میں رکھنا چاہیئے۔ یہ وہی خیال ہے جس کا اظہار شبلی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ علم و حکمت اور عقل و خرد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے

پرومیتھیس کی نجات محبت کے مثالی پیکر ایشیا کے حیات افروز اثر پر موقوف ہے۔ برگستاں جس کے خیالات کا صاحب مضمون نے بار بار ذکر کیا ہے۔ حضراتِ صوفیہ کی طرح کشف کو عقل کے مقابلہ میں ایک زیادہ تیز اور زود فہم قوت تصور کرتا ہے۔ لیکن اس نے کہیں بھی عقل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے فلسفہ کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ ہمیں روزمرہ زندگی میں ہر قسم کے واقعات کے متعلق فی الفور فیصلہ کرنے کے لیے "عقل" جیسی تجزیاتی قوت کی ضرورت ہے جو عملی ضروریات کی بنا پر صرف مفید مطلب امور کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے برگسان کے فلسفہ کو فلسفۂ عمل کہا گیا ہے۔ اور اقبال کا فلسفۂ عمل بھی حقیقتہً اسی سے ماخوذ ہے۔ برگسان کی رائے میں کشف وہ قوت ہے۔ جس سے ہم ہنگامہ صورت سے مرعوب ہوئے بغیر اس حقیقت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ جو اس کے نزدیک ایک "متقدم حرکتِ جذب و ہضم" یا زندگی کی بے شعور قوت ہے۔ اقبال اور برگسان کے نقطۂ نظر میں صرف اس میں فرق ہے کہ اقبال اپنے استاد میگ ٹیگرٹ کے تتبع میں زندگی کو ایک باخبر قوت تصور کرتا ہے۔ اور معمولی ذرات سے کر انسان اور خدائے تعالےٰ تک تمام چیزوں کو ذی شعور افراد سمجھتا ہے لیکن برگسان ایک اور فلسفی شوپنہار کی طرح ایک بے پناہ مگر "بے شعور ارادہ" یا "توانائی" کا قائل ہے۔ بظاہر برگساں کا نظریہ زیادہ صائب معلوم ہوتا ہے یہ بے جان اشیاء کو ذی شعور تصور کرنے سے ہم ان کے لیے متحد نصب العین پیش نہیں کر سکتے۔ یہ ایک صریح امر ہے کہ انسان کی نشو ونما اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اشیائے قدرت کو مسخر کرے اور ان کی ترقی کے راستہ میں حائل ہو۔ اس کے علاوہ ہر ذرہ جسے اقبال ایک ذی شعور ہستی تصور کرتا ہے۔ دراصل برقی سالمات پر مشتمل ہے اور انسان کا جسم بھی اسی قسم کے اجزاء کا مجموعہ ہے جو اقبال کے فلسفہ کی رو سے مختلف افراد ہیں۔ ان اجزاء اور انسان کا متحدہ طور پر نشو و نما پانا عقلی طور پر محال ہے۔ کیونکہ ان میں کوئی قدر مشترک موجود نہیں۔ اگر

لے برگساں کہتا ہے کہ تمام کائنات ایک بے شعور قوت "زندگی" کا مظہر ہے۔ اور ہم اس کا ادراک محض وہبی احساس سے کر سکتے ہیں۔

یہ کہا جائے کہ "خودی" کی تربیت صرف انسان تک محدود ہے تو اس کے لیے اخلاق کا ایک واضح تصور قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ خودی کے بنیادی عناصر میں سے ایک ہے لیکن تحقیق کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اخلاقی اصول عالمگیر یا بنیادی نہیں۔ اس لیے ہم انسانی فطرت یا خودی کا کوئی واضح تصور قائم نہیں کر سکتے۔ اور نہ اس کی نشوونما کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کر سکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک خودی اور ایمان ایک ہی چیز نہیں۔ ایمان صرف خودی کا ایک جزو ہے گو یہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے باقی تمام اجزا پر فوقیت رکھتی ہو۔ وہ ایمان پر اس لیے زور دیتا ہے کہ اس سے عمل، حرکت، جوش اور روحانی احساس پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

سید الطاف حسین نے آگہی اور آگہی کے بعد وجدان کو ارتقائے حیات کی بلند ترین منازل قرار دیا ہے۔ آپ کے استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد وجدانی سطح تک رسائی پیدا کرنا ہے۔ تاکہ انسان کی بصیرت عقل کی سرحد سے گزر کر سراپا الہام ہو جائے۔ اور اس پر حقائق خود بخود القا ہونے لگ جائیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس الہامی بصیرت کی تحصیل عروج انسانی کا کمال ہے۔ گویا اقبال کا فلسفہ چند افراد کے سوائے اور کسی کے لیے مفید نہیں ثابت ہو سکتا۔ کیونکہ تمام لوگ اس مقام تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان ایک "داخلی دنیا" کا ہو رہے۔ اور خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ جو اقبال کے فلسفہ کے بالکل منافی ہے۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ "صوفیا کی زندگی سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حقیقت دیکھنے کی چیز ہے۔ سمجھنے کی نہیں"۔ اس جملہ سے ظاہر ہے کہ سید صاحب اقبال کو محض حکیم افلاطون کے مشرب "اشراق" کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ اور یہ صحیح نہیں۔ جب پیر رومی "غایت آدم نظر" قرار دیتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خبر یعنی علم و حکمت کو بالکل بے فائدہ قرار دیتا ہے بلکہ وہ صرف ان دونوں کی اضافی حیثیت ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نظر یعنی معنویت اور روحانیت کو خبر (ظاہر آرائی) عقل اور اس کی تخلیقات یعنی عقل و حکمت، سیاست دنیاوی کاروبار اور انفرادی نشوونما، روحانیت۔ اخلاق اور الہیت کے ماتحت رہنا چاہیے

اگر فرد کے شعور ذاتی اور دنیوی معاملات کو ہماری دلچسپیوں کے دائرہ سے خارج کر دیا جائے۔ تو پھر اقبال اور صوفیوں کے مسلک میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اقبال نے جس بات پر زور دیا ہے۔ وہ ہماری موجودہ زندگی ہے۔ جسے وہ بعض اصولوں کے ماتحت رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ موجودہ زندگی کو "جامہ کثافت" خیال کرتا ہے۔ یہاں بھی برگساں کے فلسفہ سے واقف ہونے کے باوجود صاحب مضمون کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی ہے۔ لیکن برگساں کے نزدیک زندگی ایک متقدم اور "بے شعور" حرکت ہے اور مادہ بھی اس حرکت کا ایک جزو ہے۔ گو اس کی رفتار نباتات، حیوانات اور انسان کی رفتار حیات کے مقابلہ میں بہت سست معلوم ہوتی ہے۔ زندگی خود اپنے راستہ میں مادہ کو حائل کر کے شدید مشکلات پیدا کرتی ہے تاکہ وہ اسے مسخر کر کے ایک بلند تر مقام کی طرف کوچ کرے۔ چنانچہ اشجار۔ چرند پرند اور انسان سب اس قوت کے مختلف مدارج ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس کے آگے اور بھی کئی مقامات ہوں۔ اس لیے جب اقبال یہ کہتا ہے کہ ؎

خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ صوفیوں کی طرح انسان کو ایک ناپائیدار ہستی تصور کرتا ہے۔ یا عطار کے مانند تمام موجودات کو عالم لاہوت کی جانب سفر کرنیوالے طائر خیال کرتا ہے۔ جن کے لیے یہ دنیا ایک عارضی اور حقیر نشیمن ہے۔ بلکہ وہ اسے ارتقائے حیات کی بے شمار منزلوں میں سے ایک منزل سمجھتا ہے۔ اس کے لیے زندگی ایک مسلسل، لامتناہی تحریک ہے۔ نہضت نہیں۔ جس میں انسان کی قوت ارادی کو کوئی دخل نہ ہو۔ اس لیے ہم لفظ "سفر" کا وہ مفہوم اخذ کرنے میں حق بجانب نہیں۔ جو عام طور پر حضرات صوفیہ کے کلام سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اقبال نے برگساں کی تائید کرتے ہوئے بار بار کہا ہے کہ علم زندگی کے لیے ہے۔ زندگی علم کے لیے نہیں۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ حیاتِ انسانی کا مقصد حقیقت اشیاء کا ادراک ہے تو یہ اقبال کے تصور کا بالکل الٹ ہوگا۔ اور شروع سے لے کر آخر تک "زندگی" کو حقیقت

قرار دیتا ہے اور اس کے نقادوں کا فرض ہے کہ وہ بھی "زندگی" ہی کو اقبال کے فلسفہ کی روح و رواں قرار دیں۔ یہی احساس تھا جس نے مجھے یہ سطور لکھنے پر مجبور کیا اور میں امید کرتا ہوں کہ فاضل مضمون نگار اور قارئین کرام میری اس تصحیح کو قبول فرمائیں گے۔

(۱۹۳۸ء)

ختم شد

طرزِ احساس، فکری تحریکات، شخصیت
تغیر و ترفع ہے اور ذہنِ اقبال کے عہد بہ عہد
سب کا احاطہ کرتی ہے۔ بیشتر مقالات ایسے
کی زندگی یا ان کی وفات کے فوراً بعد لکھے
ان لوگوں کی توجہ کا نتیجہ ہیں جنہیں بہر مقام
جلوت وخلوت دونوں میں اقبال کو ہم نشینی
شرف حاصل رہا ہے۔ اس لحاظ سے "اقبال
ان ثقہ روایتوں اور عینی شہادتوں کا مجموعہ
اقبال کے سلسلے میں ہمیشہ سند اور حوالے کے
جائیگا۔ میں ڈاکٹر سلیم اختر کو اقبال فہمی کے سلسلے
کی تازہ کوششوں اور نئی دریافتوں پر مبارکباد

ڈاکٹر فرمان فتح پوری